Cover and Plates Printed at the Modi Press, Bangalore City.

نیا دور

(دو ماہی رسالہ)

8

ایڈیٹر:۔ صمد شاہین

سالانہ چندہ — چھے روپیہ

فی پرچہ — 1/4/=

نیا دور ۹۲ خلاصی پالیم بنگلور سٹی

ترتیب

مضامین

		صفحہ
ہیئت یا نیرنگ نظر	محمد حسن عسکری	۱
کلکتے کا ذکر	کنھیا لال کپور	۳۲
المناک صورت حال اور المیہ	غلام یعقوب انور	۳۷
فراق کی غزلیں	عبدالقادر سروری	
مجاز کی شاعری	اختر انصاری	
سالنامۂ ادب لطیف ۱۹۴۶ء	فکر تونسوی	

کہانیاں

		صفحہ
سنبھالا !	شوکت صدیقی	۲۴
الگ الگ راستے	گرنتین حیدر	۵۳
بدلے ہوئے مزاج	انتظار نیر تنوی	۶۰
صبح و شام	پریم ناتھ پردیسی	۶۹
کیرم بورڈ کے مہرے	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۹۲
اودھ کی شام	قرۃ العین حیدر	۱۰۰
تانبہ اور پانی	اقبال متین	۱۰۸
تاج محل تک —	"آدم"	۱۱۶
واپسی	"ابن سعید"	۱۲۵
نئی ماں	ہنسراج رہبر	۱۳۸
نوکری	اکال گربچن سنگھ	۱۴۸

نظمیں

سیاروں کی آواز	منظور حسین شور
اردلی	ریاض شمیم
غزل	سید جابر علی
ایک غزل	قتیل شفائی
نقش ناتمام	خلیل الرحمٰن اعظمی
فردوس گم کردہ	نصیر حیدر
خم و پیچ	ضیاء الاسلام
پچھلے پہر	کاوش انصاری
ویران گلی	اشعر ملیح آبادی
ایک نظارا ایک اشارہ	احمد ریاض
جوش آزادی	رفعت سروش
نیا زمانہ	قاضی نذرالاسلام
اشتراکی نظام	تحسین سروری

		صفحہ
غزل	نصرت تمکین	۱۰۷
آنے والی کل ہے درخشاں	کیف عرفانی	۱۱۴

(سارے مضامین غیر مطبوعہ ہیں۔ اور خاص نیا دور کے لیے موصول ہوئے ہیں)

حرفِ آغاز

اب ہم ۱۹۴۶ء کے وسط میں ہیں۔ جنگ ختم ہوئے ایک سال ہو چکا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد از جنگ ہمارے ادب نے کوئی نیا موڑ لیا ہے یا یہ کہ اب نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ شاید اس لئے ہو کہ اس دور کے صحیح خد و خال ابھی واضح نہیں ہوئے۔

آجکل ہمارے کئی نامور افسانہ نگاروں پر جمود سا طاری ہے یا ممکن ہے ان کی دوسری معروفیتوں نے انھیں ادب کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہ دی ہو، بہرحال، اس سال، اب تک صرف ایک ہی ایسا افسانہ ہماری نظر سے گذرا ہے جسے معرکہ کا کہا جا سکے۔ احمد ندیم قاسمی کا "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد"۔ لیکن یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ جو نئے لکھنے والے اب منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان میں اکثر ہونہار ہیں۔ زیر نظر شمارے میں زیادہ تر انھیں نئے لکھنے والوں کے افسانے شامل ہیں۔

ایک نکتہ، ایک خیال —— اسے کس خوبی سے نبھایا ہے اور آخر میں کس طرح ٹوِسٹ دی ہے اور افسانہ کو کیسا موثر بنایا ہے، ان بالکل مختصر سے افسانوں —— "الگ الگ راستے"، "نانبہ اور پانی"، "نوکری"۔ اور "بدلے ہوئے مزاج" میں دیکھئے۔ گریش چندر غالباً پہلی دفعہ کسی معیاری رسالہ میں چھپ رہے ہیں۔ اقبال متین اور کمالی گربچن سنگھ بھی نئے آئے ہیں۔ البتہ انتظار حسین تو نسبتاً کچھ پرانے —— ان کے ساتھ "آدم" کا سواگت کیجئے۔ دیکھئے اعضل نے اپنی کہانی میں تفصیل نگاری اور تصویر کشی کا کیسا اچھا نمونہ پیش کیا ہے؟ "تاج محل تک" ان کی پہلی کوشش ہے اور کافی کامیاب۔

"صبح و شام" کشمیر کا افسانہ ہے۔ کشمیر حسین ہے، جنت نظیر ہے۔ لیکن اس کے باشی حد درجہ مفلس اور ظلم و استبداد تلے کچلے ہوئے ہیں۔ اس جنت میں جہنم ہے۔ کشمیر کے اس تضاد کو کرشن چندر نے اپنے اکثر افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ پھر راماننداساگر نے۔ پریمی کے افسانوں میں بھی کشمیر کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ "صبح و شام" میں آپکو زمردین وادیاں، روپہلی پہاڑیاں اور گاتے ہوئے آبشار نہیں ملیں گے۔ یہاں آپ کشمیر کا دوسرا ہی رخ دیکھیں گے، "ایک ہلکی سی بدصورت سی مسکراہٹ۔ ہر چیز یہ لوٹنے لگی، آؤں یہ کام کرنے والے نیم عریاں مزدور، شمسان کے چوکیدار اور دریا کے کنارے بہتی لاشوں کا انتظار کرنے والے کتے اور گدھ"۔ یہ کشمیر کے ایک شہر کی سرحد ہے۔ جہاں چونگی کے منشی کے الفاظ میں،

نیا دور

آدمی کے "پوزیشن" کو دیکھ کر سلوک کیا جاتا ہے۔ اور یہ آدمی آدمی میں تفریق۔ بدصورت آؤں، مرگھٹ، لاشوں اور گدھوں سے بھی بدصورت ہے۔.........

کیا انسان کے خمیر میں استدر ناانصافی بے رحمی، درندگی گوندھی ہوئی ہے؟ کبھی کبھی ہم یہ سوچنے لگتے ہیں ـــــ لیکن انسان مجموعہ اضداد ہے۔ بڑے خوبصورت جذبے بھی اس کے سینے میں پلتے ہیں محبت! ماں کی مامتا، جیون ساتھی کی محبت اور رفاقت، "نئی ماں" میں آپ کو انسان کی فطرت حسین نظر آئے گی۔

اس افسانہ کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں جذبات انڈے چلے نہیں آتے۔ بلکہ انھیں بڑی نرمی اور خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے اور "نئی ماں" کا غم اپنی خاموشی میں اور بھی زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ بیوی کو تسکین دینے میں شوہر کی بوکھلاہٹ اس کی محبت اور احساسات کی شدت کو اور واضح کرتی ہے ہماری نظر میں فسراج رہبر کا یہ سب سے کامیاب افسانہ ہے۔ فنی لحاظ سے بھی۔

شوکت صدیقی کا "سنبھالا" بھی خوب چیز ہے، اس میں ایک بڑے افسوسناک مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو جنگ کے بعد پیدا ہو گیا ہے، جنگ بیتے سے بے روزگاروں کی روزی کا کفیل بنی تھی۔ اب پھر یہ لوگ بے روزگار بن گئے ہیں۔ لیکن پہلی بے روزگاری اور اس بے روزگاری میں بہت فرق ہے جنگ کے دنوں میں یہ خوب کمایا کرتے تھے۔ اور ایک خاص معیار زندگی کے عادی ہو گئے تھے، اب یہ کمائی اچانک اُن سے چھن گئی۔ تو دیکھئے ان کی "تعمیری" صلاحیتیں کیا رُخ لیتی ہیں۔

جنگ نے بہتوں کی طرز زندگی کو بدل دیا تھا۔ "واپسی" کی کو شو بھی اندنوں کچھ الگ ہی تھی یہی نہیں بلکہ گھر سے دور، اس نے اپنے گھر کا بھی ایک الگ تصور بنا لیا تھا۔ اور اپنے فوجی عاشقوں کے ساتھ گھومتی ہوئی وہ اپنے اس تخیلی گھر کی باتیں کرتی۔ یہ صرف شیخیاں تھیں۔ یہی باتیں کرتی کرتی وہ خود بھی ان باتوں میں یقین کرنے لگ گئی تھی۔ اور اب وہ واپس لوٹتی ہے، اپنے اصلی گھر کو دیکھتی ہے، وہی مفلسانہ رہن سہن، وہی پھیکی بے رونق زندگی......,,,, اینگلو انڈین طبقہ بہت کم اردو افسانوں کا موضوع بنا ہے۔ پہلے پہل محمد حسن عسکری نے اینگلو انڈین لڑکیوں کے متعلق لکھا۔ لیکن یہ ذرا خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ اب نچلے متوسط اینگلو انڈین اور انڈین کرسچن گھروں کی بڑی کامیاب تصویریں ہمیں "ابن سعید" کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ اسی مواد سے انہوں نے "ماما" جیسا شہ پارہ تخلیق کیا تھا: "واپسی" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

صدیقہ بیگم عرصہ سے لکھ رہی ہیں، لیکن موضوع کے انتخاب کے اعتبار سے یہ ان کی افسانہ نگاری کا نیا دور کہا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ وزنی سیاسی اور معاشی مسائل سے متعلق موضوع چننے کا خاص خیال رکھتی تھیں، لیکن یہ موضوع سنبھلنے ذرا مشکل تھے۔ ان افسانوں میں مطالعہ کی صداقت اور مشاہدے کی گہرائی کا فقدان نظر آتا ہے اور خلوص اور فنی احساس کی کمی کی وجہ سے جذباتیت اور مثالیت پسندی آجاتی تھی۔ اب وہ نچلے متوسط مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کے متعلق لکھنے لگی ہیں اور اس میدان میں وہ کافی کامیاب ہیں۔ "کرم بورڈ کے مہرے" بھی اسی رنگ کا افسانہ ہے۔

نئے لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر کا نام خوب ابھر چلا ہے۔ اور اس کی وہ مستحق بھی ہیں۔ گو ان کے افسانوں میں تنوع نہیں پایا جاتا۔ سب افسانے تقریباً ایک سے ہیں، ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اور ایک ہی انداز میں لکھے گئے ہیں، لیکن یہ انداز کم از کم اردو کے لئے تو بالکل نیا ہے۔ اور ان میں اپنے خاص ماحول کی زندگی کے مشاہدے اور اس کے بیان کی بڑی صلاحیت ہے۔ اس دور میں جبکہ ترقی پسند افسانے کا میدان نچلا طبقہ اور نچلا متوسط طبقہ تھا اونچے طبقے سے ادب خالی رہ جاتا۔ اگر قرۃ العین حیدر نے اس کی مصوری نہ کی ہوتی۔ اور پھر ان کے افسانے اس لحاظ سے زیادہ قابل توجہ ہیں کہ وہ اس طریقۂ زندگی پر طنز کرتی ہیں۔ اس کا کھوکھلا پن بتاتی ہیں۔ ان کا خاص انداز اور طنز ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ "ہم لوگ" میں کامیاب ہے جو ہمارے خیال میں ان کا بہترین افسانہ ہے "ہم لوگ" ہم نمبر ۸ میں پیش کر چکے ہیں اور اب "اودھ کی شام" پڑھئے۔ یہ بھی ان کے خاص رنگ کی چیز ہے۔

حصۂ نظم میں بھی آپ کو شاعروں کے وہ درخشاں نام نظر نہیں آتے جنھوں نے اپنی "منزل" پالی ہے اور اب گویا "کہنا" ہی چھوڑ دیا ہے، جو اب بھی اپنی راہ چل رہے ہیں۔ انھیں کے ساتھ ہو لینا پڑتا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ان کی اکثر مرسلہ چیزیں واقعی اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارا ادب ایک اضطراری دور سے گذر رہا ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت، ہماری اس ماحول سے بے اطمینانی اور ایک روشن مستقبل کے لئے بے چینی ہے۔ اس نمبر کی نظموں میں بھی یہی دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس دور کی دوسری چیزوں کو دیکھ کر کیجئے۔ آپ کو

مایوسی نہ ہوگی۔

مضامین تعداد میں کم ہیں لیکن ہیں بہت وزنی۔ اس حصّہ میں آپ کو ایک معرکہ کی چیز ملیگی۔ "ہیئت اور نیرنگ نظر" ایسی نظریاتی بحث برسوں بعد لکھی گئی ہے۔ ہمارے نئے ادیبوں کے لئے یہ ایک اشاریہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے نام سے وہ یوں ہی بے تکی ہانک دیا نہ کریں۔ بلکہ فنی لوازمات کا بھی خیال رکھیں۔ اور فنی شعور بر روئے کار نہیں آتا۔ تا وقتیکہ ہیئت کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو۔ اور ہیئت عبارت ہے کسی فن پارے کے اجزا اور کل کے درمیان ربط اور ہم آہنگی سے۔ افسانے کے خدوخال میں توازن و تناسب قایم کرکے مواد کو ایک خوبصورت شکل دینے کے لئے فن کار کو بہت غور و فکر کرنی پڑتی ہے۔ ہیئت کے بغیر کسی حسن پارے کی تخلیق ہو نہیں سکتی۔ لیکن جمالیاتی ہیئت اپنی خالص شکل میں ناممکن ہے۔ لہٰذا فن کار مجبور ہے کہ وہ معنوی ہیئت تلاش کرے۔

عسکری صاحب کا خیال ٹھیک ہے کہ یہاں آکر ہیئت کی تلاش اخلاقیات کی تلاش بن جاتی ہے۔ اس لئے فن کار کی اخلاقیات سے بے نیاز ہو جانے کی کوشش بے سود ہے فن کار کا کام حسن کی تخلیق ضرور ہے۔ مگر نیکی اور صداقت سے قطع تعلق کرکے وہ حسن کو بھی نہیں پا سکتا۔ موجودہ زمانہ کا آرٹ صرف زندگی کا نعم البدل ہی نہیں بلکہ زندگی اور زندگی کی معنویت کی جستجو بھی ہے اور انسان کو معنویت ڈھونڈ کر دینے کا فریضہ فن کار ہی پر ہے۔ ظاہر ہے۔ اس کا یہ فن افادی عنصر لئے ہوئے نہ ہو تو کیا ہے ؟

"کیا یہ زمانہ ایک المناک دورِ زندگی نہیں ہے ؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر زمانے کے دکھ درد اور زندگی کی بپتا فنونِ لطیفہ کے المیہ شاہکاروں میں کیوں ڈھل نہیں جاتی ؟" اس مسئلہ پر غلام یعقوب انور کا مضمون " المناک صورت حال اور المیہ" بڑی سنجیدہ اور فکر طلب بحث ہے۔ ان ٹھوس مضامین کے ساتھ ایک ہلکا پھلکا مزاحیہ مضمون "کلکتہ کا ذکر" پڑھ کر آپ محظوظ ہونگے۔ ہمیں فخر ہے کہ آج کے واحد طنز اور مزاح نگار کنہیا لال کپور بھی اب کے ہماری بزم میں شریک ہیں۔

اس دفعہ کے تبصرے بھی ادبی مضامین سے کسی طرح کم نہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری منجھے ہوئے نقاد ہیں۔ اور شاعری ان کا خاص موضوع ہے۔ فراق کے "شعلۂ ساز" پر انھوں نے نپی تلی باتیں کہی ہیں۔ اختر انصاری کو نئے شاعروں اور نقادوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا مختصر مضمون مجاز کی تازہ کتاب "شب تاب" پر اچھی تنقید ہے۔ سالنامہ ادب لطیف ۱۹۴۶ء کو فکر تونسوی نے افسانوں کی روشنی میں دیکھا ہے، تبصرے سے زیادہ افسانوں کے تجزیئے بہت خوب ہیں فکر صاحب ادارۂ ادب لطیف سے متعلق ہیں، لیکن اس مضمون میں ان کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے۔

نیا دور نمبر ۹۔ کے مضامین

مضامین:-

- ترقی پسند ادب: قاضی عبدالغفار
- اپریل فول (مزاحیہ): رشید احمد صدیقی
- جدید ادب میں حافظ اور داسی کی اہمیت: محمد حسن عسکری
- ۱۹۴۵ء کے اچھے افسانے: ممتاز شیریں

افسانے:-

- جمالیات: علی عباس حسینی
- باجی: ممتاز مفتی
- جھاڑی: ڈی ایس پرچٹ (ترجمہ شبلی بی کام)
- زندگی کا رس: نشہ میمن (ترجمہ ممتاز شیریں)
- آخری یادگار: شلوم الیش (ترجمہ وحید یوسف زئی)
- خراش: ڈی ایس کھانڈیکر (ترجمہ نذیر احمد)

نظمیں:-

(۱) غار: محمور جالندھری
(۲) کشتیاں اور ریت: محمد صفدر
(۳) بزدل: یوسف ظفر
(۴) غزل مسلسل: احمد ندیم قاسمی
(۵) تجدید: اختر الایمان
(۶) حوا کی بیٹی: فکر تونسوی
(۷) آل: مظہر ح۔ یوسف
(۸) انگڑائی: عبدالمتین عارف
(۹) امن: کنول پرشاد
(۱۰) دو نظمیں: وامق جونپوری
(۱۱) دھواں: صہبا لکھنوی
(۱۲) فوجی سرمائے سے: صادق علی خان

"سارے مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص نیا دور کے لئے موصول ہوئے ہیں"

محمد حسن عسکری

پریم ناتھ پردیسی

نیا دور

کنھیا لال کپور

عزیز احمد

محمد حسن عسکری

ہیئت یا نیرنگِ نظر؟

"پُراسرار آدمی، ذرا یہ تو بتا کہ تو سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے؟ اپنے باپ سے، ماں سے، بہن سے یا بھائی سے؟"

'میرے نہ تو کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ بہن نہ بھائی۔'

اپنے دوستوں سے؟

'یہ تو تم نے ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس کا میں آج تک مطلب نہیں سمجھا،'

اپنے ملک سے؟

'مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہے کس عرض البلد میں،'

خوبصورتی سے؟

'وہ لافانی دیوی! اُس سے محبت کرنے کو تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔'

دولت سے؟

'مجھے اس سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں خدا سے،'

پھر تمہیں کس سے محبت ہے، انوکھے اجنبی؟

'مجھے بادلوں سے محبت ہے...... اُن بادلوں سے جو گزر جاتے ہیں...... وہ دیکھو ...... اُن حیرت انگیز بادلوں سے!'"

اپنی جمالیاتی قدر و قیمت کے علاوہ بودیلیر کی یہ نظم انیسویں اور بیسویں صدی یا صنعتی دور کی سماجی اور اخلاقی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی طرح ادب اور آرٹ کی تاریخ میں بھی۔ ممکن ہے کہ یہ نظم اس دور کی ہر تحریک یا ہر فن کار پر حاوی نہ ہو، لیکن بہت بڑی حد تک اس میں ہمارے زمانے کی روح بند ہے۔ اس عہد کے انسان کی ساری روحانی مایوسیاں، مجبوریاں، معذوریاں، اس کی ساری حسرتیں اور آرزوئیں اس نظم میں گونجتی ہیں،

یہ نظم اس کی شکست کی آواز ہے ـــــ بلکہ زندگی کے اس نظام کی بھی۔ ان منفی عناصر کے پہلو بہ پہلو اس نظم میں انسان یا کم سے کم فن کار کی روحانی کاوشوں اور موت کے خلاف اس کی جدوجہد کا نشان ملتا ہے۔ جتنا کچھ اور جیسا کچھ اثبات منحنی دور کے فن کار سے ممکن ہو سکتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ اگر اُسے پوری زندگی نہیں مل سکتی، تو کم سے کم سہی؛ بہرحال وہ آخر تک زندگی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا۔ حالانکہ اس مضمون میں مجھے پچھلی ایک صدی کے فن کاروں کے نقطۂ نظر کی خامیوں سے ہی بحث ہے، لیکن میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اُن کی تخلیقات موت کی علمبردار ہیں یا اخلاقی اعتبار سے انحطاطی ہیں۔ ممکن ہے کہ آرٹ موت کا اعلان کرتا ہو، اُس میں فرد یا قوم کی زندگی سے بیزاری یا موت کی خواہش جھلکتی ہو، لیکن آرٹ کبھی اور کسی طرح موت کی تلاش نہیں ہو سکتا۔ آرٹ بنفسہٖ زندگی کی جستجو ہے، ایک نئے توازن، ایک نئے آہنگ کی تلاش ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فن کار کو نیا توازن پوری طرح حاصل نہ ہو سکے۔ آخر اُسے بہت سی ایسی چیزوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو فرد کی طاقت سے باہر ہیں لیکن وہ اُس نئے توازن کی سمت ایسے اشارے تو کر سکتا ہے جن سے دوسرے جستجو کرنے والوں کو مدد مل سکے۔ ہر آرٹ صحت ور ہوتا ہے، کیونکہ بیماری کا ذکر کرنے کے باوجود وہ صحت سے منکر نہیں ہو سکتا۔ فن کار کے اندر زندگی مر بھی گئی ہو تب بھی فن پارے کی تخلیق یا تخلیق کا خواب بذات خود قُم باذنی کا حکم رکھتا ہے۔ البتہ بعض فن پاروں کو نسبتاً زیادہ صحت ور کہا جا سکتا ہے اور بعض کو کم، چنانچہ اس پچھلی ایک صدی کے ادب پر تنقید کرتے ہوئے میرا مطلب کہیں بھی یہ نہیں ہوگا کہ یہ ادب انسانیت کے لئے ضرر رساں ہے یا تنزل پرست ہے، جیسا بہت سے سیاسی رضاکار اکثر کہا کرتے ہیں۔ یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ میرے مضمون میں کسی لفظ کے معنی وہ نہیں ہیں جو مارکسیوں کے یہاں ہوتے ہیں، کیونکہ یہ لوگ لفظوں کو اُن کے چھوٹے سے چھوٹے اور تنگ سے تنگ معنوں میں استعمال کرنے کے عادی ہیں، ان کی اصطلاحیں اتنی "مادیت" آلود ہوتی ہیں کہ اُن سے تانبے کے زنگ آلود پیسوں کی بدبو آتی ہے۔ اسی لئے میں نے تو کمیونسٹوں کا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ دوائی میں تو ننگی تصویروں والا رسالہ آجاتا ہے۔ انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے، کم سے کم ادب اور ادبی تنقید میں، ہمیں ایسے لفظ چاہئیں جو انسانوں کی زندگی سے بھرپور ہوں، معاشیاتی

مابعد الطبیعات سے نہیں۔

تو بودلیئر کی نظم میں ہم ایک بالکل نئے قسم کے فن کار سے دوچار ہوتے ہیں ——— صنعتی دور تک کے فن کار سے۔ یہ فن کار اپنے پیشرو فن کاروں سے صرف زمانے یا ماحول کے اعتبار سے ہی الگ نہیں بلکہ نئی اور بالکل مختلف روح لے کر پیدا ہوا ہے۔ حسرت، مایوسی، رنج وغم، زندگی کی ناپائداری کا احساس، تشکک، مذہب سے بغاوت کوئی نئی چیزیں نہیں۔ ایپی کورس اور دوسرے یونانی فلسفیوں کا تو ذکر ہی کیا، یرمیاہ جیسے پیغمبر نے اُس دن پر لعنت بھیجی ہے جس دن وہ پیدا ہوا تھا، اور حبقوق نے خدا کو یہ طعنہ تک دیا ہے کہ تیری آنکھیں کیا اتنی مصفّا و منزّہ ہیں کہ بدی اور بے انصافی کو دیکھ تک نہیں سکتیں، تو غم واندوہ کا اظہار یا بغاوت ایسی چیزیں نہیں جو اس نئے فن کار کو دوسروں سے ممیز کرسکیں، یہ دُکھ تو انسان کی زندگی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور وہ ہمیشہ ان کا رونا روتا آیا ہے۔ جہاں تک مسلّمہ اعتقادات یا نظام زندگی سے بغاوت کا تعلق ہے، بعض وقت تو نیا فن کار سرے سے باغی ہوتا ہی نہیں کیونکہ ایسے لمحوں میں نفی اُس کے اندر اتنی ترقی کرجاتی ہے کہ اس کے لئے ایسے اداروں، ایسے قانون اور ایسی روایتوں کا وجود ہی باقی نہیں رہتا جن کے خلاف اُسے بغاوت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ خُدا کے وجود سے انکار کرنے کی فکر تو اُسے جب ہو جب وہ پہلے اپنے وجود کا قائل ہو۔ وہ اپنے گرد وپیش سے اپنے آپ کو اتنا بے پروا بنا سکتا ہے کہ ساری ہستی اُس کے لئے دُھند کا ایک غلاف بن جائے جو کہیں کہیں سے کبھی کبھی چمک اٹھتا ہو۔ ایسے انسان کے لئے باغی بہت محدود اصطلاح ہے، یہ لفظ اس کے چند لمحوں کی تعریف ضرور کرتا ہے، پوری زندگی پر حاوی نہیں۔ نئے فن کار کا بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ ساری عقیدتیں اور محبتیں، وہ سارے اخلاقی رشتے جن سے اب تک فن کار مطمئن تھے اور اگر کبھی انہیں تکلیف دہ پاتے تھے تو انہیں کم سے کم اتنی اہمیت ضرور دیتے تھے کہ اُن کے خلاف شدّت سے بغاوت کریں، اُن میں ضروری ترمیم کریں، اُن کا نیا تخیل پیش کریں، نیا فن کار ان سارے اخلاقی رشتوں سے بیزار ہے، ایک دو سے نہیں بلکہ سب سے اور اتنا بیزار ہے کہ ان کی صرف ترمیم یا تجدید سے مطمئن ہو جانا کیا معنی اُن کی تخریب تک سے علاقہ نہیں رکھنا چاہتا، اُس کی تو بس یہ خواہش ہے کہ اُن کی طرف سے آنکھیں بند کرلے، اور اُن سے بالکل بے نیاز ہو جائے ——— یہ اور بات ہے کہ پوری بے نیازی ناممکن ہے کیونکہ اخلاقی

رشتے نہ صرف حقیقت کا حصّہ ہیں، بلکہ خود سب سے بڑی حقیقت ہیں، نئے فن کار کی دوسری خصوصیت
یہ ہے کہ وہ سماج کے ایک فرد یا اور بہت سے انسانوں کے درمیان رہنے والے ایک انسان کی
حیثیت سے اپنے معاملات پر غور نہیں کرتا، بلکہ اس طرح جیسے وہ خود ایک کائنات ہو، اس وقت
وہ دوسروں کے وجود کا خیال تک نہیں آنے دینا چاہتا، نہ وہ یہ سوچنا ضروری سمجھتا ہے
کہ اس کے رویّے کا دوسروں کے رویّے سے کیا تعلق ہوگا اور آپس میں ان کا عمل اور ردِّ عمل
کس قسم کا ہوگا۔ اپنے معاملات اپنے لئے اپنے آپ طے کرنے میں وہ اپنے کو خود مختار سمجھتا ہے،
اور اپنے سے ماسوا کسی کی اور کسی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں، اُسے اپنے حق خود ارادیت
منوانے کی ضد نہیں وہ کسی سے کوئی بات نہیں منوانا چاہتا۔ یہ لفظ ہی اس کی لغت میں نہیں
پایا جاتا۔ کوئی بات منوانے کی تو اُسے جب فکر ہو جب وہ اُن کے وجود کو اہمیت دیتا ہو۔ اسی
طرح 'حق' کا لفظ بھی اُس کی ترجمانی نہیں کرتا، کیونکہ حق ایک سیاسی اور اجتماعی تصوّر ہے، وہ
تو اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا سمجھتا ہے جس کے کیمیاوی قانون بالکل الگ ہیں اور یہ قانون اپنے
طریقے پر عمل کرتے ہیں (یہاں میں نے لفظ 'معاملات' بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے
اس میں خیر و شر کے تصوّر سے لے کر ہوٹل کی خادماؤں سے زنا تک سب آجاتا ہے) کسی ترقی پسند
اشتعال انگیز کی یاد دہانی کے بغیر مجھے خوب معلوم ہے کہ فرد کے متعلق یہ نظریہ خیر سو فی صدی
غلط تو نہیں، گمراہ، ناکافی ضرور ہے۔ فرد ایک علیٰحدہ کائنات سہی، مگر یہ کائنات ایسی
ہی دوسری کائناتوں سے ہر لمحے ٹکراتی رہتی ہے۔" یہ نئے فن کار بھی اس تصادم سے بے خبر
نہیں ہیں اور اس سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کا علم ان فن کاروں کو جس شدّت
سے ہے اور یہ علم جس ٹریجڈی کی شکل اختیار کرتا ہے وہ چیز مارکس اور اینگلز کے نصیب
میں نہیں، یہ لوگ تو خیر ہو بھی بچارے پمفلٹ باز قسم کے آدمی تھے، اَروِنگ بیبٹ جیسے
ادب کے مصلحین تک اگر اس احساس کو اپنی رگوں میں دس منٹ ٹھیر جانے دیتے تو خون
تھوکتے پھرتے، ہارورڈ میں بیٹھ کر خیر و شر کا فلسفہ بگھارنے میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا،
اب گننے کہ بودلیر کس کس چیز سے محبت نہیں کر سکتا، ایک تو وہ خدا کو نہیں مانتا لیکن
یہاں یہ یاد رکھیے کہ صنعتی دور کی مادّہ پرستی، عقلیت اور لادینی پر اُس نے بڑی کڑی

چوٹیں کی ہیں' اور جب وہ کہتا ہے کہ میں خدا سے نفرت کرتا ہوں تو اس کا مطلب سرمایہ دارانہ سماج کے خدا اور مذہب سے ہے جنہیں اس سماج نے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مذہب سے اتر کر ملک کا نمبر آتا ہے اس سے بھی وہ متنفر ہے۔ کیونکہ یہ ملک وہ "عجیب وغریب سرزمین" ہے۔ جہاں معمولی روٹی کو کیک کہا جاتا ہے' اور اس کے ایک ٹکڑے کے لئے انسان ایک دوسرے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اُسے یہ بھی نہیں پتہ کہ ماں' باپ' بھائی' بہن یا دوستوں کی محبت کیا چیز ہوتی ہے کیونکہ سکوں کی محبت نے زندگی کے سرچشموں کو بھی زہریلا بنا دیا ہے' اور وہاں سے اب اُسے وہ آبِ حیات نہیں مل رہا جو پہلے ملتا تھا۔ دولت سے تو خیر وہ کیا محبت کرے گا اور پھر بے ایمانی سے حاصل ہونے والی دولت سے؟ لیکن سماج کو روپے نے اس طرح جکڑا ہے کہ زر کی ہوس کے علاوہ ہر دوسرا آدرش بے معنی بلکہ خطرناک نظر آنے لگا ہے۔ خصوصاً فن کار تو اس سماج کی نظروں میں (مارکسیوں کے نظروں میں بھی) ایک عجیب الخلقت وحشی بن گیا ہے۔ جو معاشری نظام کے لئے ایک دھمکی ہے' بقول بودیلیر کے، شاعر کسی دن اگر یہ مطالبہ کرے کہ مجھے اپنے اصطبل میں رکھنے کے لئے دو تین بورژوا چاہئیں تو حیرت' غصے اور دہشت کے مارے لوگوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے گا' لیکن اگر کوئی بورژوا شاعر کے کباب مانگے تو کسی کو بھی تعجب نہ ہوگا' بلکہ اسے بالکل معمولی بات سمجھا جائے گا (یا وش بخیر' ترقی پسند تو شاعر کو کچا کھا جانے سے بھی نہیں جھجکیں گے) اور تو اور شاعر کی ماں تک اُسے کوسنے دیتی ہے کہ یہ ملعون میری کوکھ سے کیوں پیدا ہوا (یہ بھی بودیلیر کی ایک نظم سے ہے) ایک اور بنیادی تعلق جنس یا محبت کا ہے لیکن روپیہ کی پوجا نے فن کار کے لئے یہاں بھی بِس گھول دیا ہے۔ بودیلیر خواب میں دیکھتا ہے کہ انتہائی گندے اور پلید عفونت نما انسانوں کی ایک جماعت اُسے گھیرے اُس کا مذاق اڑا رہی ہے اور اس کی محبوبہ بھی اُن کے گلے میں باہیں ڈالے چپٹی ہوئی ہے' اُسے چڑانے کے لئے اُن لوگوں کو چوم رہی ہے اور اُن سے اختلاط کر رہی ہے۔ نئے فن کار کے جنسی تعلقات کا ایک اور نمونہ یہ ہے کہ بڑے انتظاروں کے بعد آخر ایک دن CORBIERE کو اپنی محبوبہ سڑک پر نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محبوبہ بہت ہوئی تو کسی ہوٹل میں کھانا کھلاتی ہوگی CORBIERE خوش خوش اس کے پیچھے چلنے لگتا ہے' لیکن وہ اتنے پھٹے حالوں میں ہے

کہ محبوبہ مُڑکر دیکھتی ہے اور مسکرا کر روپیے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عشق کو زندگی کا حاصل سمجھا جاتا تھا، لیکن لافورگ کی نظروں میں عورتیں وحشی جانور ہیں جو اپنے نروں کو قابو میں لاکر اُن کے ساتھ سسکیاں بھرتی ہیں اور یہ سب صرف تین منٹ کے مرنے کی خاطر! اسی لئے وہ اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہے کہ اوروں کی طرح وہ اپنی جبلّی خواہشوں کا غلام بن کر نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ اُن کا مقابلہ کیا اور آج تک کسی عورت کیساتھ ہم آغوش ہوا، نہ کسی کا بوسہ لیا۔

غرضکہ نئے سخن کار کا یہ حال ہے کہ زہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است، لیکن نہ تو اس میں بلند ہمتی کو دخل ہے نہ قلندری کو، نہ یہ آزادی اُسے روحانی بالیدگی دیتی ہے۔ ہر انسانی تعلق اور ہر اخلاقی رشتے سے فن کار اپنے آپ کو علیحدہ کرنے پر مجبور ہے کیونکہ زر پرستانہ اقدار نے ان بنیادی تعلقات کے مظاہر یعنی سماجی اداروں میں کھوٹ ملا دیا ہے۔ اپنے چاروں طرف ہر چیز اُسے نیکی، صداقت اور حُسن کے خلاف نظر آتی ہے ــــ اور یہی فن کار کے معبود ہیں، ان حالات سے اس کی بیزاری کی انتہا یہ ہے کہ وہ اُن چیزوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے پر مجبور ہے جو اُس کا موضوعِ سخن ہیں، جو اُس کے فن کا سرچشمہ ہیں ــــ یعنی انسانی اور اخلاقی تعلقات۔ اُس کی سماج میں جو اقدار رائج اور مقبول ہیں، اُنہیں وہ مان نہیں سکتا اور اپنی اقدار سماج سے منوانے کی طاقت نہیں رکھتا، اس لیے وہ ہر اُس چیز کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے اور ہر اُس چیز سے دُور بھاگتا ہے جس کے متعلق کہا جا سکے یہ اچھی ہے یا بُری ہے، جھُوٹی ہے یا سچی ہے۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ اپنی اقدار سے محبت کرنے کے باوجود وہ اتنا بےحس اور اتنا بےتخیل نہیں کہ ان اقدار کو لازمی طور پر سب سے فائق اور افضل سمجھے، اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ جس طرح بن پڑے اخلاقی مسئلوں اور اقدار کے الجھیڑوں سے جان بچا کر نکل بھاگے، اور اُسے کسی چیز کے سچ یا جھوٹ، اچھائی یا بُرائی کے بارے میں سوالوں کا جواب نہ دینا پڑے ــــ کیونکہ شاید وہ اپنے جوابوں سے بھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ یہ تشکک اور بےیقینی بہت سے لوگوں کو اخلاقی انحطاط معلوم ہوتا ہو۔ لیکن اگر نئے فن کاروں میں بھیڑ بکریوں جیسی خود یقینی کی کمی ہے تو کم سے کم ایک آدمی کو اس پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔

ان فن کاروں کے روحانی مسئلے اور اُن کی بیزاری اپنی جگہ پر مسلّم، لیکن اب ایک

خالص فنی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاقی معیار چھوڑنے کو تو چھوڑ دیے جائیں کوئی بات نہیں لیکن
کسی نہ کسی معیار کے بغیر — یہ معیار شعوری ہو یا غیر شعوری، اس سے بحث نہیں — فن پارے
کی تخلیق کس طرح ممکن ہے؟ فن پارے کے اجزا اور کُل کے درمیان، اور اسی طرح فن پارے اور
اُس سے متاثر ہونے والے کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا تعلق، کسی نہ کسی طرح کا رشتہ تو ہونا ہی
چاہیئے اور ان رشتوں کا کوئی معیار بھی لازمی ہے۔ یہ مسئلہ نفسیاتی کیا معنی حیاتیاتی بھی بن
سکتا ہے، لیکن فی الحال فن کار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے ہم اسے ایک بہت بڑا فنی مسئلہ کہیں گے
یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ فن برائے فن کا نظریہ وجود میں آیا۔ یہاں بھی بڑے زور و شور سے اس بات سے
انکار کروں گا کہ یہ نظریہ اخلاقی حیثیت سے انحطاط پرستانہ ہے۔ میں اُوپر لکھ آیا ہوں کہ معمولی
اخلاقی تعلقات فن کار کے لیے کس طرح ناممکن ہو گئے تھے۔ یہ نظریہ اخلاقیات سے یکسر کنارہ کشی
نہیں ہے، بلکہ فن اور فن کار کے لیے ایک نئی اخلاقیات ڈھونڈنے کی کوشش ہے — یہ اخلاقیات
نامکمل سہی، اس میں خامیاں سہی، یہ الگ بات ہے۔ نیکی اور صداقت ایسے تصورات ہیں جن کے
متعلق بحث کی جاسکتی ہے، عقلی اصطلاحوں میں بہت کافی کامیابی کے ساتھ انہیں بیان کیا جاسکتا
ہے، اس کے علاوہ نیکی اور صداقت کے معیاروں کے قائم ہونے میں سماج کو بھی بہت دخل ہے
اور ان معیاروں کی مادّی شکلوں سے ہر آدمی کو روزانہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تصورات اجتماعی
زیادہ ہیں اور ان کا انحصار بڑی حد تک ان کے تسلیم کیے جانے پر ہے۔ لیکن بحث و تمحیص، اپنی
بات منوانا یا دوسروں کی بات ماننا، یہ سب چیزیں نئے فن کاروں کو مہمل اور بے معنی، بلکہ شاید
غیر اخلاقی، معلوم ہوتی تھیں۔ اس لیے اپنے فنی مسئلہ سے مجبور ہو کر انہیں اخلاقیاتی تثلیث
کے تیسرے رُکن یعنی حُسن کی طرف جانا پڑا جو نسبتاً زیادہ انفرادی تصور ہے، جس کا تعلق عقل کے
بجائے اعصابی تجربے سے زیادہ ہے، اور اس لیے اس کی حقیقت کا اعلان زیادہ وثوق اور
زیادہ یقین کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، پھر اس میں بحث کی بھی زیادہ گنجائش نہیں، فن کار کے لیے
تمام دوسرے اخلاقی تعلقات مردہ ہو چکے ہیں حُسن وہ آخری تنکا ہے۔ جس کا سہارا لیے بغیر اُسے
چارہ نہیں، اچھا، حُسن کا بھی ایک مُسلّمہ معیار ہو سکتا ہے جسے ساری قوم یا ساری سماج مانتی ہو۔
لیکن ان فن کاروں کو ہر مسلّمہ چیز پر جھوٹے ہونے کا شبہ ہوتا ہے، اس لیے وہ خود بھی کسی چیز کے

قیام میں مدد دینے کو تیار نہیں، اور نہ ایسی ذمہ داری لیتے ہیں، وہ مستقل اقدار کو ہی نہیں مانتے، بلکہ اقدار کی اضافیت کے زیادہ قائل ہیں، لہٰذا وہ اپنی طرف سے حُسن کا کوئی مستقل معیار بھی پیش نہیں کرتے۔ بودلیئر اُن بادلوں سے محبت کرتا ہے جو گذر جاتے ہیں یعنی ان فن کاروں کا حُسن وہ حُسن ہے جس کی شکل و صورت متعین نہیں بلکہ جو بدلتا رہتا ہے، وہ حُسن جو کوئی ازلی و ابدی تصور نہیں بلکہ جو لمحاتی تاثر پر مبنی ہے۔

تو اب فن کا آخری معیار خالص جمالیاتی ہوگیا۔ ایک طرح زبان سے تو یہ فن کار ضرور یہ کہتے رہے کہ حسن اور صداقت ایک چیز ہے، لیکن ان لفظوں کی تہ میں ایک اور اضطراب پایا جاتا ہے جب یونانی حُسن، صداقت اور نیکی کو ایک وحدت بتاتے تھے تو وہ حُسن کے علاوہ باقی دوسرے ارکان پر بھی اتنا ہی زور دیتے تھے۔ جس طرح وضعی رشتوں (FORMAL RELAT ONS) کا توازن اور ہم آہنگی صداقت ہو سکتی تھی، اسی طرح صداقت کا تصور یا صداقت کے حصول کا لمحہ بجائے خود حسین ہو سکتے تھے لیکن نئے فن کاروں کو یہ بے تابی رہی ہے کہ کسی طرح صداقت اور نیکی کے تصورات سے پیچھا چھڑایا جائے اور حُسن کو ان سے بے نیاز بنایا جائے، کیونکہ اس ہوسناک سماج میں یہ تصورات خالص اور بے میل رہ ہی نہیں سکتے۔ جب یہ فن کار حسن اور صداقت کے ایک ہونے کا نعرہ لگاتے ہیں تو ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح صداقت اور نیکی پر غور کرنے یا اُن کے معیار قائم کرنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں، چنانچہ اس نعرے کے باوجود کوشش یہ رہی ہے کہ آرٹ کو جمالیاتی طور پر تسکین دینے والے وضعی رشتوں کا مجموعہ بنا دیا جائے، جس میں اخلاقیاتی اور غیر جمالیاتی عناصر کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مطلب یہ کہ آرٹ کو ایسی معروضی حیثیت دی جائے کہ اُس پر اخلاقی معیار عائد ہی نہ ہو سکیں، بالکل جس طرح ہم کسی پیڑ یا پتھر کو اخلاقی اعتبار سے نیک یا بد نہیں کہہ سکتے، بلکہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر آرٹ میں قطعی اور کُلّی معروضیت تو نفسیاتی اور حیاتیاتی اعتبار سے ممکن ہی نہیں، جب تک انسان کیمیاوی اعتبار سے بالکل بدل نہ جائے یا فن پارہ فن کار کے پیٹ سے بچے کی طرح پیدا نہ ہونے لگے۔

بہر حال، ان فن کاروں کی انفرادیت پرستی اور داخلیت کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں یہ رُجحان بھی نظر آتا ہے کہ فن پارے کو زیادہ سے زیادہ معروضی چیز بنایا جائے جس کی بنیاد جمالیاتی

اور ذہنی اعتقادات پر قائم ہو' اور جو حتی الوسع اخلاقی معیاروں سے آزاد ہو سکے
"خالص شاعری" کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ ورلین کہتا ہے کہ شعر میں سب سے پہلے اور سب سے
زیادہ موسیقی ہونا چاہئے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "محض ادب" ہے، 'مصوری میں تاثریت'
(IMPRESSIONISM) پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کو بحیثیت مجموعی نہیں
دیکھنا چاہتی' بلکہ محض ایک گریزاں تاثر ہی سے مطمئن ہو جاتی ہے اور اس لئے اُس میں
ٹکنیک ہی سب کچھ ہے۔ ناول میں فلوبیر آرٹ کی خود مختاری اور اسلوب کی فوقیت کا نعرہ
بلند کرتا ہے' اور آرٹ کو تقریباً ایک ایسے مذہب کی شکل دیدیتا ہے جو راہبوں جیسی قربانیاں
اور ریاضتیں چاہتا ہے' اُس کے نزدیک موضوع کوئی اہمیت نہیں رکھتا' جو کچھ ہے وہ
طرز بیان ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ فطرت نگار بھی موجود ہیں جو آرٹ کے پرستار تو
نہیں ہیں مگر انسان کا مطالعہ اتنی سخت معروضیت کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں جیسے کوئی
سائنس داں' تجربے کی میز پر جانوروں کو چیرتا پھاڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس داں جو
باتیں معلوم کرتا ہے وہ اخلاقی معیاروں کی زد میں نہیں آتیں۔ چنانچہ آرٹ پر سائنس کی
معروضیت عائد کرتے ہوئے درحقیقت فطرت نگاروں کی بھی کاوش یہی تھی ——— وہ
غیر شعوری طور پر ہی سہی ——— کہ کسی طرح اخلاقی مسئلوں اور اخلاقی فیصلوں سے بچا جائے'
غرضکہ اس دور کی ساری نظریہ بازی کا ماحصل یہ ہے کہ فن کار اخلاقی جدوجہد سے تھک کر
اور اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر یہ چاہ رہے تھے کہ حُسن کے تصور کو نیکی اور صداقت کے تصورات
سے الگ کر دیا جائے' کیونکہ ایماندارانہ فنی تخلیق کا اور کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آرہا تھا
لیکن چونکہ نیکی اور صداقت اتنے اہم تصورات ہیں کہ اُن سے آنکھیں چُرانا ممکن نہیں' اس
لئے وہ اپنے سمجھانے کو یہ بھی کہتے رہتے تھے کہ حُسن میں باقی دونوں تصورات بھی شامل ہیں'
ممکن ہے کہ ان تصورات کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا یا حُسن کو سب سے افضل اور خود مختار
سمجھنا ایسے زمانے میں اور ایسی قوم میں فن کاروں کے لئے زیادہ نقصان دہ نہ ہو جب
سماج میں پوری ہم آہنگی ہو' لوگوں کے دلوں میں نیکی اور صداقت کا تصور صاف ہو اور
مضبوطی سے قائم ہو' فن کار کا رشتہ عوام سے مضبوط ہو اور وہ اُن سے برابر نئی زندگی

حاصل کرتا رہتا ہو، اپنی قوم کی اقدار اُس کے خون میں بسی ہوں ۔۔ ایسی صورت میں حُسن کے متعلق کوئی مذہبی عقیدہ اُس کے فن کو لنگڑا لولا نہیں بناسکتا، کیونکہ آرٹ کی تخلیق بڑی حد تک غیر شعوری فعل ہے لیکن جب فن کار ایسی سماج میں نہ رہتا ہو، جب ہم آہنگی کیا معنی ایک طبقہ دوسرے طبقے سے مصروفِ پیکار ہو، کوئی ایک مسلّمہ اور مصدقہ نظامِ زندگی باقی نہ رہا ہو، جب فن کار کا عوام سے بھی رابطہ باقی نہ رہا ہو اور وہ صرف اپنی روحانی طاقت سے کام لینے پر مجبور ہو، جب وہ اخلاقی جنگ سے اُکتا چکا ہو اور اخلاقی فیصلوں سے خائف ہو ۔۔ ایسے زمانے میں حُسن کی خود مختاری اور آرٹ کی آزادی پر ایمان لانا گویا خیر تنکے پر تو نہیں مگر تختے پر بیٹھ کے بحرالکاہل کی سیاحت کے لئے نکلنا ہے، لیکن یہاں یہ نہ بھولئے کہ فن کار یہ سب خطرے ایک بلند تر اخلاقیات اور ایک بلند تر صداقت کے لئے مول لے رہا ہے۔ جب بودلیر کہتا ہے کہ "الزام دینا، مخالفت کرنا، اور انصاف کا مطالبہ کرنا بھی کیا یہ اپنے آپ کو تھوڑا سا (PHILISTINE) بنانا نہیں ہے؟" تو وہ فن اور فن کار کی خود مختاری کا اعلان تو ضرور کر رہا ہے مگر سب سے زیادہ اُسے یہ فکر ہے کہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح سستی اخلاقیات کی آلودگی سے بچائے رکھے۔ ممکن ہے کہ یہ فن کار اُس بلند تر اخلاقیات کا کوئی واضح تصور نہ رکھتے ہوں، لیکن انہیں یہ خیال ضرور ہے کہ مروجہ اخلاقیات سے اگر وہ بچ نکلے تو شاید کسی بلند تر اخلاقیات کی ایک جھلک دیکھ لیں، میں مانتا ہوں کہ یہ بڑا منفی جذبہ ہے، مگر وہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اپنے زمانہ کی جھوٹ کا تجربہ کرتے کرتے وہ اوروں سے تو کیا، اپنے آپ سے بھی ڈرنے لگے ہیں اور یہ بذاتِ خود ایک بڑا زبردست اخلاقی اصول ہے اور جس پر عمل کرنا کچھ فن کاروں ہی کو آتا ہے۔

اچھا، اب نئے فن کاروں کا ایک اور رجحان دیکھئے۔ اُوپر میں نے جن نظریوں کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کی رُو سے ایک تکمیل یافتہ فن پارہ اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے تو ایک معروضی اور جمالیاتی چیز بن گیا اور اخلاقیات سے ماوراء ہو گیا، لیکن اب مشکل آ پڑتی ہے موضوع کی۔ موضوع کی بجائے خود کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، لیکن فن پارے کا کوئی موضوع تو ہونا لازمی ہے ۔۔ خصوصاً ادب میں۔ اخلاقی راؤں یا خیالات کو خیر الگ کر دیجئے،

لیکن کم سے کم جذبات یا محسوسات کو تو موضوع بنانا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا چارہ ہی نہیں
لیکن جذبات سے متعلق ہوتے ہی ہم پھر اخلاقی معیاروں کی دُنیا میں داخل ہو جاتے ہیں
اس لئے فن کار خیالات تو الگ رہے جذبات سے بھی بھڑکنے لگے، ویسے بھی وہ اپنے جذبات
کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے، اور یہ سوال پوچھنے لگے تھے کہ یہ جذبات کیا اس قابل
بھی ہیں کہ انہیں محسوس کیا جائے۔ کسی اخلاقی تصور کے بغیر انسان کا دماغ یا روح تو کیا
حواس خمسہ بھی فنا ہو جاتے ہیں، چنانچہ بیسویں صدی میں واقعی فن کار یہ محسوس کر رہا ہے (میں
سمجھتا ہوں کہ اس دوسری جنگ عظیم نے ابھی تک کوئی بہت بڑی بنیادی تبدیلی نہیں کی
ہے اور فن کار کے مسئلے ابھی حل نہیں ہوئے ہیں) اُس کے جذبات اور احساسات سب مُردہ
ہو چکے ہیں۔ ایلیٹ کی ان چار لائنوں میں اس موت کا اظہار اس کے اسباب اور نتائج
سب آجاتے ہیں۔

have lost my passion: why should I need to keep it
Since what is kept must be adulterated?
I have lost my sight, smell, hearing, taste and touch
How should I use them for your closer contact?

یوں ہونے کو تو ۱۹۳۰ء کے بعد کی انگریزی شاعری میں محسوسات کی بڑی فراوانی بلکہ
ریل پیل ہے، مگر اس کی حقیقت بھی ایلیٹ نے بیان کر دی ہے:

Excite the membrane, when the sense has cooled
with pungent sauces.

تو ان فن کاروں کو جذبات کے بالکل ختم ہو جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ جو جذبات باقی بھی
ہیں اُن کی قدر و قیمت کے بارے میں فن کار کو شک ہے۔ جس طرح وہ اوروں کی اقدار قبول
کرنے سے انکار کرتا ہے، اسی طرح اپنے جذبات دوسروں کے اُوپر ٹھونسنے سے جھجکتا ہے
یہاں تک کہ وہ اپنے جذبات کی ذمہ داری بھی نہیں لینا چاہتا۔ معروضیت پہ جو اتنا زور

دیا گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ جذبات سے گریز کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار کو اقدار کے متعلق اپنے ماحول سے اتنا اختلاف ہے کہ وہ اپنے آپ کو اگر ادنیٰ سے برتر نہیں تو الگ ضرور سمجھتا ہے، بلکہ کوشش کر کے اپنے آپ کو علیحدہ اور مختلف رکھنا چاہتا ہے۔ یہ خواہش ایسی مجنونانہ شکل اختیار کرتی ہے کہ مثلاً بودیلیر لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں بچے اُبال اُبال کر کھاتا ہوں، فن کار دوسرے مبتذل انسانوں سے کسی بات میں بھی مشابہت نہیں رکھنا چاہتا، اگر دوسروں کے اندر جذبات ہیں تو اس کے اندر بالکل نہیں ہونے چاہئیں، اُسے دیوتاؤں کی طرح ان چیزوں سے بالا و برتر ہونا چاہئے اور کسی چیز سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور اگر وہ متاثر ہوتا بھی ہے یا اس کے اندر جذبات ہیں بھی تو کم سے کم دوسروں پر اس کا اظہار قطعاً نہ ہونے پائے، یہ بودیلیر کے مرشد Dandy کی خاص صفت ہے۔

جذبات سے اس گھبراہٹ کے دو حل تلاش کئے گئے۔ ایک تو یہ کہ نئے اور مبہم جذبات ڈھونڈے جائیں، جنہیں آج تک کسی نے محسوس ہی نہ کیا ہو، اور انہیں معمے کی شکل میں پیش کیا جائے تاکہ مبتذل عوام اُن پر اپنے سے متعلق ہونے کا شبہ ہی نہ کر سکیں، یہ تو ہوا ورلین اور میلارمے کا نقطۂ نظر، دوسری طرف یہ کوشش بھی ہوئی کہ کسی طرح موضوع اور معنی ہی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ شعر کو بھی موسیقی کی طرح مناسبات سے آزاد ہونا چاہئے۔ موسیقی میں مختلف سُروں کو سنتے ہوئے ہمیں یہ یاد نہیں آتا کہ یہ آواز تیتر کی ہے اور یہ بٹیر کی، ہم انہیں صرف آواز کی حیثیت سے سُنتے ہیں، اور آوازوں کے حُسنِ ترتیب اور آہنگ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت شعر میں بھی ہونی چاہئے۔ شعر پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن معنی کی طرف نہ جائے، بلکہ آواز ہی سے ہماری پوری تسلی ہو جائے۔ افسانے یا شعر کو معنی سے آزاد کرانے کی کوشش غلو ہونے کی، اس کے خیال میں وہ زمانہ تو ہو چکا جب بڑا ادب پیدا ہو سکتا تھا، ہمارا زمانہ اتنا مبتذل، گندا اور بدہیئت ہے کہ حُسن سے اس کا میل ہو ہی نہیں سکتا، لیکن چونکہ نئے ادیب کا موضوع اس زمانے کے علاوہ کوئی اور زمانہ ہو بھی نہیں سکتا، اس لئے اس کے

لئے صرف یہ چارۂ کار ہے کہ اپنے فن اور طرزِ تحریر کے زور سے اپنے موضوع کی گندگی اور بدصورتی دور کرے، ورنہ کم سے کم اُسے بے اثر بنا دے۔ اس صورت میں موضوع کی بذاتِ خود کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، جو کچھ ہوا وہ طرزِ تحریر ہوا، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ موضوع کے بغیر صرف طرزِ تحریر کی مدد سے ایک فن پارہ تخلیق کیا جا سکے؟ چنانچہ فلوبیر کا اپنے جذبات سے ڈر دیکھنے کے قابل ہے، ایک طرف تو وہ تمام عمر یہ کہتا رہا کہ جو ناول میں لکھ رہا ہوں، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، ان میں متوسط طبقے کی تصویر کشی ہے اور یہ موضوع ہی نکما ہے، ذرا مجھے اپنی پسند کا سا موضوع مل جائے تو پھر واقعی میں کچھ کر سکوں گا، دوسری طرف اُسے یہ حسرت رہی کہ وہ ایسا ناول لکھے جس کا کوئی موضوع نہ ہو، بلکہ جو صرف طرزِ تحریر کے بل پر زندہ ہو۔ غرضکہ اس دور میں یہ ایک عجوبہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بغیر کسی مواد کے لوگ تخلیق کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ کوشش سرے سے لایعنی ہے، خصوصاً ادب میں، موسیقی یا مصوری میں تو پھر بھی کسی حد تک فن پارے کو جمالیات کے اندر محدود رکھنا ممکن ہے کیونکہ آوازوں، لکیروں اور رنگوں کو کچھ نہ کچھ خود مختارانہ معروضی حیثیت حاصل ہے، لکیروں کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے کہ چاہے اُن سے کوئی بڑا فن پارہ تشکیل نہ پائے، لیکن وہ ترتیب بجائے خود ہماری جمالیاتی تسکین کر دے، اور ہم اس کے بعد کسی اور قسم کا سوال نہ پوچھیں، لیکن لفظ اس طرح آزاد اور خود مختار نہیں ہیں جس طرح لکیریں یا آوازیں۔ لفظ خالص آواز نہیں ہیں، نہ وہ فطری ہیں، بلکہ انسان کی ایجاد ہیں، اور ایک خاص مقصد کے ماتحت ایجاد کئے گئے ہیں، لفظ تو علامتیں ہیں، وہ ہمارے ذہن کو ایک خاص تصور اور ایک خاص معنی کی طرف لے جاتے ہیں، لفظوں کو "خالص" بنانے کے لئے ہمیں اُن کے مقصد کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور اُس کے بعد لفظوں اور آوازوں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ یعنی ادب موسیقی میں مدغم ہو کر غائب ہو جائے گا، تو جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اگر ادب کو اپنی ہستی برقرار رکھنی ہے تو وہ موضوع اور معنی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ معنی کے بغیر ادب پارہ محض گورکھ کا پھول ہے۔

یہ چیز تو خیر عملی طور پر ناممکن تھی، لیکن یہ طے پا گیا کہ فن پارے میں اصل چیز اسلوب یا طریقۂ کار ہے، چنانچہ فن کاروں نے ہیئت کی پرستش شروع کر دی اور اس میں اتنا غلو ہوا کہ PAUL VALERY نے تو آخر یہ کہہ دیا کہ فن کار کی جدوجہد کا حاصل طریقۂ کار کی تلاش ہے، طریقۂ کار مل جائے تو اس کے بعد اگر وہ فن پارے کی تخلیق نہ بھی کرے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ اب فن کار نہ تو جذبات ڈھونڈتا ہے نہ موضوعات نہ اور کچھ، بلکہ صرف ہیئت۔ یہی ایک چیز ہے جس کی اُسے دُھن ہے۔ یوں اگر اس سے ہیئت کی تعریف پوچھی جائے تو وہ خالص جمالیاتی اوصاف بتائے گا کہ وضعی حسن کے لئے اجزا اور کُل کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ لیکن جب وہ ہیئت کا نام لیتا ہے تو نہ معلوم اس سے کیا کیا چیزیں مُراد ہوتی ہیں، گویا ہیئت پورے فن پارے کی قائم مقام ہے۔ ہیئت اُس کی نظروں میں ایک ایسا اسمِ اعظم بن گئی ہے کہ یہ مل گیا تو سمجھئے کہ سب کچھ مل گیا — جذبات بھی، تخیلات بھی، موضوعات بھی۔ اور مزا یہ کہ فن کار یہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ وہ ہیئت کے تصور میں اتنے عناصر شامل کرتا ہے، بلکہ ہیئت کے خالص جمالیاتی تصور پر اڑا رہے گا، اس خالص جمالیاتی تصور کی جستجو وہ اس شدت اور سرگرمی سے کرتا ہے جس طرح اہلِ تصوف خدا سے وصال کی آرزو کیا کرتے ہیں، بلکہ درحقیقت ہیئت کی جستجو ایک قسم کا تصوف بن گئی ہے، جس میں اصلی تصوف کے سارے لُطف اور سارے کرب موجود ہیں۔

لیکن، نظریاتی حیثیت سے نہیں بلکہ عملی اعتبار سے غور کریں تو کیا واقعی ہیئت کا یہ تصور کہ ہیئت صرف جمالیاتی تسکین بہم پہنچانے والے وضعی رشتوں کا نام ہے کسی طرح حقیقی ہو بھی سکتا ہے؟ خاص طور پر ادب میں، موسیقی کے ایک ٹکڑے میں تو خیر آوازوں کو ترتیب دے کر حسین ہیئت پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن پانچ سو صفحے کے ناول میں آوازوں کا باہمی رشتہ کس طرح قائم کیجئے گا اور ایسا نقش کس طرح وجود میں لایئے گا جس میں نشو و نما کی کیفیت نظر آئے اور جو شروع سے آخر تک محفوظ رہ سکے؟ اگر بفرضِ محال ایسا ہو بھی گیا تو اس فن پارے کو آپ ادب کہیں گے یا موسیقی؟ ادب میں ایک بڑی پابندی یہ ہے کہ معنی کو آپ لفظوں سے خارج نہیں کر سکتے؟ اس لئے ادب میں آپ کو دو قسم کی ترتیب

کرنی پڑے گی، اور دو نقشے بنانے پڑیں گے، ایک تو لفظوں کی ترتیب آواز کے لحاظ سے، دوسری ترتیب معنی کے لحاظ سے، تو گویا ادب پارے میں دو ہیئتیں ہونگی، ایک مادّی، دوسری معنوی، جیسا میں نے ابھی کہا تھا' آوازوں کی ترتیب کا سلسلہ پانچ سو صفحے تک جاری نہیں رکھا جاسکتا، لیکن معنوی ہیئت اس کی متحمل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ادب پارے میں مجبوراً مادی ہیئت کا انحصار معنوی ہیئت پر ہوگا، لیکن معنی کا تصوّر اقدار کے تصوّر کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ معنی کی ترتیب کے لئے صرف حُسن اور بدصورتی کے معیاروں سے کام نہیں چلے گا' اس میں نیکی اور بدی' سچ اور جھوٹ کے تصوّرات کا دخل بھی لازمی ہوگا' تو جس چیز سے بچ کر بھاگے تھے' اُس سے پھر دوچار ہونا پڑا۔ فن کار چاہے یا نہ چاہے' اخلاقیات کا جُوا اس کی گردن پر رکھا ضرور رہے گا۔

اس کی ایک بڑی مزیدار مثال دیکھئے۔ اِدھر کچھ مصوّروں نے دعویٰ کیا کہ وہ رنگوں کو مناسبات سے بالکل اسی طرح آزاد کرانا چاہتے ہیں جس طرح موسیقی میں آوازیں آزاد اور خالص ہیں' چنانچہ یہ اسکول اس قسم کی تصویریں بناتا ہے کہ ایک مُربّع یا مستطیل بنالیا' اُسے چھوٹے بڑے خانوں میں بانٹا اور کسی خانے میں زرد رنگ بھر دیا' کسی میں نیلا' کسی میں سفید' اس کی تفسیریوں کی جائے گی کہ مثلاً زرد رنگ جنّت یا نشاطِ محض کی نمائندگی کرتا ہے' سُرخ رنگ دوزخ یا کربِ محض کی' وغیرہ وغیرہ۔ بالکل وہی بات ہوئی' اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ واقعی اخلاقیات ایسا دامِ سخت ہے اور آشیاں کے اتنے قریب کہ اس سے بالکل مفر ممکن ہی نہیں۔ ہیئت کی تکمیل کے لئے اخلاقیات یوں اور بھی ضروری ہے کہ فطرت میں ہر ہیئت کا مقصد ہوتا ہے' ہر چیز کی شکل حیاتیاتی قانونوں کی پابند یا اُن سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ چنانچہ فن پارے میں بھی معنوی ہیئت بغیر کسی اخلاقی تصوّر کے ممکن نہیں' حالانکہ جوئس پر جمال پرستی اور زندگی سے دوری کی تہمت تو لگائی جاتی ہے' مگر اس نے اس حقیقت کا اظہار بڑے بے لاگ طریقے سے کر دیا ہے۔ جوئس کا فن کار اسٹیون آرٹ کو حُسن کے تصوّر کی تشکیل سمجھتا ہے۔ وہ خود بھی آرٹ کی تخلیق کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکا' غالباً ابھی اُس کے پاس حُسن کا کوئی تصوّر ہی نہیں ہے' ناول کے آخر میں

اشیون کہتا ہے "میں اپنی روح کی بھٹی میں اپنی نسل کا ضمیر ڈھالنے جا رہا ہوں جو ابھی تک پیدا ہوا نہیں ہوا" یعنی سب سے پہلے اسے نیکی اور صداقت کے تصور کی تلاش ہے. اور نیکی کی مدد سے حسن کا تصور حاصل کرنے کی اُمید ہے. حسن بھی ضمیر ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ضمیر سے کنارہ کش ہو کر حسن کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایزرا پاؤنڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہئیت آرٹ کے لئے سرے سے ضروری ہی نہیں۔ مثال کے طور پر اُسے ہومر کے یہاں ہئیت کی موجودگی سے انکار ہے۔ یعنی ان معنوں میں جو لفظ 'ہئیت' کو انیسویں صدی میں پہنائے گئے ہیں۔

ہئیت آرٹ کے لئے لازمی ہو یا نہ ہو، بہرحال خالص جمالیاتی ہئیت ادب میں بالکل بے معنی چیز ہے، ایک ایسا سراب ہے جس میں ذرا بھی اصلیت نہیں۔ اس کا حصول اسی قدر ممکن ہے جتنی پریوں سے ملاقات، ہئیت کی جستجو نے فلوبیر کو جس طرح ناکوں چنے چبوائے ہیں وہ بھی عبرت ناک چیز ہے، لیکن فن کار میں ایک بات بڑی مخدوش ہے —— ترقی پسندوں اور آرٹ کے دوسرے دشمنوں کے لئے۔ وہ یہ کہ آپ فن کار پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کر سکتے جس سے وہ پہلے سے واقف نہ ہو۔ فلوبیر نے بار بار کہا ہے کہ بڑے ادیبوں کی عظمت آرٹ یا طرزِ بیان جیسی نہیں، کبھی کبھی وہ بہت ہی بُرا لکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بلکہ شاید اسی وجہ سے، انکی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن یہ سب تسلیم کرنے کے بعد وہ پھر یہی اصرار کرتا ہے کہ ہم جیسے دوسرے درجے کے آدمیوں کے لئے تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ آرٹ یا طرزِ بیان کا سہارا پکڑوں۔ چنانچہ آرٹ کی دُھن میں اُس نے اپنے آپ کو ایسے ایسے درد اور کرب میں مبتلا کیا ہے کہ بلبلا بلبلا اٹھا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ طرزِ بیان کا عفریت میری جان اور جسم دونوں کو گھلائے دے رہا ہے۔ کبھی چیخ اٹھتا ہے، "آرٹ آرٹ، زہرناک فریب، بے نام بھوت، جو چمک چمک کر ہمیں لبھاتا ہے اور ہمیں تباہی کی طرف لے جاتا ہے!" فلوبیر خوب جانتا تھا کہ اسکے اندر توانائی اور تخلیق کی قوت پیدا کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ طرزِ بیان نہیں، بلکہ زندگی کے ایک نئے تصور، اخلاقیات کے ایک نئے معیار کی ہے۔ اپنے دل پسند موضوع کا انتظار یہی معنی رکھتا ہے کہ اُسے ایک نئے

تو

نظامِ اقدار کی جستجو تھی۔ زندگی کے پیدا ہونے کا منظر تو خیر اُس نے "ST. ANTHONY"
میں دیکھ لیا تھا، اور یہ منظر بڑا جانفزا اور روح پرور ثابت ہوا تھا۔ لیکن زندگی نے جو راہ اختیار
کر لی ہے اسے کیسے قبول کیا جائے اور اپنے آپ کو اُس سے کس طرح ہم آہنگ بنایا جائے
اس کا نسخہ فلوبیر ساری عمر ڈھونڈتا رہا اور کبھی نہ پا سکا۔ اس ہم آہنگی کی ایک جھلک تو
خیر اس نے ایک لمحے کے لئے "A SIMPLE SOUL" میں دیکھ لی تھی لیکن مستقل
طور پر اس کی روح کو تسکین کبھی نہ ہو سکی، اور وہ ہمیشہ ایک نئی معنویت کی تلاش میں رہا
لیکن جو وجوہات میں نے اس مضمون کے شروع میں بیان کر دی ہیں انکی بناء پر یہ جرأت
نہیں ہو سکی کہ یہ بات تسلیم کر لے۔ اُسے جستجو تھی نئی اخلاقیات کی اور وہ اپنے آپ کو سمجھاتا یہ
رہا کہ مجھے آرٹ کی ضرورت ہے، یہی کمزوری اُس کی ساری روحانی اذیتوں کی جڑ ہے۔

یہی حال کم و بیش اور فن کاروں کا بھی ہے۔ ہیئت کے پردے میں دراصل وہ معنویت
ڈھونڈ رہے ہیں۔ صنعتی دور کی زندگی بے شکل اور بے ہیئت زندگی ہے، اس کے اجزا اور
کل کے درمیان نامیاتی ربط باقی نہیں رہا۔ زندگی اور جن چیزوں پر زندگی مشتمل ہے اُن کا
کوئی مقصد متعین نہیں رہا، چنانچہ ان سب کی معنویت مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ جب تک زندگی
میں مقصد، معنویت، ہم آہنگی اور ہیئت باقی تھی، فن کار کو شعوری طور پر ان چیزوں کے
لئے کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لیکن آج جب یہ چیزیں غائب ہیں اور فن کار اپنے اندر اتنی
طاقت نہیں پاتا کہ سماج میں انھیں دوبارہ واپس لا سکے تو وہ لامحالا آرٹ کی طرف مڑتا ہے اور
وہاں ان سب کا نعم البدل حاصل کرنا چاہتا ہے، چونکہ فن پارے میں وہ ہم آہنگی اور ہیئت
پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی میں مفقود ہے، اس لئے وہ فن پارے کو زندگی سے الگ حقیقت سمجھتا
ہے، اور زندگی کی اقدار کو آرٹ پر عائد نہیں کرنا چاہتا، چونکہ ماحول اُسے اقدار کا کوئی معیار
زندگی کا کوئی مقررہ سانچا مہیا نہیں کرتا، اس لئے وہ فن پارے کی تخلیق اور اس کے اجزا کی
ترتیب کے اصول جمالیات سے مانگتا ہے، مثال کے طور پر پہلے ناول نگاروں کے لئے ایک گھڑی
گھڑائی ہیئت موجود تھی۔ ایک مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے، ان کے راستے میں مشکلات
آتی ہیں۔ لیکن آخر یہ مشکلات دور ہو جاتی ہیں، دونوں کی شادی ہو جاتی ہے، اور وہ ہنسی

وشی عمر بسر کر دیتے ہیں۔ لیکن آج کل زندگی کا کوئی ایک سانچہ موجود نہیں، ہر آدمی کی
ندگی ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے یا اوروں کی طرح بے شکل رہتی ہے، پہلے ناول ختم
یرو سے ہماری دلچسپی ناول کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی تھی، اور ہم سمجھ لیتے تھے
ہ اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوتی ہوگی۔ ہیرو نے باقی زندگی اس طرح بسر کی ہوگی
س طرح اور لوگ بسر کرتے ہیں، لیکن اب ناول اور افسانے اس طرح ختم ہوتے ہیں کہ آخر
یں ہیرو کو زندگی میں کا کوئی نیا راستہ نظر آتا ہے، اور وہ اس پر چل کھڑا ہوتا ہے، یہ بھی نہ ہو
ب بھی ہیرو کی زندگی میں جیسی باتیں ہوتی رہی ہیں ناول کے خاتمے کے بعد بھی ایسی بہت
ی باتیں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اس ہیرو کی زندگی میں منزل کوئی نہیں، بس چلنا ہی چلنا ہے
سکی معنی یہ ہوئے کہ ناول کو آپ جہاں چاہیں ختم کر سکتے ہیں۔ اور چاہیں تو ناول کا دوسرا
ور تیسرا حصہ بھی لکھ سکتے ہیں، تو زندگی آپ کو یہ نہیں بتاتی کہ کہاں شروع کریں اور کہاں
تم کریں۔ زندگی آپ کو کوئی معنوی ہیئت فراہم نہیں کرتی۔ اس لئے اپنے فن پارے کی
خاطر آپ کو جمالیاتی ہیئت ہی ڈھونڈنی پڑتی ہے جو اپنی خالص شکل میں ناممکن ہے، لہٰذا
ن کار مجبور ہے کہ وہ معنوی ہیئت بھی اپنے آپ ہی تلاش کرے، یہاں آکر ہیئت کی تلاش
خلاقیات کی تلاش بن جاتی ہے، موجودہ زمانے کا آرٹ صرف زندگی کا نعم البدل ہی نہیں
ہے، بلکہ زندگی اور زندگی کی معنویت کی جستجو بھی ہے، یوں تو یہ بات ہر آرٹ کے متعلق کہی
جا سکتی ہے، لیکن نئے آرٹ کے متعلق خاص طور پر اور اس حیثیت سے یہ آرٹ ایک عظیم الشان
اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ زندگی کی تلاش کے دوسرے ذرائع زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوئے ہیں اور
ناکو معنویت ڈھونڈ کر دینے کا فریضہ فن کاروں کے سر آ پڑا ہے۔

یہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی کہ فن کار اس سارے عمل سے بے خبر رہے ہیں۔ اپنے آپ
سے لاعلمی فن کار کی صفتوں میں سے نہیں۔ اخلاقیات سے بے نیاز ہو جانے کی خواہش ضرور ان کے
دل میں موجود تھی، لیکن وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔ فلوبیر سے لوگوں کو شکایت تھی کہ
وہ سیاست سے بالکل بے تعلق ہو گیا ہے، اس کے جواب میں اس نے کہا ہے کہ میری مصیبت یہ

میں ضرورت سے زیادہ سیاست میں الجھا رہتا ہوں۔ اسی طرح ۱۸۷۱ء فرانس کی شکست کے بعد اُس نے کہا تھا کہ اگر لوگ میری کتاب SENTIMENTAL EDUCATION پڑھ لیتے تو یہ حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔ فلوبیر کیا معنی، یہ سارے فن کار، شاید اپنی مرضی کے خلاف سیاست اور اخلاقیات سے بہت مشغول تھے۔ بودلیئر نے ان فن کاروں کی پوری کیفیت ایک جملے میں بیان کر دی ہے، وہ کہتا ہے کہ انسان کے خون میں جمہوریت اس طرح شامل ہے جیسے آتشک کے جراثیم، اس سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ فلوبیر اور جوئس کے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی اخلاقی تصور پایا جاتا ہے، اور اسی کی بدولت اُن میں فنی ہم آہنگی اور ہیئت کا حسن آتا ہے، جوئس کے یہاں تو پھر بھی یہ اخلاقی تصور پس پردہ رہتا ہے، لیکن فلوبیر کے یہاں تو ناول کی پوری نشو و نما ہی اس تصور کے زور سے ہوتی ہے، اور اسی سے ناول میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

آخر میں ایک نظر نفسیات اور ہیئت کے تعلق پر بھی ڈالتے چلیں۔ نئی نفسیات کے وجود میں آنے سے فن کاروں کو امید بندھی تھی کہ شاید اسکی مدد سے وہ اخلاقیات سے چھٹکارا پا سکیں، خیر، نئی نفسیات ہمیں اخلاقیات سے تو آزاد کر سکتی ہے، کیونکہ اگر ہم انسان کو نفسیاتی مرکبات یا جبلتوں کا کھلونا مان لیں تو اپنے افعال کی ذمہ داری اس پر باقی نہیں رہتی اور جب انسان خود مختار نہیں رہا تو اخلاقی معیاروں کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا لیکن نفسیات اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ہیئت کو بھی ختم کر دیتی ہے، کیونکہ نفسیات صنعتی دور کی بے شکل زندگی کو اور بھی بے شکل بنا دیتی ہے۔ نفسیات کے نزدیک انسان ایک عمل ہے جو موت کے وقت تک بے رکے جاری رہتا ہے، اس عمل کی بہت سی شاخیں ہیں، سوچنا، محسوس کرنا وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ نفسیات اخلاقیات سے ماوراء ہے، اس لئے اس عمل کا کوئی مقصد بھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس عمل کا ہر لمحہ دوسرے لمحوں سے بالکل مختلف اور انوکھا ہے۔ اس لئے آپ ان لمحوں کو کسی نقش کی شکل میں بھی ترتیب نہیں دے سکتے۔ اس عمل میں کسی قسم کا آہنگ نہیں ملتا۔ یہی عمل آپ کا موضوع ہے۔ اب آپ کے موضوع میں نہ تو کوئی آہنگ ہے نہ اسکی کوئی شکل ہے، اور اخلاقیات کی مدد آپ

ہیئت کیسے حاصل
بینا چاہتے نہیں، تو بتلائیے کہ اس صورت میں آپ کے فن پارے کو ہیئت کیسے حاصل
ہوسکتی ہے۔ ادب میں مکمل تاثریت تو ممکن ہی نہیں یا ممکن ہے تو صرف اس طرح کہ ہیئت
اور ترتیب کا کوئی نشان نہ ہو، آپ مجبور ہیں کہ اس عمل میں سے ایک ٹکڑا اٹھائیں. لیکن یہ ٹکڑا
کہاں سے شروع ہو اور کہاں ختم ہو ؟ اس میں نہ تو جمالیات آپکی مدد کرسکتی ہے نہ نفسیات
جب آپ ایک خاص جگہ سے شروع کرینگے اور ایک خاص جگہ ختم کرینگے تو فوراً ایک چیز
کو دوسری چیز پر ترجیح دینے کا اقدار کا، اخلاقی معیاروں کا سوال پیدا ہو جائیگا. آرٹ
کیا معنی، زندگی کے کسی شعبے میں بھی اخلاقیات کی آمیزش کے بغیر خالی نفسیات کار آمد نہیں ہوسکتی
اخلاقیات کے بغیر نفسیات کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں، جو لوگ اس حقیقت پر نظر نہیں رکھتے، اور
احتیاط سے کام نہیں لیتے وہ غیر جانبداری کے باوجود صنعتی اخلاقیات کا شکار ہو جاتے ہیں.
مثال کے طور پر نفسیات کا ماہر کہے گا کہ بودیلیر میں قوت ارادی نہیں تھی، اور فورڈ میں
بہت زیادہ تھی، کیونکہ بودیلیر روپیہ نہیں کما سکا اور فورڈ نے کروڑوں روپئے پیدا کئے.
حالانکہ شاعری کے لئے جس قوتِ ارادی کی ضرورت ہے، اسے کچھ شاعر ہی کا دل جانتا ہے،
وہی بات ہے جیسا قرآن شریف میں آیا ہے کہ اگر ہم اس کتاب کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ٹکڑے
ٹکڑے ہو جاتا۔ فورڈ صاحب تو بیچتے کیا ہیں، بہرحال اگر کوئی بورژوا شاعر کے رباب مانگے تو
بہت سے ماہرین نفسیات کو انکار نہ ہوگا. صنعتی اخلاقیات سے بچ بھی جائیں تو بھی کسی نہ کسی
اخلاقیات کا سہارا لئے بغیر کام نہیں بنتا SURREALISTS نے کوشش کی تھی کہ
خالص نفسیاتی آرٹ پیش کیا جائے جو بالکل غیر شعوری ہو، اخلاقیات کا پابند نہ ہو، لیکن اپنی
تخلیقات میں معنی پیدا کرنے کے لئے انھیں بھی مارکسیت کی ضرورت پڑی
غرضکہ جمالیات ہو یا نفسیات کوئی چیز فن کار کو اخلاقی ذمہ داری سے آزاد نہیں کرسکتی
اس کا کام حسن کی تخلیق ضرور ہے مگر نیکی اور صداقت سے قطع تعلق کرکے وہ حسن کو بھی نہیں
پا سکتا. ہیئت کا افسانہ گھڑ کے فن کاروں نے اخلاقیات سے نکل جانے کی تو بہتیری کوششیں
کیں، لیکن گھوم گھام کے انھیں پھر وہیں آنا پڑا جہاں سے چلے تھے۔
اس مضمون میں، میں نے اس زمانے کے فن کاروں کے ایک رجحان کا ذکر کیا ہے،

اور صرف یہ بتایا ہے کہ وہ اخلاقیات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش میں لگا ہوا
ہے   یہ رجحان نظریاتی زیادہ ہے عملی کم۔ انھیں فن کاروں کی تخلیقات میں زمانے
کی اخلاقی حالت کا جیسا تجزیہ اور نئی اخلاقیات کے قیام کی جیسی شدید خواہش ملتی ہے
وہ سیاست یا فلسفے یا اور شعبوں میں نظر نہیں آتی۔ اگر وہ اخلاقی رائیں یا خیالات
ظاہر کرتے ہوئے گھبراتے ہیں تو یہ بھی انکی ایمانداری اور صداقت پرستی ہے ورنہ پیغمبری
کا دعویٰ کیئے بغیر اور اپنی بے چارگی کے اعتراف کے باوجود انھوں نے اپنے زمانے کے
حساس آدمیوں کی زندگی کو اس طرح بدلا ہے جو ایک عظیم انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے یہی
کیا کم ہے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی ریاکاری نہیں برتی اور اپنے متعلق کبھی جھوٹ
نہیں بولا۔ بودیلیر کی اس ایک لائن میں "میرے ریاکار پڑھنے والے، میرے بھائی، میرے
ہم شکل!" اس ایک لائن میں جو انقلاب انگیز اخلاقیات پنہاں ہے، اس سے بڑے
بڑے اخلاقی سلم خالی ہیں۔ اس پچھلی ایک صدی میں فن کاروں نے جو کچھ کیا ہے وہ
ادب اور فن کے لئے باعثِ عار نہیں، بلکہ انکی تخلیقات نے آرٹ کی سچائی، قوت اور اہمیت
کی ایک نئی گواہی پیش کی ہے۔ فن کار نے دکھایا ہے کہ اوروں کو روپیہ سے، عہدوں سے
یا رنگین آدرشوں کے لالچ سے خریدا جا سکتا ہے، مگر فن کار جب تک کہ وہ فن کار ہے۔
خرید و فروخت سے بالاتر ہے، کیونکہ اس کے لئے سب سے بڑی حقیقت اس کے اعصاب ہیں۔
اور اعصاب جھوٹ نہیں بولا کرتے، اسی لیئے فن برائے فن کا نعرہ ایک اخلاقی حقیقت ہے
اور اخلاقیات کا ممد و معاون ہے، جب کوئی سیاسی یا اخلاقی حادثہ رونما ہوتا ہے تو
میں بڑے رنج کے ساتھ کہتا ہوں، "کاش لوگ بودلیر پڑھتے!"

شورؔ (علیگ)

سیاروں کی آواز

مریخ

یہ سلگتی ہوئی دنیا یہ چٹکتے ہوئے سر بامِ تہذیب پہ جلتے ہوئے جبریل کے پر،
یہ دہکتی ہوئی حکمت، یہ تمدن کا دھواں خونِ آدم کو ابھی اور کروں کچھ ارزاں
یہ گناہوں کے نشیمن، یہ شبستاں، یہ محل، آدمی خوار خداؤں کے یہ خونیں ہیکل
اِن کی مٹی سے مجھے خون کی بو آتی ہے میرے سینے میں مری سانس گھٹی جاتی ہے
دفترِ حکمت و الہام کو جلنے دو ابھی قالبِ مہر میں ظلمات کو ڈھلنے دو ابھی
پھونک کر عقل و سیاست کی دکانیں رکھ دو سینۂ خاک پہ ظلمت کی چٹانیں رکھ دو
بجلیو رقص کرو رقص مرے سازوں پر زلزلے چونک کے اٹھو مری آوازوں پر
آندھیو دوش پہ طوفان کے پرچم کھولو ظلمتِ وقت کی صبحوں میں سیاہی گھولو
آدمی زاد کے ہونٹوں سے تبسم چھینو جس کی تعبیر ہو شیون وہ ترنم چھینو،
آؤ شعلوں کے حوالے گل و ریحاں کر دیں اب جو ساحل نظر آئے اسے طوفاں کر دیں
جن کے منہ دیکھ کے طوفان لرز جائیں گے اُن چٹانوں سے سفینے مرے ٹکرائیں گے

آؤ صدیوں کی امانت کو مٹا کر رکھ دیں — طاقِ تہذیب کی ہر شمع بجھا کر رکھ دیں
تو وہیں جنتِ ارضی کو مٹا کر دیکھیں — آج خود عرش کو زنجیر پہنا کر دیکھیں!!

آفتاب

قہقہے تیشِ حوادث کی سہیں گے کب تک — زمزمے خونِ تبسم میں بہیں گے کب تک
ہو چکے خون سے لبریز بہت جام و سبو — پی چکے کھیت بہت روز کسانوں کا لہو
حادثو توسنِ ایام کو مہمیز کرو — انقلابوں کی ہواؤں کو ذرا تیز کرو
جلوۂ نادیدہ پسِ پردۂ خواب اور بھی ہیں — اٹھنے والے مرے چہرے سے نقاب اور بھی ہیں
زیرِ افلاک بہشتوں کی بہارو آؤ — افقِ زیست پہ اے عرش کے تارو آؤ
جیبِ ظلمات میں پھر چاند ستارے بھر دیں — آؤ اس خطۂ تاریک کو روشن کر دیں
مری تابندہ جبیں سے وہ کرن پھوٹے گی — وقت کی گود میں صبحوں کی لڑی ٹوٹے گی
سونپ دے سینۂ ایام کو چھینے ہوئے راگ — بخش دے خون میں لتھڑی ہوئی دنیا کو سہاگ
رامش و رنگ کے طوفان فضاؤں سے اٹھاؤ — شمعِ آلام کو نغموں کی ہواؤں سے بجھاؤ
تا کجا سلسلۂ چشمکِ پیکان و تبر — آؤ ان سرخ فضاؤں میں اچھالیں ساغر
تابشِ زہرہ و انجم کو تہِ دام کریں — کھلکھلاتے ہوئے محلوں کی ہنسی عام کریں
عہدِ سلطانیٔ جمہور قریب آتا ہے — پرچمِ صبح اندھیرے میں کھلا جاتا ہے

شوکت صدیقی

سنبھالا!

باہر، پیپل کے پتے ایکبارپھر چیخ اٹھے۔ دھندلی روشنی میں متغدر کا منحنی سایہ
اسیبی سا نظر آنے لگا۔ ہوا کی سرسراہٹیں برابر کھڑکی پر گنگناتی رہیں۔ لیمپ کی سہمی ہوئی روشنی
سنبھلنے ہی نہ پائی اور جب وہ لرزتی تو پرچھائیاں یوں جھک جاتیں جیسے کچھ ہونے والا
ہے۔ لیکن اس چھوٹے سے نیم روشن کمرے میں جہاں سرشام ہی اندھیرا منڈلانے لگتا
تھا، مرزا کو کبھی کبھی باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ حالانکہ اب رات کچھ زیادہ ہوچکی تھی
اور گلی کا ہنگامہ کہیں دور ایک گونج بنکر رہ گیا تھا مگر وہ کہے جارہا تھا: "بس کچھ پوچھو نہ
کہ کیا حالت ہوگئی۔ آنکھوں میں نیند تو بھری ہی تھی جیسے ہی دہلیز سے آگے بڑھا کہ یونہی نظر
وہاں جا پہونچی۔ سامنے دیوار کے پاس لاش پڑی تھی، جسم خون میں تھڑا ہوا تھا معلوم
کتنے زخم تھے اور آنکھیں کتنی بھیانک نظر آرہی تھیں۔ کوئی عورت تھی بیچاری۔ میری تو سمجھ
میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اتنی رات گئے اور خالی ڈیلنگ روم۔ لیکن آدمی خدا طریقہ کا ہو تو
کوئی آنچ نہیں آتی۔" اور وہ مسکرا دیا جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ گھنی بھنوؤں
کے نیچے دبی ہوئی اسکی زردی مائل آنکھوں کی سرخی اور چمک اٹھی۔ ان پُراسرار نظروں سے
ایسا معلوم ہوتا کہ نہ جانے وہ کیا کرنے والا ہے ورنہ یوں تو اسکی آنکھیں اسوقت بھی ایسی
ہی تھیں جب وہ دفتر میں کام کرتا تھا اور فلوری مسکرا کر کہا کرتی "اُو! مرزا، تم اس طرح
نہ دیکھا کرو، تمھاری آنکھوں سے تو ڈر لگتا ہے۔ سچ، اِتنا ڈر تو مجھے اس رات والے سارجنٹ
سے بھی نہ معلوم ہوا۔ اسنے تو اتنی بہت سی پی لی تھی کہ مار پریشان کر ڈالا۔ ہا!!
"بیچاری فوجی!" اور وہ جھنجھلا اٹھا۔ اونہہ! سالی کے تمام یاروں کے قصے سن سنکے
کوبس میں ہی تو رہ گیا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ٹائپ کرتے کرتے وہ جب اسکی طرف
دیکھکر ذرا ہنس دیتی تو وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی ڈانٹیں تک بھول جاتا تھا۔ لیکن صاحب تو روز
ہی کسی نہ کسی بات پر الٹی سیدھی سنا دیا کرتے تھے اور فلوری نہ معلوم کیوں اس طرح مسکرا

دیتی تھی۔ یہ سوچنے ہی میں تو لطف آتا تھا۔ بس غور کرتے رہو، اور کام کئے جاؤ مگر جس روز اُس نے وہ طویل سا نوٹس پڑا تھا تو اُسے اپنی آنکھیں کچھ سلگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور فلوری افسردہ سی گھوم رہی تھی۔ اس کے سانولے رنگ میں پھوٹتی ہوئی زردی کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی مگر وہ چاہتا تھا کہ آج وہ بڑا مسکراتی رہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا تھا۔ پاگل کہیں کی! یہ سکشن نہ سہی، کہیں اور سہی۔ صاحب اس کے لئے تو آخر کچھ نہ کچھ کرتے ہی۔ اور اپنا انجام تو وہ جانتا ہی تھا۔ پھر وہی ہوا۔ دن بھر گھر میں پڑا ہوا سستے قسم کے سگریٹوں کا دھواں اڑایا کرتا۔ بیوی سے ایک آدھا جھڑپ بھی ہو جاتی اور جو کبھی کچھ خیال آجاتا تو وہ گھبرا جاتا کہ اب کیا ہوگا مگر کندن نے اسے سنبھال لیا۔ پہلے لوگ ٹھیکوں کے لئے ہنسی خوشی جیبیں کٹواتے تھے اور اب بات تو وہی تھی مگر کوئی باہمی سمجھوتہ نہ تھا۔

صفدر انگڑائی لیکر کسمسانے لگا "مجھے تو اب چلنا چاہیئے، ابھی اور بھی تو کام ہیں" اور مرزا ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا "ہاں! اب تم جاؤ۔ لیکن تم سمجھ گئے نا۔ بس کیلیم پورہی سے تم میرے کمپارٹمنٹ کے سامنے چکر لگانا شروع کر دینا۔ وہاں پہونچتے پہونچتے ذرا رات ڈھل جائیگی۔ لوگ نیند کے مارے اونگھنا شروع کر دینگے۔ یہ باتیں وہ اس سے پہلے بھی کہہ چکا تھا مگر اُسے کسی طرح اطمینان ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر وہ جانتا تھا کہ بس اب بتانے پھر اتنا موقع کہاں ملیگا "دیکھو، کہیں گھبرا نہ جانا تمہارا .... ابھی پہلا سابقہ ہے" اور اسی بات سے صفدر کو چڑھ تھی۔ آخر وہ اس طرح کیوں بار بار سمجھا رہا تھا۔ بھلا اس میں گھبرانے کی کونسی بات۔ چار سال فوج میں رہکر وہ کن کن مشکلات سے نہ گزر چکا تھا۔ اور کہاں کہاں نہ گھوم چکا تھا۔ آفریقہ کے بھیانک جنگلوں کی وہ زندگی اور پھر میدان جنگ۔ تاروں میں الجھی ہوئی لاشیں۔ کٹے ہوئے اعضاء۔ زخمیوں کی چیخیں۔ اور پھر بے پناہ شور۔ زمین سے آسمان تک، مسلسل، لگاتار، ساری دنیا ایک دھڑکن بن کر رہ گئی تھی۔ اور زندگی جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ ٹیڑھی ناک والا سپاہی اور اسکی جھلکتی ہوئی سنگین۔ اُف! وہ چونک پڑا۔ اسکی داہنی آنکھ

میں بلیں اٹھنے لگی۔ اُس نے نیلے شیشوں والا چشمہ اتار کر رکھدیا اور آنکھ کو ہتھیلی سے
ملنے لگا۔ ہوا زور سے کھڑکی پر ٹکرائی اور دیوار کا بھاری بھرکم سایہ جھومنے لگا۔
مرزا نے صفدر کی طرف دیکھا۔ وہی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھ اور اس میں سمٹی ہوئی تاریکی
وہ کچھ سہم سا گیا۔ حالانکہ وہ ان باتوں کو مانتا نہ تھا۔ مگر اسے اپنی کمزوری کا احساس
ضرور تھا۔ پھر یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہوا کیوں۔ کوئی بھی بات نہ تھی۔ روز کی طرح
وہ دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے فقیر نے ٹوکدیا۔ بابو جی
کے نیچے اچھے رہیں۔ مگر اسکی آنکھ کس قدر گھناؤنی تھی۔ پیلی پیلی یوں ابھری ہوئی
کہ وہ گھبرا گیا۔ جھنجھلا کر بولا "ہٹ بے! صبح ہی صبح سامنے آگیا" اور پھر خود ہی
آگے بڑھکر مسکرانے لگا، لیکن جب آفس پہونچا تو اسے معلوم ہوا کہ اسکی ملازمت ختم
ہو چکی ہے۔

اب اس کے ساتھ صفدر تھا اور اس وقت کندن سہارا دے رہا تھا۔
چھریرے سے جسم کا وہ لمبا سا نوجوان جس کے چھٹ جانے کا اسے کس قدر صدمہ تھا
اور اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا حالانکہ کندن نے منع بھی کیا تھا کہ بھئی "آج
نہ جاؤ" سناٹے میں روتے ہوئے کتے کی آواز کتنی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی اور
اسے خود بھی نہ معلوم کیا خیال آ رہا تھا مگر آج نہ جاتا تو کرتا بھی کیا اور لوگ تو مان
جاتے مگر ہر بنس تو مکان خالی کرانے کے پیچھے ہی پڑا تھا۔ زیادہ کرایہ ملنے کی امید
جو تھی۔ کیا کچھ نہ کر گزرتا۔ پھر تو کہیں رہنے کا بھی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج کل مکانوں کا
قحط ہے۔ یوں ہی، پھر یہ موقع نہ جانے کب ملتا۔ اور جب وہ چلا تو اس کا دماغ
برابر سوچے جا رہا تھا اور کتا بری طرح روتا رہا۔ کیسا بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ کہتے
ہیں کہ جب چنڈول کسی درخت پر آکر بولنے لگتا ہے تو سب کچھ ویران ہو جاتا ہے اور
جب الو ہی رات کی خاموشی میں کسی اونچی منڈیر پر بیٹھکر چیختی ہے تو لوگ گھبرا کر تالیاں
بجانے لگتے ہیں لیکن بے چارہ مریض تو سہم کے رہ جاتا ہے۔ وہ موت کی نقیب
جو ٹھہری۔ اور کتے کے رونے کا انجام کیا ہوتا ہوگا۔ اس کی بیوی نے پریشان ہو کر کہا

نیا دور

جو تھا" ارے خدا کے لئے اس کمبخت کو یہاں سے بھگائیے۔ کیسی منحوس آوازیں نکال رہا ہے"
آخر ہوا بھی ایسا ہی۔ کمپارٹمنٹ خوب بھرا ہوا تھا۔ وہ اوپر کی برتھ پر بستر پھیلا کر لیٹ
گیا اور پھر رات گذرنے لگی۔ مسافروں نے اونگھنا شروع کر دیا اور میسرز ٹریوا اینڈ کو
کا نیجر تو برابر سوتا رہا اسے جانا بھی تو دور تھا۔ پھر کندن نے پلیٹ فارم کے چکر کاٹنا
شروع کر دیا اور وہ اندھیرے میں اتر کر نیچے آیا سب مزے سے سو رہے تھے کمپارٹمنٹ
کسی قدر خالی ہو چکا تھا۔ اُن سے جھک کر نیجر کی برتھ کے نیچے سے اٹیچی کی طرف ہاتھ
بڑھایا اور اسی وقت ان سے خراٹا بھرا اور وہ جھٹ سے اپنا سامان جو برابر رکھا
تھا اسے ہٹانے لگا۔ کندن نے ایکبار پھر کھڑکی کے پاس زور سے پیر پٹکا اور اُن سے
اٹیچی اٹھا کر اسکو دیدیا۔ اگر نیجر کی آنکھ بھی کھل جاتی تو بات ہی کونسی تھی" اوہ!
یہ آپ کا اٹیچی ہے ؟ معاف کیجئے گا۔ دیکھئے بالکل آپ جیسا میرا بھی ہے۔ اور وہ یہ
کہنے پر بھانپ بھی جاتا تو کرنا ہی کیا مگر وہ تو بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ اور وہ اپنی جگہ
پر جاکر لیٹ رہا۔ پھر جب اسکی آنکھ کھلی تو وہی ہنگامہ برپا تھا۔ پولس بھی آئی اور
ریلوے کے افسر بھی۔ اور ان مشکلوں کو ٹالنے میں تو اب وہ ماہر ہو گیا تھا لیکن
جب وہ واپس لوٹا تو کندن گرفتار ہو چکا تھا۔ کتنی حیرت انگیز بات تھی کہ کندن ایسا
سنجھا ہوا شخص چلتی ٹرین میں چڑھتے ہوئے پھسل کر یوں گر کر زخمی ہو گیا۔ یہ بات
معلوم کیوں وہ غور کر رہا تھا۔

صفدر کو بیٹھے بیٹھے جیسے کچھ خیال آگیا اور اُس نے چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا
اب وہ وہاں ٹھہرنے نہیں چاہتا تھا۔ جھٹ سے کھڑا ہو گیا" اچھا تو میں اب ہوٹل میں
ملونگا" لیکن مرزا نے پھر اسے ایکبار اور سمجھایا" دیکھو اتنا خیال رکھنا تم کسی کو ذرا بھی شبہ
نہ ہو کہ تم میرے ساتھ ہو۔ ہوٹل میں تو مجھے تم سے صرف ایک بات کہنا ہو گی اور پھر تم
اسٹیشنوں پر پہونچ جانا۔ صفدر نے جاتے جاتے اسے اطمینان دلایا" اچھا، اچھا"
" تم تو ابھی سے سونے کے موڈ میں معلوم ہو رہے ہو۔ کہیں اونگھ نہ جانا ورنہ
غضب ہی ہو جائیگا۔ کلیم پورنک تمہاری آنکھ بھی جھپکنا نہ پائے۔ اس کے وہی

پار اسٹیشنوں کے بعد تو "میل" سے "کراس" ہوگا۔ اور اسی سے تم کو واپس لوٹنا ہے
ن ہی اسٹیشنوں میں کام ہو جانا چاہئے۔ سمجھ گئے نا"

صفدر مسکرا کر چل دیا اور مرزا کو جیسے کچھ اطمینان ہو گیا۔ اسکی آنکھوں کی چمک کچھ اور تیز ہو گئی اور جب وہ ہوٹل پہنچا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ ترلوک باہر ہی بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا اور سامنے والی میز پر' ارے ! یہ تو فلوری تھی۔ مرزا چونک پڑا۔ امراؤ آخر اسکو یہاں کیسے لے آیا۔ اور ترلوک برابر اسکی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ امراؤ سے باتیں کرتے کرتے یوں مسکرا کر اسکی طرف دیکھتی جیسے اسکی نظریں کچھ کہہ رہی ہوں۔ امراؤ کی مونچھیں خوب چڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہنستا تو اس کا سونے کا دانت تیز روشنی میں جھلک اٹھتا۔ کس ٹھاٹھ سے کھڑا ہنس رہا تھا اور فلوری کی یہ مسکراہٹ، یہ جھکتی نظریں۔ جن سے اچھا بھلا سیانا چوک جائے اور ترلوک وہ تو بالکل اناڑی تھا۔ کیسی بے چین نظروں سے اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ واقعی اگر آج ترلوک ٹھہر جاتا تو امراؤ نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

مرزا کمرے سے نکل کر منیجر کی طرف چلا تھا کہ فیاض پائپ کا دھواں اڑاتا ہوا کچھ اسطرح سامنے آگیا کہ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کے دہلی سے یوں چلے آنے کا امکان بھی کب تھا۔ مگر فیاض نے آواز دینے سے قبل ہی منہ پر انگلی رکھدی "سٹیشن" اور اسکو ساتھ لئے ہوئے اپنے کمرہ میں آیا" کیا بتاؤں مرزا آجکل کس قدر پریشان ہوں ساری مصیبتیں بس مجھ ہی پر پھٹ پڑی ہیں۔ ادھر سالا ایک نیا ڈپٹی۔ ایس۔ پی کیا آگیا ہے۔ ناک میں دم ہے۔ تابڑ توڑ کئے چھاپے مار چکا ہے۔ جُوا بند پڑا ہے۔ کوکین بیچنے کی ہمت نہیں۔ کوڑی۔ کوڑی کو محتاج ہو گیا ہوں۔ اور ابھی مقدمہ میں روپیہ لگے جا رہا ہے۔ کچھ ایسی ہی مشکل پڑی ہے جب ہی تم کو یہاں نظر آرہا ہوں۔ ورنہ تم جانو میرا کہاں نکلنا ہوتا ہے"
" وہی پُرانا دُھرّا "

" ہاں "

کہاں کا ارادہ ہے ؟"

" ذرا کلکتہ تک جا رہا ہوں" اور پھر کان کے برابر آکر آہستہ سے کہنے لگا "بات یہ ہے کہ

وہ سیٹھ دامودر داس کا لڑکا مال خریدنے دلّی سے چلا ہے" اور اس نے جھک کر کھڑکی سے تر لوک کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ مرزا گھبرا سا گیا اور جب فیاض نے پوچھا "بھئی تم تو آجکل کہیں نظر ہی نہیں آئے۔ کندن کب تک آرہا ہے۔ ذرا وہ آجائے تو پوچھوں گا۔ آخر اُسے کہنا ہی پڑا "ارادہ تو آج رات کی گاڑی سے میرا بھی کلکتہ جانے کا تھا۔ اتنے دن کے بعد مہت ہوئی تو تم سے مڈبھیڑ ہو گئی"

"ارے!" فیاض ذرا دیر خاموش رہا۔ "لیکن میں تو اس کے ہمراہ دہلی سے آرہا ہوں"

"اونہہ، ہنہ، یہ مطلب نہیں۔ میں تو وقت کی بات کہہ رہا ہوں"

"اچھا ایسا کرلو۔ مجھے کچھ دیدو۔ جو تم مناسب سمجھو۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ مرزا تم سے میں کبھی ایسی بات نہ کہتا۔ مگر کچھ ایسا ہی پریشان ہوگیا ہوں" لیکن مرزا کے پاس دھرا ہی کیا تھا جو سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ مگر فیاض کہتا ہی رہا۔ بس پانچسو دیدو۔ خدا کی قسم کئی ہزار کا ہاتھ ہے۔ میں یہی سوچتا ہوں کہ کیا کروں گا کلکتہ جاکر، وارنٹ بھی نکلا ہوا ہے" مرزا چونک پڑا "اچھا دیکھو کچھ انتظام کرتا ہوں" اور وہ باہر چلا آیا۔ منیجر کا کمرہ خالی تھا اُس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالکر "ریسیور" اٹھایا "پولیس اسٹیشن" اور اِدھر اس کے شانے پر فیاض نے آکر ہاتھ رکھدیا۔

"میرے راستہ میں آرہے ہو مرزا" اور مرزا نے گھوم کر اسکی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی تاریکی چھائی ہوئی تھی جب اُسنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا تھا "ہاں مرزا۔ میں نے ہی اس کو ٹھکانے لگایا۔" اسوقت تو اسے بھی فیاض سے ڈر لگ رہا تھا، اسے وہ بھیانک آنکھیں یاد آنے لگیں۔ خالی ڈائننگ روم اور وہ خون میں ڈوبا ہوا۔ زخمی جسم۔ مرزا نے آہستہ سے رسیور اٹھا کر رکھدیا۔ اور فیاض اسے باہر لے آیا "مرزا مجھے جانتے ہوئے بھی چوٹ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ مجھے صرف کندن کا خیال ہے اس نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں۔" مرزا نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور فیاض برابر اس کو ڈانٹتا اس سے کہتا ہی گیا۔ صفدر سے باتیں کرلینا دوسری بات ہے۔ مگر فیاض کے سامنے آنا یہ بہت مشکل تھا۔

دوسری منزل کے بتائے ہوئے کمرہ میں اس کو صفدر بھی مل گیا۔ مگر اس کے ساتھ ایک کیپٹن بھی بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ مرزا نے کچھ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور جب صفدر نے کیپٹن سے ملایا۔ کیپٹن صاحب یہی میرے دوست مرزا ہیں" تو وہ کچھ جھنجھلا کے رہ گیا۔ لیکن صفدر کہتا ہی رہا۔ اور کیپٹن صاحب کے ساتھ میں دو برس تک رہا ہوں"۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ مگر مرزا زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکا۔ اسے یہ سب کچھ ایک بوجھ سا معلوم ہو رہا تھا۔ کہنے لگا گیارہ بج چکے ہیں۔ اب چلونگا، صفدر ہنسنے لگا" بھئی ذرا بیٹھو تو" اور اسنے بتا دیا کہ کیپٹن صاحب نے اسکی ملازمت کے لئے انتظام کرنے کا وعدہ کیا ہے اور کیپٹن کہنے لگا۔

"یہ تو خود تمھاری غلطی ہے کہ تم نے ابتک مجھ کو کوئی اطلاع ہی نہیں دی تم کو تو کہیں نہ کہیں کام مل ہی جانا چاہئے۔

"اور کیپٹن صاحب کچھ ہمارے مرزا صاحب کے لئے بھی بندوبست کیجئے۔ مدت سے بے کار ہیں۔ آفس کا کام خوب جانتے ہیں بڑا تجربہ ہے"۔

کیپٹن نے اسکی طرف دیکھا" اچھی بات ہے کوشش کرونگا" مگر مرزا نے غور کیا کہ کیپٹن کی نظریں اُسے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اسے کسی شاہراہ پہ گالیاں دی جارہی ہوں۔ اس سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر نے روکا بھی مگر اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کیپٹن اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ خود فریبی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ باہر آیا۔ موڑ پہ اندھیرے میں ایک بیرے سے ٹکر ہو گئی۔ چینی کی ایک پلیٹ چھناکے سے فرش پر گر کر بکھر گئی اور وہ اپنے کوٹ کو اس طرح جھاڑنے لگا جیسے اس پر کچھ گر گیا ہو" ابے! اندھا ہو کے چلتا ہے"۔ مگر جب وہ باہر نکل رہا تھا تو اُس نے سنا وہ بیرا دوسرے بیرے سے کہہ رہا تھا" سالے، پی کر آپے میں تھوڑے رہتے ہیں۔ ابکی یوں ہی چار گلاس میرے نام پڑے ہیں۔ یہ اور چپت لگی۔ کیا سالی تنخواہ ملے۔ نیجر سالا اپنے باپ کو بھی چھوڑنے کا نہیں۔ ہٹ تیری تقدیر کی اور مرزا جھنجھلانے کے بجائے صرف مسکرا دیا۔

ریاض شمیم

"اردلی"

تیرے دِل کو یہ بھی وجہِ انبساط
کس قدر ارزاں ہے تو
کس قدر مخلص ہے تیرا جذبۂ محکومیت
اک سجیلے سے فرنگی چھوکرے کے سامنے
بے طرح لرزاں ہے تو

یہ تری چکنی سی ٹوپی، یہ ترے نورانی بال
معتبر سے خد و خال!
یہ تری کالی سی پیشانی پہ ٹھوکر کا جلال
تیری آنکھیں ہیں کسی دیوار کے روزن کہ جو
کائی کی افراط سے سرسبز ہو، خستہ سی ہو، بے رنگ ہو
جن کی پراسرار ظلمت کے گھناؤنے سائے میں
پل رہا ہو انکسار،
یہ بغاوت کا سسکتا سا خیال
تیرے جبڑے کے کرخت و سخت کونوں کی گھسی بے چارگی
تجھ کو آزادی سے جینے کا کوئی سودا نہیں

میرے پیارے اردلی!
خوش نصیبی کی تری کیا بات ہے!

کنہیا لال کپور

کلکتے کا ذکر

لاہور سے کلکتہ کا سفر درپیش ہو تو دو ہی طریقے ہیں۔ مقدور ہو تو ہوائی جہاز میں سفر کیجئے۔ ناشتہ لاہور اور شام کا کھانا کلکتہ میں کھائیے اور مقدور نہ ہو تو تھوڑا سا کلوروفارم جیب میں رکھ کر سکینڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ جائیے، جونہی گاڑی روانہ ہو اللہ کا نام لے کر کلوروفارم سونگھنا شروع کر دیجئے۔ جب آپ کو ہوش آئے گا، تو آپ اپنے آپ کو لکھنؤ کے سٹیشن پر پائیں گے، ایک بار کلوروفارم پھر سونگھئے، اور ہوش آنے تک بردوان پہونچ جائیے۔ بردوان سے ہوڑہ نزدیک ہے، اس لئے کلوروفارم کو احتیاط سے بیگ میں رکھ لیجئے، کہ واپسی کے وقت کام آئے۔ اگر آپ اس طریقہ پر عمل نہیں کریں گے تو صبر اور انتظار کرتے کرتے چاہے آپ ختم ہو جائیں، سفر ختم نہیں ہوگا۔ آپ لاکھ جتن کریں ہم سفروں سے گپیں ہانکیں، رسائل کی ورق گردانی کریں، کلکتہ میل کو گالیاں دیں، جمائیاں لیں، لاحول پڑھیں، لیکن منزل قریب آتی نظر نہیں آئے گی۔

کلکتہ کی ہر چیز نرالی ہے، اس کو ہی لیجئے کہ کلکتہ نام کوئی ریلوے سٹیشن نہیں حالانکہ کلکتہ شہر میں درجنوں مقامی اسٹیشن ہیں۔ کلکتہ کی گھڑیاں باقی شہروں کی گھڑیوں سے ایک گھنٹہ آگے رہتی ہیں (اس بوالعجبی کو کلکتہ ٹائم کہتے ہیں) کلکتہ میں لوگ بیڈمنٹن بجلی کی روشنی میں کھیلتے ہیں۔ ہوٹلوں میں پانی بوتلوں میں پیش کیا جاتا ہے، کلکتہ میں ہندستانی فلمیں بنتی ہیں، جنہیں عموماً وہ لوگ ڈائرکٹ کرتے ہیں، جو ہندوستانی نہیں جانتے۔ کلکتہ میں "سین" "شین" ہو جاتا ہے، تانگہ گھوڑا گاڑی میں، اور شلوار ساڑھی میں تبدیل ہو جاتی ہے، ویسے تو کلکتہ میں ہر صوبہ اور ہر قماش کا انسان دیکھنے میں آتا ہے، لیکن سب سے دلچسپ آدمی کلکتہ کے اصلی باشندے ہیں، سانولے سلونے، مہین، تحمل کی حد تک کفایت شعار، سادگی اور بھولاہٹ کے پتلے، بنگاہِ اولیں میں بنگالی لوگ بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان سے گفتگو کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہر بنگالی وہ نہیں جو وہ نظر

آتا ہے۔ دراصل ہر بنگالی کی بات میں ایک نکتہ ہوتا ہے، جسے صرف ایک دوسرا بنگالی ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے اس نکتہ کو پا بھی لیں تو بنگالی بابو جھٹ پانترا بدل کر ایک اور نکتہ پیدا کر دیتا ہے، اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا ہے جب تک آپ چکرا کر اپنی ہار مان نہیں لیتے۔ بنگالی بابو دو طرح سے اپنے حریف کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا تین تا کر یا بالکل خاموش رہ کر، اگر وہ نوجوان ہے تو بڑھ بڑھ کر باتیں کرے گا۔ اگر ادھیڑ عمر کا ہے تو فلسفیوں کے انداز میں گھٹنوں مراقبہ میں بیٹھا نظر آئے گا۔ بیشتر بنگالی چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد مسکرانا اور ہنسنا ترک کر دیتے ہیں، اور اونگھنا یا بڑبڑانا شروع کرتے ہیں، خدو خال کے اعتبار سے بنگالی لوگ دو قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں، بنگالی جن کا چہرہ فٹ بال یا رشگلا سے ملتا ہے، اور بنگالی جن کا چہرہ بوتل یا بیلن سے مشابہت رکھتا ہے، اول الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پھولے ہوئے اور موخر الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پچکے ہوئے ہوتے ہیں، کلکتہ میں حسن ملیح کی فراوانی ہے، اس شہر میں حسن صبیح کی تلاش کرنا صحرا میں سبزہ زار کی جستجو کرنے کے مترادف ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈھیں تو "رخ روشن" تو کیا بجھی ہوئی شمع بھی کہیں نظر نہیں آتی، "بالی عمریا" "پتلی کمریا" اور "سانوری صورتیا" قدم قدم پر ملتی ہے، لیکن وہ قندیلیں جن کی تجلی کے سامنے عشق کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، کلکتہ کے حصہ میں نہیں آئیں،

کلکتہ میں زندگی صرف چار محوروں کے گرد گھومتی ہے، روپیہ، بوتل، گھوڑا، لڑکی، یہاں ہر شخص روپیہ کمانے کے لئے آتا ہے، سوائے پنجابیوں کے جن کا شغل ہر ملک اور ہر شہر میں روپیہ خرچ کرنا ہے، کروڑپتی مارواڑی سیٹھ سے لیکر بنگالی رکشا کھینچنے والے تک ہر ایک شخص کی نگاہ کسی کی جیب پر ہے، روپیہ کمانے کی دھن میں لوگ اس برق رفتاری سے ادھر سے ادھر بھاگتے ہیں، کہ انسان انہیں دیکھ کر بد حواس ہو جاتا ہے، یہاں کسی شخص کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ تاجروں اور سوداگروں سے لدی ہوئی کاریں، ٹرکیں، ٹیکسیاں، کلکتہ کی سڑکوں پر جب زناٹے بھرتی چنگھاڑتی ہیں تو ایک نوارد کو یہ شک گزرتا ہے کہ وہ کلکتہ نہیں بلکہ لندن یا نیو یارک کے مضافات میں آ پہونچا ہے۔ ٹریفک کا یہ

حال ہے کہ سڑک کو پار کرنے کے لئے کئی دفعہ پورے تیس منٹ انتظار کرنا پڑتا ہے، آپ بہت مشکل سے ایک یا دو گز آگے بڑھتے ہیں، دائیں طرف سے پچاس موٹریں، اور بائیں طرف سے اتنی ہی ٹرامیں آپ کو للکار کر کہتی ہیں "خبردار" اگر کوئی شخص موٹر کے نیچے آکر خودکشی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لئے کلکتہ کی سڑکیں نہایت موزوں ہیں،

"بیوپار میں روپیہ کماؤ، ریس میں گھوڑوں پر داؤ لگاؤ، ہوٹلوں میں شراب پیو اور اگر کسی طرح دل نہ بہلے تو کسی سے آنکھیں لڑاؤ" کلکتہ میں امیر طبقہ کے یہی مشاغل ہیں کلکتہ تجارت کا مرکز ہے، دیگر اجناس کی طرح یہاں حسن کی تجارت بھی اگر دن دونی نہیں تو یقیناً رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس جنس کے دلال عموماً ہوٹلوں اور سینما گھروں کے گرد و نواح میں دیکھے جاتے ہیں۔ گرگ مسکین، منکسر المزاج، مفلوک الحال، یہ لوگ جو اکثر میرٹھ بلند شہر اور لکھنؤ سے کلکتہ میں آتے ہیں، بڑے کام کے آدمی ہیں، شریف الطبع اتنے کہ ہر راہرو سے پوچھ لیتے ہیں "صاحب، چاہئے"؟ اگر آپ انہیں دھتکاریں تو برا ماننے کی بجائے شاعری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

"برس تیرہ کا یا چودہ کا سِن"

"ستم کی چال۔ ستم کی ادا۔ ستم کی نگاہ"

"ابھی نتھ بھی نہیں اتری صاحب"

کلکتہ میں ایک مشہور مثل ہے، کہ اگر آپ نے کلکتہ کی ریس نہیں دیکھی تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کلکتہ کی ریس واقعی عجیب تماشا ہے۔ دیوانوں کا سب سے بڑا ہجوم دیکھنا مطلوب ہو تو کلکتہ کی ریس ضرور دیکھئے۔ اتنا بڑا ہجوم بڑے بڑے سیاسی جلسوں یا جلوس میں بھی آپ کو نظر نہیں آئے گا، اس ہجوم کو کہ جو تمام صوبوں کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے، دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ نہیں بلکہ اسی کروڑ ہے، ہر ایک شخص کے ہاتھ میں ریس کی کتاب ہے، جس کا وہ اس انہماک سے مطالعہ کر رہا ہے، جیسے وہ نہایت دلچسپ ناول ہو، ایک دوسرے سے ٹپ (Tip) لئے جا رہے ہیں، قیاس کے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ اپنے اپنے گھوڑے کی شان میں قصیدے کہے جا رہے ہیں، یک لخت گھنٹی بجتی ہے، جوں ہی

گھوڑے نزدیک آتے جاتے ہیں، تماش بین گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک آواز بلند پکار رہا ہے "بھائی صاحب، بھائی صاحب" دوسرا زور زور سے چیخ رہا ہے "بھابی جان بھابی جان" یہ نعرے سن کر ایک لمحہ یہی سمجھتا ہے، کہ بھائی صاحب بھابی جان کی معیت میں ریس کورس میں تشریف لا رہے ہیں، لیکن اسے بعد کو پتہ چلتا ہے کہ "بھائی صاحب" اور "بھابی جان" تو گھوڑوں کے نام ہیں، جس وقت فاصلہ دو ایک فرلانگ رہ جاتا ہے اس وقت ہجوم کی حالت دیدنی ہوتی ہے جو بیٹھے ہوئے ہیں کھڑے ہو جاتے ہیں، جو کھڑے ہیں، ناچنا شروع کر دیتے ہیں، جو ناچ رہے ہیں وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگتے ہیں،

کلکتہ کی ریس کے بعد کلکتہ میں دوسری قابل دید چیز فلمی سٹوڈیوز ہیں، یہ تقریباً سب کے سب ٹالی گنج میں واقع ہیں، ٹالی گنج ہوڑہ سٹیشن سے کافی دور اور قبرستان کے کافی نزدیک ہے، چونکہ فلمیں بنانے والے شور و شغب اور تنقید و تبصرہ سے گھبراتے ہیں اس لئے انہوں نے سٹوڈیوز قبرستان کی بغل میں بنائے ہیں، ہر ایک سٹوڈیو کا ایک "دربان" ہوتا ہے، جو اردو شاعری کے روایتی دربان کی طرح بے حد مغرور اور بد دماغ ہوتا ہے، جب تک آپ دس بارہ دفعہ کورنش بجا نہ لائیں آپ کو سٹوڈیوز کی حدود میں داخل ہونے نہیں دیگا، فلمی سٹوڈیو چھوٹے پیمانے پر عجائب گھر ہوتا ہے، زیادہ صحیح الفاظ میں عجائب گھر اور چڑیا گھر کا مرکب ہوتا ہے، یہاں ہر ایک شے اور ہر ایک شخص عجوبۂ روزگار ہے، کلکتہ کے سٹوڈیوز میں عموماً ہر ایک شخص پر کسی دوسرے شخص کا دھوکا ہوتا ہے، مثلاً جب آپ مسخرا سمجھ رہے ہیں، وہ مسخرا نہیں ڈائرکٹر ہے، جسے آپ پنواڑی سمجھتے ہیں، وہ پنواڑی نہیں سیٹھ صاحب ہیں، جسے آپ نے بزرگ سمجھ کر سلام کیا ہے، وہ بزرگ نہیں بلکہ چھوکرا ہے جس نے مصنوعی ڈاڑھی لگا رکھی ہے، جسے آپ نے ایکسٹرا لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہی دراصل ہیروئن ہے جن سرمگیں پلکوں کی آپ تعریف کر رہے ہیں، وہ دراصل سرمگیں پلکیں نہیں بلکہ نہایت معمولی پلکیں ہیں، جن پر ایک خاص مصالحہ لگا یا گیا ہے، جس زلف دراز کی طرف آپ غور سے دیکھ رہے ہیں وہ دراصل ملنگے کی زلف ہے، بعض اوقات سٹوڈیو

میں ہیرو ڈائرکٹر اور پروڈیوسر میں تمیز کرنا نہایت مشکل ہوجاتا ہے، عام طور پر جو شخص سب
سے زیادہ شور مچاتے وہ ڈائرکٹر جو اکثر لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا مسکراتا ہو وہ ہیرو
اور جو ہیروئن کے ارد گرد منڈلا رہا ہو وہ پروڈیوسر ہوتا ہے، ہر سٹوڈیو کی طرح کلکتہ کے سٹوڈیو
میں تین اصطلاحیں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً "ہٹ سانگ" (HIT SONG)
"ہٹ سانگ" وہ گانا ہوتا ہے جسے فلم دیکھنے کے بعد کوچوان، ٹیکسی ڈرائیور اور اس تماش کے
لوگ گاتے ہیں "فلاپ" اس فلم کو کہتے ہیں جس کی ناکامیابی کی خبر سن کر پروڈیوسر کے
قلب کی حرکت بند ہوجاتی ہے "مکھن لگانا" یعنی حد سے زیادہ چاپلوسی کرنا کلکتہ کے سٹوڈیو
میں اکثر مکالمہ نویس ڈائرکٹر کو مکھن لگاتا ہے، ڈائرکٹر پروڈیوسر کو، پروڈیوسر ہیروئن کو،
اور ہیروئن کسی کو مکھن نہیں لگاتی۔

کلکتہ میں جن چیزوں کے لئے جی ترستا ہے، وہ ہیں، کڑاکے کی سردی' ——
پکی ہوئی گندم کے سنہرے کھیت، بیلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی لٹھے کی شلواریں، بھرے
بھرے جسم والی عورتیں، وزنی پنجابی گالیاں، کیکر اور جنڈ کے ذلیل درخت، اور کلکتہ سے
واپس ہوکر جن چیزوں کی یاد مدت تک دماغ کے تہ خانوں میں سلگتی رہتی ہے وہ ہیں نیم میں
گاتی ہوئی کوئلیں، تالابوں پر لہراتے ہوئے ناریل کے سائے، چاندی کی طرح دمکتا ہوا
ہوڑہ کا پل، قطب مینار کا مذاق اڑاتی ہوئی سربفلک عمارتیں، نرگس کو شرماتی ہوئی خوبصورت
بنگالی آنکھیں، گھٹی گھٹی فضا، دبی دبی سسکیاں، اور ہگلی کا غلیظ پانی۔
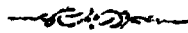
غلام یعقوب انور

المناک صورت حال اور المیہ

آج کل یہ سوال رہ رہ کر اٹھتا ہے کہ کیا زمانہ ایک نازک المناک دور زندگی نہیں ہے، اور اگر ایسا ہے تو پھر زمانے کے دکھ درد اور زندگی کی بیتا فنون لطیفہ کے المیہ شاہ کاروں میں کیوں ڈھل نہیں جاتی۔؟
سب سے پہلے المیہ عناصر کی صحیح پہچان ضروری ہے، ٹریجڈی محض دکھ جھیلنے اور کڑی اٹھانے کا نام نہیں، بلکہ یہ تو زندگی پر ایک بھروسہ رکھنا ہے، اس عقیدہ پر قائم رہنا کہ انسان جن اصولوں اور قیمتوں کے لئے جی رہا ہے وہ اصول اور قیمتیں موت اور بربادی سے بالاتر ہیں۔ ایک المیہ صورت حال میں اچھے اور برے اصولوں کی ٹکر ہوتی ہے، جو اصول مٹایا جاتا ہے وہ اپنی بربادی کے سبب زندگی کے ڈرامہ سے علیحدہ ہو کر کچھ عجیب لطافت حاصل کرتا ہوا دوبارہ تماشائی کے ذہن میں زندہ ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ فلاں دور میں المیہ بطور ایک فنی اسلوب کے تھا، یا نہیں۔ محض اس دور کے فن کاروں کا جائزہ لینا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں تو اس زمانہ کا تانا بانا بھی جانچنا پڑتا ہے یہ تانا بانا جو فنون لطیفہ کے تماشائیوں نے بنا جاتا ہے۔ شاعر اور فن کار اپنے زمانہ میں پیدا ہونے والی زندگی کی گہری کشمکش کے ترجمان ہوتے ہیں، اور ان اصولوں کی عکاسی کرتے ہیں جو اس دور کی سماجی زندگی کی تہوں کے نیچے پرورش پاتے ہیں۔

المیہ آرٹ کے لئے المناک صورت حال کی ضرورت ہے اور یہ المناک صورت حال (اگر وہ پرانی داستانوں سے مستعار نہ لی جائے) فن کار کے ہم عصروں کے عقائد اور ان کے ذہن میں پرورش پانے والی روحانی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے، یہی ہم عصر جو اس فن کار کے تماشائی ہیں المیہ صورت حال فن کار کی من گھڑت داستان نہیں ہے، یہ تو خود زندگی کا ایک ایک ضروری جزو ہے یہ بات الگ ہے کہ کوئی زبردست موجد دماغ ہی اسے بنی نوع انسان کی پوشیدہ روحانی گہرائیوں سے نکال کر کاغذ پر پیش کر سکتا ہے۔

بلند المیہ شاہکار کیا ہیں، کسی تہذیب کے عقائد کی ڈرامائی شرحیں ہیں، جن میں ہمیں

کی ماہیت کے متعلق عام لوگوں کے تصورات بھی بدلتے چلے گئے ہیں، کلاسیکی یونان، ایلزبتھی انگلستان اور لوئی چہاردہم کا فرانس۔ ان وقتوں کے شاعر اپنے المیہ شاہکاروں میں انسان کی مخصوص صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ صورت حال جسے اس وقت کے تماشائی دست جان کر اپنی زندگی کے تصور سے موافق پاتے ہیں،

یونانی بہادر اتفاقاً یا اپنی دیدہ دلیری سے دیوتاؤں کی ناراضگی کرتا اور اپنے آپ پر مصیبتوں کو بلاتا، یونانی تماشائی خوب جانتے تھے کہ اب آسمانی بلائیں نازل ہو کر اس پر دہ گشت دخون کو تباہ کریں گی، کسی ظالم کے نہیں نہس ہو جانے کی داستان کو صحیح ماننے کے لئے انسانی اقتدار سے دو چار ہو جانے والی تقدیر پر ایمان لانا ضروری تھا، اس ایمان کے بغیر دیوتاؤں کا انتقام "آرزو مند سوچ بچار" سے زیادہ وقعت نہ رکھتا۔

آج کل کے تماشائیوں کے لئے شکسپیر کا مشہور ڈرامہ میکبتھ (MAC BETH) ایک ایسی ہی "آرزو مند سوچ بچار" کی حیثیت رکھتا ہے، لوگ تقدیر کے ہاتھوں کسی جدید ظالم کی (جو جدید سائنس سے مسلح ہو) اٹل رسوائی کی واردات سے کہیں زیادہ جدید سائنس کی کارگزاریں سے مرعوب ہوتے ہیں، پھر آج کل کے میکبتھ کو پراپیگنڈہ وزارت اور گسٹاپو کی مدد بھی میسر ہو گی، ہر ظالم جنگل کے داؤ پیچ اس کے لئے کوئی نئی چیز نہ ہوں گے، کیونکہ وہ بھیس بدلنے اور چھپنے کے حکمتی طریقوں کو آگے ہی جانتا ہو گا، وہ زندگی کے متعلق ایک سائنس دان کا سا انداز نظر رکھے گا اور قدیم میکبتھ کے برعکس تو ہماتی خوف و خطرے بلند ہو گا، یہی وہ مقام ہے، جہاں ایک فن کار کی تعمیری قوتیں بروئے کار آتی ہیں، اور ایسے تعمیمی اصولوں کے جدید بدل تلاش کرتی ہیں، جو ماضی اور حال دونوں ایام کی انسانی صورت حال پر منطبق ہو سکیں، یہی حقیقی شاعر کا کام ہے، نقلی شاعر پرانی صورت حال کو پیش کرتا چلا جاتا ہے، اور یہ نہیں سوچتا کہ اب واردات حقیقت سے لگا نہیں کھاتی اور نہ ہی زندگی کا عکس پیش کرتی ہے، پرانے معاملات صرف پرانے ماحول میں ہی کار دپ دھار سکتے ہیں، چنانچہ آپ کسی قدیم ناٹک کو دیکھتے وقت غیر شعوری طور پر قدیم ذہنی ماحول میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ماحول جو الفاظ اور فضا سے ابھر کر تصور کو کسی دوسرے دور کے ذہنی عقائد میں زندہ کر دیتا ہے،

المیہ آرٹ کا شدید ترین مخالف زندگی کا وہ جدید انداز نظر ہے جسے مادیت کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ فاشی ہو خواہ اشتراکی یا آزاد خیال جمہوریت پسند یا امریکی کیتھلک فلسفہ دان اتامنو (UNAMUNO) کی تصنیف "زندگی کا المیہ زاویہ" (THE TRAGIC VIEW OF LIFE) میں بھی ثابت ہے، جہاں وہ مذہب کی غیر معقولیت پر زور دیتا ہے، اور عقلی استدلال کو نظر انداز کرتا ہوا کیتھلک سائنس کو سائنس کے موافق قرار دیتا ہے۔ اشتراکی جو کھلے مادہ پرست ہیں، وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں، ایڈورڈ اپورڈ (EDWARD UPWARD) نے ایک مقالہ میں جسے انہوں نے "ادب کی مارکسی تشریح" (A MARXIST INTERPRETATION OF LITERATURE) کا نام دیا ہے، یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ آئندہ اشتراکی حکومت میں ٹریجڈی یعنی انسانی شکست کا تصور ادب کی موثر اور سنجیدہ ترین شکل نہ کہلا سکے گی، قابل غور امر یہ ہے کہ صرف ایک کٹر مادہ پرست انسان ہی ٹریجڈی کو انسانی شکست کا تصور سمجھ سکتا ہے، ایسے ذہن کے لئے جو زندگی کو "زندہ رہنے کی کوشش" اور سماجی نفع" کی غلش سے بالا تر چیز سمجھتا ہے، ٹریجڈی انسانی روح کی فتح کا ایک ایسا نظارہ ہے جو مادی شکست کے احاطہ میں کچھوتا چلتا ہے،

لیکن مادہ پرستی کو مادی ہار جیت کے علاوہ اور کسی سے کیا مطلب، ایسی شکست جس میں آئندہ کامگاری کا کوئی امکان نہ رہ جاتے کا ل، غیر تسلی پذیر اور لعنت بات ہے، اس کے برعکس جہاں رد عمل کی قوتوں کو ہرایا جا چکا ہو جہاں قدرت اور سرمایہ داروں سے حاصل کردہ مال بنیا کی تقسیم کے مسئلے سلجھ گئے ہوں وہاں انسانیت ایک ایسے دور میں داخل ہوتی ہے جہاں شکست، ناکامیابی اور مصیبت کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا، مسٹر اپورڈ کا خیال ہے کہ اشتراکیت آرٹ کی بہترین روحانی صنف یعنی ٹریجڈی سے منہ موڑ کر پریوں کی داستان کو اعلیٰ اور رسائنسر دانی درجہ پر لے جائے گی، اور اس پردہ میں خطرہ اور مصیبت پر انسانی فتوحات کے جشن منائے گی یہ بات بھی قابل غور ہے، پریوں کی داستانیں جادو ٹونہ کے اعتقاد پر قائم ہیں، ٹریجڈی مردود ٹھہرے یا مرغوب ہے، یہ ضروری ہے کہ جادو ٹونہ کی وارداتوں سے وابستہ ادب ہمیں آگے لے جانے کی بجائے، ایک قدم اور پیچھے لے جائے، مسٹر اپورڈ کمال ستم ظریفی سے فتوہ لگاتے ہیں کہ سائنس کی قوت پر یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ مادی احول کو بدل کر روحانی کشمکش میٹ دے گی، بالکل ایسے

ہی ہے، جیسے آپ کسی جادو کی چھڑی یا اڑن کھٹولے پر اعتقاد رکھیں۔

اعتراض ہوتا ہے کہ کیا جماعتوں کی کشمکش مثل ہسپانی جمہوریت کی شکست المیہ داستانوں کا موزوں ترین موضوع نہیں ہے، ادبی طور پر ایسی واردات بھی ٹریجڈی کہلا سکتی ہے، اگر آپ اس شکست کو قطعی مان لیں اور یقین کر لیں کہ یہ کسی آئندہ ہسپانوی جمہوریت کی فتح نہیں بلکہ یہ تو شکست کھا جانے والوں کی روحانی جیت ہے، ٹریجڈی شکست کو سینے سے لگاتی ہے، تماشائیوں کی نگاہوں کو کسی آئندہ جمہوریت کی فتوحات پر لگا دینا ڈرامہ کو پراپیگنڈہ بنا دیتا ہے، ایک ایسا پراپیگنڈہ جو تماشائیوں کو ترغیب دیتا ہے کہ ٹریجڈی کو الٹ دیں، اور زندگی کی اسٹیج پر اسے ایک مادی فتح میں تبدیل کر دکھائیں،

اشتراکی مادیت سماج کی اس مادہ پرستی کی پیداوار اور ردعمل ہے، جسے خود اشتراکی الٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں، انامنو (UNAMUNO) جدید سماج کی ہر قسم کی مادیت کی مخالفت کرنے میں یہ امر تسلیم کرتا معلوم ہوتا ہے، اشتراکی اور ان کے مخالف مادہ پرستوں کی جمالیاتی توجہات میں یہ فرق ہے کہ مسٹر ایورڈ جیسے مصنف ادبی مقامات کے سمجھنے میں ایمان داری اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور ان کے مخالف ادیب ابہام اور غیر دیانت داری شعار کرتے ہیں، اس سے یہ بات ثابت نہیں کہ اشتراکی طور طریقے استعمال میں زیادہ حقیقت پرستی پر مبنی نکلیں، یہ بات البتہ ہے کہ اشتراکی جو کچھ کرتے ہیں اس اس کے متعلق بنیادی معلومات مکمل رکھتے ہیں، اشتراکی مادہ پرستی یوں بھی حقیقت پسند ہو سکتی ہے، وہ دہریت سے وابستہ اور خیر و شر سے مزدور بیگانہ ہے، تاہم یہ حسن اتفاق ہے کہ اسے "سماجی الفاف" جیسا شاندار موضوع حاصل ہے، اس کے مخالف دہریت میں اشتراکیوں سے کم نہیں لیکن وہ "سماجی بے انصافی" کی حمایت کرنے کے سبب زیادہ راستبازی شعار نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ مابعد الطبیعاتی دلائل گھڑ سکتے ہیں، انہی دلیلوں نے ان کے نصب العین کو الجھاوے میں ڈال رکھا ہے تو بھی باتیں ان کے متنفر مخالفوں پر روحانی تسکین کے دروازے کھولتی معلوم ہوتی ہیں،

صورت حال کچھ انوکھی سی ہو جاتی ہے، ایڈورڈ اپورڈ جیسے نقاد جو سماجی انصاف کے علمبردار ہیں، اپنے آپ کو مادہ پرست کہتے ہیں اور وہ مادہ پرست ہیں بھی، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ایک غیر منصف سماجی طور طریقے کے حامی ہیں اور ایک ایسے سماج میں رہتے ہیں جہاں محدود اقلیت

مرہ

کی مادی آسائش کو ہر امر پر تقدیم حاصل ہے، یہ لوگ بھی انصاف اور دیگر بلند صفات کے متعلق شور و غوغا مچاتے ہیں، دو نو فریق انسانی انصاف کی ایک ہی عدالت کے سامنے اپنا اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے دونوں فریق سماج کے مادی مقاصد کی روشنی میں کام کرتے ہیں اور مادی ہار جیت کے سوا اور کسی بات پر ایمان نہیں رکھتے دنیا کے عام تماشائیوں کی نگاہ دولت اور اقتدار کے ان طالبوں کے مادی مقاصد پر پڑتی ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ یہ لوگ ہر واقعہ کو مادی ہار جیت کے کانٹوں پر تولتے ہیں۔ یہ بھی عیاں ہے کہ ان لوگوں کا مطمع نظر دنیا کو ایک ایسی "خوفناک حکومت" سے دوچار کرنا ہے جس کے فیصلوں پر کوئی چوں و چرانہ کر سکے، ان حالات میں دنیا والوں کی نظر بس قدرتی طور پر کبھی اس جماعت اور کبھی اس جماعت کے اقتدار حاصل کرنے سے آگے نہیں بڑھ سکتیں اور وہ کسی اخلاقی نظام پر سوچ بچار کرنے سے قاصر ہیں۔ آج کل بے تحفظ مادی شکست پر روحانی فتوحات کا تصور قائم کرنا ناممکن ہے۔ جدید تواریخ کے ہزیمت خوردہ افراد کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ایڈر ریا کے باشندے ہوں جن کا ارل نوم نے وہ صفایا کر دیا تھا کہ انہیں چنقدروں، کچھ پڑھے نہ جانے والے کتبوں اور گمنامی کی شہرت کے سوا اور کچھ بھی نصیب نہ ہو سکا

یہ بات ہمارے گرد و پیش افراد، جماعتوں اور قوموں کو زندگی میں روحانی کامگاری حاصل ہوتی رہتی ہے کسی لال بجھکڑ کی سی غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے، اور ہماری زندگی کے انداز نظر سے یقینی طور پر لاتعلق ہے، لیکن شاید یہی غیر معمولی بات زندگی سے زیادہ قریب ہو، سرمایہ داروں کے مقاصد سے نزدیک تر اور اشتراکی مطمع نظر سے بھی زیادہ قریب،

یہ بھی ممکن تھا کہ اگر آج ہماری زندگی سے "حادثہ" کا وجود اڑ جاتا تو آج کی زندگی کا المیہ انداز نظر ایک بھولی بسری داستان بن جاتا، زندگی کے یہ حادثات عقل اور سائنس کی تمام فتوحات کا منہ چڑاتے ہیں یہ امر کچھ کم تسکین دہ نہیں ہے کہ ہم ان حادثوں کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے والی عضویات کی بجائے صرف الم ناک کہہ سکتے ہیں۔

تسکین کا یہ پہلو ایک خطرناک ترغیب کے امکانات بھی لئے ہوئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادی سماج جو دنیاوی شکست کے اندر روحانی قیمتوں کی فتح پر تو یقین نہیں رکھتا لیکن پھر بھی ٹریجڈی میں عمر ایسی تسکین کا طالب ہو جس میں روحانی کامگاری کا خفتہ پہلو کہ ٹریجڈی ایک کامگاری ہے، خوفناک

حوادث پر روح کی کامگاری،

اس روحانی کامگاری کے بغیر ٹریجیڈی دکھ درد، شکست اور مایوسی کی تکرار ہے، خوفناک قتل و غارت کی آرزو۔ تشدد کی خواہش اور زندگی کو تاریکی اور دہشت میں ختم کرنے کا نام، ای، ایم فارسٹر زندگی کے اس پرآشوب انداز نظر کا ذکر اپنے پمفلٹ "نارڈک دھندلکا" Nordic Twilight میں کرتے ہیں، جرمنی تاریخ کا کینڈا زیادہ تر دیگنیری دیومالا۔۔۔ بتایا گیا ہے۔ اس خصامین یوتا دکی فتوحات کے عین بعد دھندلکوں اور بربادیوں کی یورش ہے۔ مسٹر فارسٹر کے نزدیک زندگی کا یہ المناک انداز خطرے سے خالی نہیں اس سے آفتوں کی فضا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

دیگنر کی غنائی تمثیل المناک نہیں ہے بلکہ وہ تو پرآشوب ہے، پھر بھی مسٹر فارسٹر کے خیالات اس بحث کے لئے کافی کارآمد ہیں۔ کیونکہ ان سے ثابت ہے کہ ہم غیر تحلیل شدہ مادی مسائل کے روبرو شکستہ قبولنے کا المناک انداز نظر اپنا نہیں سکتے۔ اپنے جدید ترین حالات میں روحانی فتوحات پر کامل اعتقاد رکھتے ہوئے بھی ہم شکست کا تصور برداشت نہیں کر سکتے، اس سے اور مطلب بھی نکلتا ہے، المناک ادب کے بہترین دور انسانی تواریخ میں کامگاریوں کے وقت گزرے ہیں مثل کلاسیکی یونان، نشاۃ الثانیہ ملکہ الزبتھ کا انگلستان، شاہ لوئی چہارم کا عہد حکومت۔ شاید مسٹر ایورڈ غلطی پر ہوں۔ شاید انسان فتوحات کے وقت ہی عجز و انکساری حاصل کرنے کے لئے شکست اور ناکامیابی کے متعلق سوچتا ہے اور شدید مادی مشکلات کے وقت اسے پیش آنے والی آفتوں کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

بہرحال یہ شکست ہی ہے، جو ٹریجیڈی کے لئے مواد بہم پہونچاتی ہے یہ اور بات ہے کہ یہ داستان شکست کے وقت ہی نہ لکھی جائے۔ بعض وقت مثل یونانی المیہ نگاروں کے یہ وارداتِ شکست ماضی معروف واقعات اور بڑے بڑے خاندانوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ دیگر حالات میں یہ چیز مستقبل کی توقعات بن جاتی ہے مثل ریسائن (RACINE) کی تصنیفات جن میں از اونسیی شہنشاہیت پر طاری ہونے والی آفتوں کی نبضیں دھڑکتی محسوس ہوتی ہیں۔ اگر ہمارے بعد ہمارے زمانے کے متعلق کوئی ٹریجڈی لکھی جائے تو میرے خیال میں ہماری زندگی کے دو مقامات کو ضرور المناک سمجھا جائے گا۔

اوّل : انصاف پر ایمان رکھنے والے فرد کا مقام جو مرکزی سیاسی اقتدار سے شکست کھانے پر مجبور ہے خیال رہے کہ "منصف انسان" نہیں کہا گیا، کیونکہ ابھی تک انصاف کی ماہیت کے متعلق کوئی مشترکہ

سو تقائم نہیں ہو سکا، انصاف اور عدل کے متعلق ہر جماعت کا مختلف نظریہ ہے اور ایک جماعت دوسری
جماعت کے اسی تصور کو تباہ کرتی رہتی ہے، ایک انسان ایسی باتوں پر ایمان رکھتا ہے جسے سماج رد کرتا ہے
یورپ پیر آزاد انصاف کے علمبرداروں کا المناک مقام ہے، یہ وہ المناک مقام ہے جہاں سائنس دان
یہ یورپ آزاد انصاف کے علمبرداروں کا المناک مقام ہے یہ وہ المناک مقام ہے جہاں ججوں کو محض
انصاف سے حکومت کے مطلب حصول ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ جہاں سائنس دان قوموں کی
پیدائش کمتری اور برتری پر مہر توثیق ثبت کرنے سے انکاری ہیں، جہاں مذہب پرست لوگ
مذہبی آزادیوں کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ فرد اور ایک اندھے منکر سماج کی ٹکر کا نظارہ اتنا ہی المناک ہے جتنا فرد
اور اندھی تقدیر کے تھپیڑ، عہد ماضی میں تماشائی اپنے آپ کو قسمت سے لڑنے والے انسان کے ساتھ ساتھ محسوس کرتے
تھے کیا وہ اب بھی اپنے آپ کو مادہ پرست سماج سے ٹکر لینے والے فرد کے ساتھ ایک سمجھ سکتے ہیں۔
پڑھتی ہوئی الفاظ کے قید و بند سے آزاد ٹریجڈی کے ان گنت تماشائی، اپنے آپ کو۔ مجبوراً۔
ہی سہی۔ ان باہمت روحوں کے ساتھ ایک سمجھتے ہیں جنہیں قطعی حکومتوں کی مشینیں اذیت و بربادی
میں دھکیل دیتی ہیں۔

دوم: یہ مقام منطقی طور پر پہلے مقام کی ارتقا یافتہ صورت ہے یہ آج کی المناک صورت حال کو انسانیت
کی صورت حال گردانتا ہے۔ انسانیت اپنے اخلاقی نظام اور مذہبی عقائد کی بنیادیں گرتی دیکھتی
ہے، یہ انسانیت اپنے آپ کو مشینری کی ان شیطانی قوتوں سے دوچار پاتی ہے جسے یہ انسانیت
خود ہی بروئے کار لائی تھی، یہ مشینیں ہر جگہ ایک خود غرض اقلیت کے ہاتھ لگ گئی ہے جو خود اپنی
پیدا کردہ جنگی قوتوں اور معاشی آفتوں کو قابو میں رکھنے سے عاجز ہے،
ہو سکتا تھا کہ ایسی صورت حال میں ہم ہنسی کی لہروں میں کھو جاتے اور ایک ہیبت ناک
طربیہ بنانے کی کوشش کرتے جس میں ہر کردار آخرکار موت کی آغوش میں جا پڑے (CELINES
"VOYAGE AU BOUT DE LA NUIT") ملاحظہ ہو۔ یا ہم انسان کو ایک ایسی بلند اور
ترقی یافتہ تہذیب میں چلتا پھرتا دیکھتے جہاں آج تک کوئی تہذیب نہیں پہنچ سکی اور پھر دیکھتے کہ اس
بلند ترین مقام پر بھی انسان اپنی فطرت، بھوک، ڈر، محبت، اور انسانیت کے بنیادی حقائق سے
دست و گریبان ہونے پر مجبور ہے، یہ ہے جدید ٹریجڈی کا عام انسان، شہری، سپاہی، لیکن ایسے

مراتب پر متمکن افراد بھی ایسے ہی صید زبوں حال کو الٰہی دیتے ہیں، مشینیری کی شان دار قوتوں کا مالک جیتے ہوئے بھی اسے موت سے دو چار ہوتا ہے، مشینوں کی بے حسی اس انسان کی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتی، وہ اب بھی غلطی کر سکتا ہے، وہ اب بھی تھک جاتا ہے، جدید ایجاد اور تنظیم کے گھوبوں کے باوجود اس کے سپاہی بھی چستی اور اخلاق کھو سکتے ہیں۔

جدید فرد اور جدید ماحول کا یہ تعلق ٹریجڈی نہ کہلا سکے گا، یہ تو ایک المناک صورت کا سپاٹ بیان ہے اسے ٹریجڈی کے سانچے میں ڈھل جانے کی اہلیت حاصل ہے بشرطیکہ انسان اپنی انسانیت پر دھکیل دئے جانے سے مشینی دماغ والی مخلوق کی بجائے صحیح انسان بن جائے، یہ یقینی امر ہے کہ سینکڑوں انسان اپنے مصائب میں صورت حال کی صداقت پر غور کرتے ہیں، سیاست دانوں کو اپنی لغویات سے تدبر کا لمحۂ فکریہ ملے یا نہ ملے، لیکن انسانوں کو یہ فرصت ضرور حاصل ہے اگر آپ کو المناک صورت حال کا صحیح مشاہدہ کرنا ہو تو انسان کے خاموش دکھ جھیلنے کے سین ملاحظہ کریں۔

(نیورا نشنگ: سٹفن سپنڈر کے "جنگ اور کتابیں" سے)

غزل

سید جابر علی

آکہ فسونِ زندگی تیری نظر میں ڈوب جائے
راحت و رنج لوٹ جائیں، سود و زیاں کو نیند آئے

عشق کی آگہی کو دیکھ، بھول کے بھی نہ راہ پائے
عقل کی بے بسی بھی دیکھ، پاکے بھی راہ بھول جائے

ایک نگاہ سرسری، ایک تبسمِ خفی
حسن کی شان یہ نہیں آگ لگا کے لوٹ جائے

دامنِ دل میں بے قرار، عالمِ گفتنی، مگر
چینِ جبیں نظر جو آئے ایک بھی لفظ کہہ نہ پائے

کس نے کہا کہ غم کو ہے جرأتِ عشق سے گریز
ہاں کبھی سامنے تو آئے آنکھ سے آنکھ تو ملائے

ہے دلِ نامراد میں ایک تصورِ نگاہ
اے غمِ عشق دیکھنا یہ بھی چراغ بجھ نہ جائے

میری نظر بھی دیکھنا، ان کی نظر بھی دیکھنا
جیسے چراغ ٹمٹمائے، جیسے ستارہ جھلملائے

تیرے خیال نے مجھے کی ہیں عطا وہ رفعتیں
قطع نظر حیات سے، موت بھی آ کے مسکرائے

قتیل شفائی

ایک غزل

پھر وہی چیخیں — اسیروں کو نہ جانے کیا ہوا
جل نہیں اٹھتے، زنجیروں کو نہ جانے کیا ہوا

خیر مقدم ہو رہا ہے ہر نئے صیاد کا —!
اہلِ گلشن کے ضمیروں کو نہ جانے کیا ہوا

ہائے یہ چاندی کا دریا، ہائے پیاسی زندگی
میرے ہاتھوں کی لکیروں کو نہ جانے کیا ہوا

ایک بھی نغمہ سلاسل سے نہ پیدا کر سکے
آج زندہ دل اسیروں کو نہ جانے کیا ہوا

بام پر آنکھیں لگی ہیں اور قدم اٹھتے نہیں
چلتے چلتے راہگیروں کو نہ جانے کیا ہوا

جو کلیجے میں اترتے ہی اُگلتے تھے خمار
اُن شراب آلود تیروں کو نہ جانے کیا ہوا

آنسوؤں میں اُف یہ نومیدی کی طغیانی قتیل
میرے خوابوں کے جزیروں کو نہ جانے کیا ہوا

خلیل الرحمن اعظمی

نقشِ ناتمام

پیکرِ حسن و حیا! آہ یہ تصویر تری
میری تخئیل کا ہے ایک ادھورا شہ کار
منظرِ شعلۂ رقصاں
ترے اعضا کا نمو
تیرے رخسار پہ سرخی کی جھلک
تیری پلکوں پہ چھلکتا ہوا وہ ایک خمار
یعنی ساحل سے گزرتا ہوا تیرا طوفاں
اور تکمیل شباب
آ گئے سب قفسِ رنگ میں لیکن اے دوست!
کیسے دکھلاؤں تبسّم کو ترے
جو مرے شکووں کو سن کر اکثر
ایک پُر کیف سی انگڑائی کے ساتھ
صرف ہونٹوں پہ نہیں
ان چمکتی ہوی آنکھوں میں بھی آ جاتا ہے۔

کس طرح سوچ سکوں کونسا ہے رنگ اس کا
جیسے خاموش سمندر میں ہو ایسی اک لہر
جس میں اک ساتھ ہیں دو رنگ کے دھارے بہتے
التفات ستم آمیز و تغافل بہ کرم
اس پہ ہے سایہ کناں وقت کا تاریک عقاب
کاش یہ ایک تبسم کی لکیر
تیری تصویر میں آتی اس طرح
میرا افسانہ، دل اس میں جھلک کر خود ہی
صفحۂ دہر پہ کرتا یہ حقیقت عریاں
کتنی عظمت کا ہے حامل یہ گناہ آدم
لیکن اے شاہدِ معصوم یہ تصویر تری
شاید اس طرح سے اب تشنۂ تکمیل رہے۔
جس طرح میری تمناؤں کے رنگین نقوش
ہے مگر یہ بھی حقیقت ہی تو اے جانِ حیات
'کہ محبت ہے جوانی کا ادھورا اک خواب'

نصیر حیدر

فردوس گم کردہ

کتنے خوابوں کا سکوں، کتنی بہاروں کا فسوں
لئے پھرتا ہے مرا جذب دروں
دربدر کوچہ بکوچہ، انہیں شہروں انہیں صحراؤں میں
حیف وہ خواب جو بستے نہیں اب
تیرے پلکوں کی گھنی چھاؤں میں
وہ بہاریں کہ ترستا ہے جنہیں تیرا شباب
اور تری سیج کے پھول
جن کی حسرت میں مٹے جاتے ہیں
پژمردہ ہوئے جاتے ہیں

اور یہی خواب، بہاروں کے یہی نقش و نگار
اڑتے پھرتے ہیں مرے بجد میں مانند شرار
اور یہ چنگاریاں خود اپنی ہی گرمی سے کبھی
بھڑک اٹھتی ہیں تو آگ سی لگا جاتی ہیں،

میرے ویران تخیل کے جنوں زاروں میں
ایسے ہی شعلوں کے کتنے ہی بگولے شب و روز
اک غول بیاباں کی طرح
گشت کیا کرتے ہیں ــــ

یاد تو ہوگا تجھے بھی اے دوست
میری فردوس مرے دشت جنوں کی یہ بہار
تیرے ہی جلووں کا پرتو تھی کبھی
میرے خوابوں کا سکوں
تیری ہی نظروں کا پروردہ تھا
ہاں وہی نظریں جواب خود تجھ سے
ٹھیک اٹھتیں بھی نہیں
اور جھکتیں بھی نہیں
اور پھیری بھی نہیں جاتی ہیں،

Heaven

ضیاءالاسلام

خم و پیچ

مری نگاہ کے وہ شکوہ ہائے گوناگوں

تمہاری آنکھوں میں پہلی سی آہ بات نہیں
وہ رنگ التفات نہیں
وہ شوق وانبساط نہیں
مگر کسی سے تمہیں چاہ بڑھ رہی ہے کہو۔

مرے خیال کی رعنائیوں میں تم ہو ابھی
تمہارے گیسو کی خوشبوئی مایۂ خوبی
تمہاری آنکھوں سے امرت ابھی ٹپکتا ہے
تمہارے سامنے ہے چاندنی بھی پھیکی سی

یہ کیا ہوا کہ تنفس میں گرمیاں نہ رہیں
کسی کے واسطے تم آج منتظر ہو، کہو!

یہ زندگی کی علاوہ کہ عقل ہے مصر
کہ زندگی ہی میں ہوں زندگانیاں پیدا

کسی کے ساعد نازک کی مدح کر دیجے
کسی کے کاکل پیچاں میں آج لیجے پناہ
دوسری زندگی کا ہو آغاز
رخ زیبا کی چھاؤں میں رہ کر
بادۂ چشم احمریں پیجے
اور پھر اک نگاہ تازہ سے
رخ و کاکل کی مدح کر دیجے

حسن ہر پیکر حسیں میں ہے
حسن میں انتخاب کیا کیجے
دل مگر کہہ رہا ہے اب بھی یہی
صرف تیری ہی پرستش کیجے

مگر کسی سے تمہیں چاہ بڑھ رہی ہے کہو۔

کاوش انصاری

پچھلے پہر

شب کے بکھرے ہوئے گیسوئے سیہ بھیگ گئے
اور مری نیند کی آغوش بھی بوجھل نہ ہوئی
دھیرے دھیرے بڑھا آتا ہے کوئی میری طرف
لیکن اب بھی مرے جذبات میں ہلچل نہ ہوئی

سعیٔ ناکام پہ شرما گئے ماہ و انجم
جھلملانے لگا کچھ سوچ کے بالیں کا چراغ
زرد رخسار پہ جم سی گئی اشکوں کی قطار
بات ہی کیا ہے جو رہ جائے نہ اب تھک کے دماغ

کون اب سوچے کہ کس طرح بسر کی ہے رات
وہ کسی طرح بسر کی ہو، بسر ہو تو گئی
خون ہی کیوں نہ ہو اس میں مرے ارمانوں کا
ایک گلکاری سی تا حدِ نظر ہو تو گئی

حسرتِ دید نہیں، شوقِ ملاقات نہیں
اب مرے دن کے تعاقب میں کوئی رات نہیں

رمیش چندر

الگ الگ راستے

اُس کے منہ سے پھول جھڑتے رہے اور میں بُت بنا بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہا
...... اور جب وہ اپنی آپ بیتی سُنا چکا تو بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا "پربودھ!
ھنیہ ہے تمھارا جیون!"...... یہ سُن کر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ
دار ہوئی لیکن اُس نے اُسے پھیلنے سے روک لیا...... وہ بولا "لیکن صاحب!
ب تک میں سمجھتا ہوں، میں نے اپنے ملک کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہاں اُس دِن
ں اپنا جیون سپھل سمجھوں گا، جس دن مادر وطن کی بیڑیاں کٹ جائیں گی ـــــ!!"
میں نے دیکھا یکایک اس کی گڈھے میں دھنسی ہوئی آنکھوں میں دو چنگاریاں سی چمکیں
رگم ہوگئیں...... دوسرے لمحے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں اس کی طرف
لی باندھے دیکھتا رہا ـــــ

اس کا لاغر بدن، موٹے گاڑھے کے کپڑے، چہرے کی زرد رنگت اور پچکے ہوئے رخسار
ں امر کے شاہد تھے کہ اس نے مصیبتیں جھیلی ہیں، اس کی مالی حالت خراب ہے اور اس
صحت گر گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک انوکھا نور برس رہا تھا،
سا نور جو صرف اُن لوگوں کے چہروں پر نظر آتا ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے
پ کو مٹا دیتے ہیں ـــــ!

ہمدردی ظاہر کرنے کے لیئے اور کچھ یہ سوچ کر کہ شاید میں پربودھ کی مالی حالت
ہ سُدھار سکوں میں نے کہا۔ "پربودھ بابو، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک عرض کروں!"
رمائیے! وہ مسکرایا

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنے ڈیپارٹمنٹ میں نوکری دلا سکتا ہوں!
ہ ـــ! نوکری ـــــ!!" وہ چونکا "ـــــ شکریہ! لیکن میں آپ سے پہلے ہی عرض
چکا ہوں کہ میرا راستہ جدا ہے، اور میں اپنی موجودہ زندگی سے بالکل مطمئن ہوں!"

پر بودھ کا جواب سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خجالت سے صوفے میں دھنسا جا رہا ہوں۔

اس نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کر جانے کے لئے اجازت چاہی۔

"کیسے کہوں آپ جائیے!" میں نے اپنی خجالت چھپانے کی کوشش کی ——— "پندرہ برس بعد تو آپ سے ملاقات ہوئی ہے ——— اور وہ بھی حسن اتفاق سے!"

"مجھے ساڑھے نو بجے نائٹ سکول میں Mamma A کلاس لینی ہے!"

"آپ کی مرضی ——— ! لیکن ہاں ——— اپنا پتہ تو دیتے جائیے ——— یقیناً آپ کے بیوی بچوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوگی ——— !"

پر بودھ کی آنکھوں سے پھر کرنیں سی پھوٹ نکلیں۔

"تشریف لائیے گا" شوق سے" وہ بولا "لیکن میرے جھونپڑے میں آپ کے بٹھانے کے لائق کرسی تک نہیں ہے۔ آپ ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے دوبارہ گھڑی دیکھی اور صدر دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں اسے چھوڑنے کے لئے پھاٹک تک آیا۔ جدا ہوتے وقت ہم دونوں نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اور مسکراتا ہوا تیز تیز قدم رکھتا بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں پھر صوفے میں گر پڑا۔ پر بودھ کی ملاقات نے جیسے میری روح کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ میں سوچنے لگا میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ آج سے پندرہ برس پہلے میں نے نوکری کر کے خودکشی کر لی تھی اور آج پر بودھ کو بھی یہی صلاح دے رہا تھا۔ جو مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اور جس نے آج سے سترہ سال پہلے جبکہ ہم دونوں ایم۔ اے کے فائنل ائیر میں تھے میری اس تجویز کو ٹھکرا دیا تھا............ یہ دوست ہے لیکن ان پندرہ سالوں میں جائز و ناجائز طریقوں سے بتدریج ترقی کرتا رہا، دوسروں کا گلا گھونٹ گھونٹ کر ہر طرح سے اپنے افسروں کو خوش رکھ کر!

اور ان پندرہ برسوں میں جوں جوں میری آمدنی بڑھتی گئی زندگی کا معیار اونچا ہوتا گیا۔ بسیار خوری کے سبب جسم پر چربی کی تہیں چڑھتی اور روح روز افزوں گوشت کے

رے دبتی رہی .... میں نے شادی کی اور پہلی بیوی کو حسب خواہش نہ پاکر
چھوڑ دیا۔ پھر دوسری شادی کی اور چونکہ دوسری بیوی کو میری چند حرکتیں پسند نہ تھیں
وہ مجھ سے لڑ جھگڑ کر اور اپنے بچوں کو لے کر مائیکے چلی گئی ـــــ اور پھر میں نے سوچا کہ
شادی کرنا محض ایک حماقت ہے .... اسی طرح پندرہ سال بیت گئے اور آج
میں ایک Gazetted افسر ہوں۔ میرے پاس موٹر ہے، بنگلہ ہے اور میرے ماتحت
درجنوں کلرک کام کرتے ہیں ـــــ اب میں پانی کی جگہ بیر (Beer) پیتا ہوں اور رات
کو کلب میں ناچ ناچ کر دل بہلاتا ہوں ـــــ لیکن میری زندگی کا نصب العین ؟
ـــــ کچھ بھی نہیں ! میری وجود کا حاصل ـــــ ؟ صفر !!

اور پربودھ ! اِن پندرہ برسوں میں اُس نے ملک کے کونے کونے کی خاک
چھانی۔ وہ خود چل کر لوگوں کی غلیظ اور بوسیدہ جھونپڑیوں میں گیا۔ اُس نے انھیں بھوک
اور پیاس سے بلکتے دیکھا، درد اور کرب سے تڑپتے دیکھا ـــــ وہ ان کے زخموں پر مرہم
رکھتا رہا، ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور ان کے کانوں کو نوید سحر سناتا رہا
.... اور اسی جرم کی پاداش میں متعدد بار جیل بھی گیا۔ لیکن جیل کی تنگ و
تاریک کوٹھریاں اور آہنی سلاخیں اُس کا حوصلہ پست نہ کر سکیں ـــــ واقعی ! اس
کی زندگی ملک اور قوم کے لئے کتنی مفید ہے ! برائے نام تنخواہ لے کر وہ دن بھر سیاسی اور
سماجی کام کرتا ہے اور رات کو بلامعاوضہ نائٹ سکول میں تعلیم بالغاں کی نشر و اشاعت میں
حصّہ لیتا ہے ـــــ پھر مجھے اُس کی بیوی بچّوں کا خیال آیا ـــــ وہ غریب کیا کھاتے
ہوں گے ؟ کیا پہنتے ہوں گے ؟؟ لیکن مجھے یاد آیا، اُس نے کہا تھا " میں اپنی موجودہ
زندگی سے بالکل مطمئن ہوں !" اور جب میں نے اُس کے بیوی بچّوں کا ذکر کیا تھا تو اس
کی آنکھیں یکایک چمک اٹھی تھیں.......... اُن کے دلوں میں بھی آزادی کی لگن ہوگی
یقیناً وہ اُن سے محبت کرتا ہوگا ! اس کے بچے ضرور بڑے ہو کر ملک کے لئے کچھ ٹھوس کام
کریں گے ـــــ اور یکایک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پربودھ ایک دیوتا ہے اور
میں اُس کے سامنے ایک کم ظرف، حقیر انسان ـــــ نہیں ! بلکہ ایک ذلیل کتا جو کا

بھیڑ مر چکا ہے اور زندگی میں جس کا مطمح نظر صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے سے کمزور کتے پر جھپٹ کر اس کے منہ کی ہڈی چھین لے اور خود ہضم کر جائے! اور ——————

ور —— ہونہہ! معاً مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے بجلی کا بٹن دبا دیا —— گھنٹی بجی —— بیرا حاضر تھا۔ "جی صاب!"

"ہاں دیکھو! —— آج ہم کلب نہیں جائیں گے —— ہمارے سر میں درد ہے —— کوئی "ٹانک" چیز چاہئے! —— وسکی اور سوڈا لاؤ —— !

اور جب وسکی اور سوڈا آگیا، اور میں آدھا گلاس حلق سے نیچے اُتار چکا تو کچھ دیر بعد مجھ پر یہ راز افشا ہوا کہ پربودھ محض بدھو ہے —— ایک جذباتی قسم کا انسان جو خیالی چیزوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ دراصل ہماری دوستی تو آج سے پندرہ برس پہلے ہی ختم ہو چکی تھی جبکہ ہم نے الگ الگ راستے اختیار کر لئے تھے! .... مجھے افسوس ہوا میں ناحق آج گھومنے کے لئے پارک چلا گیا۔ اگر نہ جاتا تو پربودھ سے مڈبھیڑ نہ ہوتی! ایسے آدمیوں سے مل کر خواہ مخواہ طبیعت پریشان ہوتی ہے۔! پھر اس سے اور اس کے بیوی بچوں سے ملنے کیوں جاؤں؟

"ارے بیرا" "جی صاب"

"ڈرائیور سے کہو کہ کار تیار رکھے، ہم کلب جا رہے ہیں"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سر کا درد آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔

اشعر ملیح آبادی

ویران گلی

شاہراہوں سے بہت دور کہیں
جگمگاتی ہوئی سڑکوں سے الگ
چاند تاروں کے تبسم کی کرن سے محروم
غم میں ڈوبے ہوئے پیڑوں کے گھنے سایے تلے
اونگھتی، رینگتی ویران گلی جاتی ہے۔

بادۂ نور سے لبریز تو ہے جام فلک
شاہراہوں کے کناروں پہ دمکتی ہے ابھی
لالہ زاروں کے دل آویز نظاروں کی بہار
آہ لیکن اسے مطلب ہی نہیں
اس کے نزدیک فقط گریۂ شبنم ہے بہت
جس کی بوندیں اسے افلاک کے ہنستے تارے

سالہا سال سے بے نور ہے اس کا سینہ
داہنے بائیں گلی کے یہ شکستہ سے مکاں
جن مکانوں کے مکینوں نے کبھی
نوحۂ غم کے سوا
نغمۂ عیش کا دھندلا سا تصور نہ کیا
خارزار غم ہستی ہے شبستاں ان کا

اونگھتی، رینگتی ویران گلی جاتی ہے
اسکی مغموم فضائیں کبھی گونجی نہ ہنسی

حسرت و یاس سے لبریز کناروں پہ کبھی
قمقمے تک نہ ہوے ہیں روشن
اس سے گذرے ہی نہیں ماہ رخ و برق جمال
انتظار اس کے کناروں پہ کسی کا نہ ہوا
اس پہ چلتے ہیں فقط بھوک کے مارے مزدور
یا کوئی رات کی اندھیاری میں بھٹکا راہی
یا پھٹے حال میں رہتے ہوے بے چارے کسان
خشک ہونٹوں پہ لئے رنج والم کے بادل
دھندلی آنکھیں طرب و عیش سے یکسر محروم
ظلم کے تنگ بھنور میں ہے سفینہ جن کا
زندگی جن کی فقط ایک سراب
دونوں عالم کا عذاب!
آہ بے چارے یہ اس پر بھی جئے جاتے ہیں
زہر کا گھونٹ سمجھ کر بھی پیئے جاتے ہیں۔

وقت آئیگا کہ دنیا ہی بدل جائے گی
زندگی اک نئے انداز میں ڈھل جائیگی
اور یہ ویران و سیہ پوش گلی
ہوگی تابندہ سڑک میں تبدیل
اور یہ سڑکیں، یہ دمکتی ہوی سڑکیں اکدن
اونگھتی، رینگتی گلیوں میں بدل جائیں گی
شاہراہوں سے بہت دور کہیں
جگ مگاتی ہوی سڑکوں سے الگ
اونگھتی، رینگتی ویران گلی جاتی ہے

حمد ایاض

ایک نظارا۔ایک اشارا

حسیں مہتاب نے اپنے جھروکے سے ادھر جھانکا
اُدھر پگڈنڈیوں پر نور چھن چھن کر سمٹ آیا
فضا میں گھل گئی یوں ہلکی ہلکی دلنشیں سرخی
کسی نے جیسے اپنے ریشمیں آنچل کو لہرایا
ہوا نے چلتے چلتے گدگدایا نرم پتّوں کو
رسیلی کونپلوں کے جمگھٹوں نے رقص فرمایا
حسیں کھیتوں نے ہر گوشے میں اک دلکش مہک چھڑکی
اسی خوشبو سے دہقانوں کی آنکھوں میں نشہ چھایا
گھروں کی سمت لوٹے سادہ و معصوم چرواہے
تھکی بھیڑوں کا گلّہ راستے میں گھس کے ممیایا
خنک رو چاندنی کی چھاؤں میں ڈالے گئے جھولے
حسیناؤں نے اپنی پریت کی یادوں کو دہرایا
حسیں چوپال پر اک بادشاہ کا قصّہ جاری ہے
یہی چوپال ہے محنت کے متوالوں کا سرمایا
وہ دور اک بانسری کے لب سے پھوٹیں دل فزا تانیں
وہ چمکا دور مندر کے قریں اک کانپتا سایا

انتصار نیوتنوی

بدلے ہوئے مزاج

گنیش کے مرنے کے بعد سارے گھر میں اداسی پھیل گئی، اول تو موت ناگہانی تھی - دوسرے وقت سے پہلے وہ مارڈالا گیا تھا۔ ایک مجمع پر گولی چلی جس میں گنیش شریک تھا اور وہ اجل کا نشانہ بن گیا۔ ملک میں اس قسم کے نشانوں کو ایک مقدس مقام دیا جاتا ہے اخباروں میں مرنے والوں کی سوانح عمریاں لکھی گئیں، تصویریں نکلیں، لیکن ان ناگہانی حادثوں کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ انسانوں کے بدلتے ہوئے مزاج موت کی شکلیں اختیار کر رہے تھے۔ سیکڑوں گھروں پر اداسی چھا رہی تھی۔ بوڑھے لوگ سہمی ہوئی نگاہوں سے زمین اور آسمان کو تکا کرتے ننھے معصوم بے زبان بچوں کی طرح جیسے دنیا میں ابھی ابھی پیدا ہوئے ہوں جوانوں نے انکے سامنے مرکر انھیں ایک عجیب قسم کا سبق دیا —— یہ دنیا مزاجوں کی دنیا ہے ادھر مزاج بدلا اُدھر دنیا بدل گئی۔ بظاہر گنیش میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔ سیدھا۔ سادھا نیک۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد کچھ تھوڑا سا مزاج بدلا۔ بھگت رام نے سب سے پہلا فرق اس کے لباس میں پایا پھر رفتہ رفتہ اسکی زندگی بدلنے لگی۔ اکثر وہ پرانے خیالوں کی مخالفت بہت ہی شد و مد کے ساتھ باپ سے کرتا تھا۔ کالج کی ایک لڑکی شکنتلا کیساتھ اسکی دوستی ہوتی دونوں کو بھگت رام نے ایک ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھا ہوا دیکھا مگر شکایت نہیں کی، یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ برداشت کرتے رہے۔

پھر ایک دن انھوں نے دبی زبان سے کہا، ان جلسوں میں کیوں شریک ہوتے ہو؟ شام کو اپنے گھر آجایا کرو۔ جب تک تم کالج سے لوٹ کر نہیں آجاتے میں پریشان رہتا ہوں۔ دنیا کے یہ ہنگامے تمھارے بغیر بھی اسی طرح جاری رہینگے۔ اور اگر ہر شخص اپنی جگہ پر یہ سمجھ لے تو پھر ہنگامے کیوں اٹھیں گنیش ایک سیدھا سا جواب دیکر خاموش ہو گیا، مگر یہ کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟ آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔ تم بتاؤ۔ تم نے مجھ سے زیادہ تعلیم پائی ہے۔ مگر دنیا کو تم

سیا دور
سے زیادہ میں نے دیکھا اور سمجھا ہے ۔ وہ قوم انتہائی بدنصیب ہے جو اپنے جوانوں کو کھوئے ۔
آپ کی اِن تمام باتوں کا جواب دنیا کی وہ تواریخ ہے جو اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔
جگت رام بیٹے کے جواب پر ایک قہقہہ لگا کر ہنس پڑے، تو گویا آپ لوگ تواریخ دہرا
رہے ہیں ؟ اور اتنا کہنے کے بعد اُن کے لہجہ میں ترشی آ گئی۔ جیل خانوں کا بھرنا۔ پھانسی کے تختوں
پر لٹکنا یہ سب تواریخ کا الزام ہے ۔ واہ ری دنیا کی تواریخ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ موت زندگی سے ؟ یا
پائیدار ہے۔ اس چیز سے مرنے والے کو کم اور پالنے والے کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے، ممکن ہے یہ
بھی کوئی فیشن ہو، اس دور میں انسان خلقی موت پانے کو اپنی ہتک سمجھتا ہے، بلکہ سیاسی موت،
اقتصادی موت ، ذہنی موت ۔ ان موتوں میں انفرادیت ہے ۔ شان ہے ۔ ایک اور موت بھی
ہے ۔ کتے کی موت جس کا کوئی مفہوم نہیں۔ اور اس موت کو تم نے مختلف نام دے رکھے ہیں۔ تمہارے
اوپر گولیاں برستی ہیں۔ تمہارے سینے نہ ہوئے چاند ماری کی شکستہ دیوار ہوئی۔ جس پہ ہر روز صبح
کو گولیوں کی مشق ہوتی ہے، گولی دیوار پہ نہ چلی سینہ پر چل گئی ، اس بات کا احساس نہ گولی کھانے
والے کو نہ مارنے والے کو۔

مگر جگت رام کی یہ تمام باتیں صدا بصحرا تھیں، انھیں سنتا ہی کون تھا۔ خود بوڑھا عقل
بوڑھی۔ دنیا کیا دیکھی تھی اپنی عمر کا حساب زندگی بھر لگاتا رہا۔ گنیش کا سیاسی انہماک روز بروز بڑھتا
ہی گیا۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اُسے ہر تحریک سے دلچسپی ہوتی گئی۔ وہ ان تمام باتوں
کو ملک قوم کی خدمت سمجھنے لگا۔ شکنتلا سے اسے محبت تھی اور وہ بھی گنیش کی بعض صلاحیتوں کو قدر
کی نگاہ سے دیکھنے لگی، پھر کالج کی تحریک میں اسکا بھی ہاتھ تھا۔ شکنتلا کے گھر بیٹھکر گنیش جس وقت کسی
الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتا تو لوگ اسکی باتوں کو بہت غور سے سنتے، اس نے انکے دلوں میں اپنا ایک خاص
مقام پیدا کر لیا تھا۔ ملک کی بھوک اور تنگ حالی کا پورا پورا احساس انھیں تھا، اور پھر گنیش نے انھیں
مختلف سرخیوں کیساتھ رنگ دے کر بیان کیا۔ یہ گھر گنیش کا پلیٹ فارم تھا اور یہ بڑے لوگ اسکی باتوں
سے ذہنی عیاشی کرتے تھے ۔ ان کے شعور میں یہ چیز جڑ پکڑ گئی تھی کہ زندگی مختلف انقلابوں ہی کا نام ہے
یہی چیز اِن بڑے لوگوں نے چھوٹوں کو سمجھائی ہے ، زندگی حرکت کا نام ہے، انقلاب کا نام ہے۔ اصولوں
پر مر جانے کا نام ہے، سمند ناز پر یہ ایک تازیانہ ہے۔ شکنتلا کا انہماک گنیش کا جوش بنتا چلا گیا۔

بڑے شہ دیتے ہیں چھوٹے سینوں پر گولیاں کھاتے ہیں۔ آج کسی کے گھر کا چراغ گل ہو گیا۔ کل کوئی مر گیا چاند ماری کی گولیاں۔ ملک کی ایک شکستہ اور بوسیدہ دیوار جس کے سینہ پر ہزاروں قسم کی گولیوں کے بے شمار نشانات ہیں۔

اور اس دیوار پر لوگ تمسخر کرتے ہیں، پوری ایک قوم ایک ساتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی ہے، جیسے اسے دنیا کی تواریخ کا کوئی ورق یاد آگیا ہو۔

گولیاں آج صبح سے چل رہی تھیں، کالج کی سرحد پر سنگینوں کا پہرہ تھا۔ شکنتلا کو باپ نے ایک ہفتہ سے کالج نہیں جانے دیا۔ بھگت رام نے بھی انتہائی خوشامد سے بیٹے کی تھوڑی میں ہاتھ ڈالکر کہا، یہ گولیاں نہیں۔ موت اور زندگی کی ملی جلی آوازیں ہیں۔ تم گھر سے مت جاؤ، اگر مجھ پر رحم نہیں کرتے تو اپنے بچہ پر ترس کھاؤ۔ اگر مجھے دیکھکر نہیں سمجھ سکتے تو بچہ کو دیکھکر سمجھنے کی کوشش کرو، پھر میں ہی سمجھ میں آجاؤنگا۔ تاریخ تمھارے بغیر ہی اپنے آپ کو دھرائے گی۔ نہیں تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ گولیاں برابر یونہی چلتی رہینگی۔ تمھارے سینہ کی ہڈیاں انکا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

کرسکتی ہیں۔ یہ فولادی گولیاں ہیں۔ ان کی زندگی ہماری ہڈیوں سے کم ہے۔ یہ ہم سے پہلے زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہیں یہ بند ہونگیں، انھیں بند ہونا پڑے گا۔ سینوں پر گولیاں نہیں چلائی جا سکتیں۔ اور آپ لوگ کس قدر خوش عقیدہ ہیں، ان گولیوں کو انسان چلاتے ہیں۔ ان گولیوں سے انسان مرتے ہیں۔ ہم آپ بھی انسان ہیں اور لعنت ہے ہم پر ـــ

مگر یہ انتظامی معاملات میں ایک انسان ایسا کرنے پر مجبور ہے، مجھے یقین ہے کہ تمھاری لعنت بھی ان گولیوں کو بند نہ کر سکیگی۔ تم گھر سے مت جاؤ۔ یہ دنیا ہے، یہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔

بھگت رام نے بہت محبت سے اس کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ گولی کی ہر آواز پر وہ گنیش کو اپنے میں جذب کر لینا چاہتا تھا، اس کے ہاتھوں کی گرفت لمحہ بہ لمحہ مضبوط ہوتی گئی۔ وہ اپنی ذہنی الجھن کے ساتھ لڑکے کی موت سے برسرپیکار تھا .... اور پھر جیسے یہ گرفت خود بخود ڈھیلی ہوتی گئی، کسی کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انھوں نے لڑکے کو موت کے منہ میں کیسے جانے دیا۔ گنیش کے بدلے ہوئے مزاج کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آسکا۔ مریض کو آخری ہچکیاں آنے لگیں نبضیں چھوٹ گئیں

اور پھر یہ بات جیسے خود ان کی سمجھ میں آگئی کہ قوموں کا جب مزاج بدلتا ہے تو ان کا علاج گولیاں کرتی ہیں مرض اسی سے جاتا ہے' یہ زندگی بخش گولیاں جس نے کھائیں وہ اچھا ہوگیا۔ ان میں زندگی کا جوہر ہے اس سے قوم زندہ ہوتی ہے ۔اس سے ملک سانسیں لیتا ہے۔ ان گولیوں میں امرت رس ہے' جس نے گولی کھائی وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگیا۔

انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد' اور پھر وہی دہائیں دہائیں۔ گولیوں کی آوازیں' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بندوق کی آوازیں' انسانی آواز کی ضد ہیں' یہی دو مختلف آوازیں آپس میں ہمکلام تھیں دو مختلف نسلوں کی آوازیں اپنے افسانوں کی دہرا رہی تھیں۔ ان افسانوں کی مختلف سرخیاں تھیں' مسجد شہید گنج۔ جلیان والا باغ' قصہ خانی۔ بیلی گارو۔ ان پرانے قصوں میں دو ایک نئی کہانیاں بھی تھیں جنکے نام تھے۔ کلکتہ' بمبئی۔ مدراس۔

گنیش جا چکا تھا' افسانے دھرائے جا رہے تھے' آخر کار جب دن کٹا تو یہ ساری کہانی تمام ہوئی۔ گھروں میں چراغ روشن کر دئے گئے۔ جگت رام کے گھر میں اندھیرا تھا۔ پورے ایک گھنٹہ کے اندر اندر شہر کے چراغ جلے اور بجھ گئے۔ گنیش کی لاش دریا کی بے پناہ موجوں کی سپرد کردی گئی۔ سب روپیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور کرتے بھی کیا۔ اپنی موت مرتے تو انھیں صبر آجاتا۔ یہ تو کتے کی موت تھی۔ جگت رام سے کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ گنیش کیسے مرگیا۔ کیا وجہ ہوئی۔ گولی کہاں پرلگی۔ ان کے اوپر آسمان' نیچے زمین اور ہر طرف انقلاب کے نعرے۔ یہ گولیاں ان نعروں کو نہیں روک سکیں۔ یہ سینوں کو چیر سکتی ہیں۔ زندگی ختم کرسکتی ہیں' لیکن انقلاب کے نعروں کو نہیں روک سکتیں۔ اور پھر دھیرے دھیرے انکے ذہن میں کچھ باتیں محفوظ ہونے لگیں۔ یہ نعرے دل سے نکلتے ہیں۔ اور اس لئے سینوں پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ کیسا سخت جان انقلاب ہے۔ اس انقلاب کو موت نہیں۔ ان نعروں کو سکون نہیں' ایک طرف انسانوں کی زندگی دوسری طرف نعرے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ پاگل سے ہوگئے۔ انھیں غیر شعوری طور پر یہ محسوس ہونے لگا جیسے گنیش نے گولی کھائی ہے۔ وہ زمین پر گر پڑا ہے۔ سینہ سے خون کا دریا ابل پڑا ہے۔ اس کے ہونٹ برابر چل رہے ہیں۔ شاید گولی مارنے والے کو گالیاں دے رہا ہو۔ جگت رام نے منھ کے قریب کان لیجا کر سنا۔ منھ سے دھیمے دھیمے الفاظ نکل رہے تھے۔ انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد اور پھر انھیں اس انقلاب سے محبت ہوگئی۔ ان کے دل نے کہا۔ یہ انقلاب بہت قیمتی ہے

اسے ہر قیمت پر خریدا جا سکتا ہے۔ یہ انقلاب ہر عمر کے لئے ہے۔ بوڑھا۔ جوان۔ بچہ۔ اس دور میں ہر شخص انقلابی ہے۔ گنیش انقلابی تھا۔ میں بھی انقلابی ہوں۔ وہ گھر سے بے اختیاری طور پر انقلاب کا نعرہ لگاکر بھاگے۔ اب انکا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سڑکوں پر مارے مارے پھرا کرتے۔ ہر شخص کو دیکھکر وہ انقلاب کا نعرہ لگاتے۔ اس نعرے سے اب انہیں کچھ سکون ملتا تھا۔ سڑکوں پر لڑکوں کا انکے پیچھے ہجوم رہتا۔ ان نعروں نے بھی تو کیا ہے۔ انسان کو مار ڈالا یا پاگل بنا دیا۔

اور پھر جب بہت دنوں کے بعد وہ گھر لوٹ کر آئے تو گنیش کے بچہ نے چوک پر انکا استقبال کیا۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ انقلابی بچے۔ اور اتنا کہہ کر انھوں نے بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ انھیں کوئی بھولی بسری کہانی آدم سے یاد آ گئی۔ وہی گنیش کے تیور بچہ کی وہی مسکراہٹ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا کی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

رفعت سروش

جوشِ آزادی

ایک گرداب کی زنجیر میں جکڑی ہوئی موج　　جب کہ زندانِ تہہِ آب میں گھبراتی ہے

توڑ کر پاؤں سے لپٹی ہوئی زنجیروں کو　　تلملاتی ہوئی پانی پہ ابھر آتی ہے

جسم کو تول کے اک بار لگاتی ہے زقند　　اور گرداب کے چنگل سے نکل جاتی ہے

جوشِ آزادئ کامل کا لئے سینے میں　　پیچ کھاتی ہوئی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے

تول کر جسم پھر اک بار لگاتی ہے زقند　　ساحلِ بحر سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے

قہقہے بھرتا ہے دریا کا اچھلتا پانی

موج پھر نرغۂ گرداب میں آجاتی ہے

پھر اسی شان سے بڑھتی ہے سوئے منزلِ شوق　　پنجۂ حلقۂ گرداب سے فرصت پاکر

کیا یہ ممکن ہے ؟ یہ مغرور، یہ خودسر ساحل

سرنگوں ہو نہ طمانچوں میں طمانچے کھا کر!!

قاضی نذرالاسلام

نیا زمانہ

مترجمہ: محمد یونس احمر

کہدو میں بیباک ہوں نڈر ہوں
دیکھو نیا زمانہ آگیا

آگیا خون میں نہایا ہوا موسم

کہدو سچے ہو حقیقت کی
آگیا خوفناک بربریت کا دور آگیا۔
دیکھو اس رت کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دیرہی ہے جس پر جنون شجاعت سوار ہے
سنو اے بہرے کی بیتیو — یہ کیسا دلشکن راگ ہے جو کانوں کے پردے پھاڑ رہا ہے
دیکھو صور بجنا شروع ہوگیا، خدا کی پکار آنے لگی!
اب دنیا تمتما اٹھی ہے — تم بھی اٹھو اور اٹھ کر
قیدخانہ کی آہنی سلاخیں توڑ ڈالو
آؤ ساری چیزیں تیاگ دیکر
پہاڑوں کی چٹانوں میں ناچو اور
برق و باد کی چیرہ دستیوں میں پرچم لہراتے جاؤ!
دیکھو طوفان کے خوفناک طمانچوں کے خوف سے
چٹانیں منہدم ہوگئیں اور آبشار پھوٹ گیا!
ہم نے اپنے پرائے سے ناتا توڑ دیا ہے
گھروں کے سارے بندھن بھی ٹوٹ چکے ہیں۔
وطن ہمارا ندیم ہے اور یہی ہماری آرامگاہ ہے!
سنو ہم اپنے ان احباب کے مردہ دلوں کو جگانے اٹھے ہیں جو
غیروں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اپنی زندگیاں برباد کردیتے ہیں
تم طوفان کی ہولناکیوں کا جھنڈا لہراتے ہوئے
شجاعت کے طبل پر آزادی کا گیت گاتے چلو اور تباہی و بربادی کا مقابلہ کرو۔

لیکن تمہارا دل بزدلی سے اس طرح کانپ اٹھتا ہے۔
جیسے موت کے احساس سے روح میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے
ہمدم اس سے بچو —!
ایکبار پھر وہی موثر نغمہ الاپو جس سے وطن کے منجمد لہو میں جوش اور روانی آجائے
ہمدم! قربانی سے کیوں ڈرتے ہو — دل اور جان کی قربانی پیش کرو!

میں پاگل اداکار ہوں
مجھے قوانین اور بندشوں سے کیا مطلب —
سنو زندگی اور موت تو میرے دوست ہیں، ان سے خوف کیسا؟
پھانسی کے ان تختوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔
میں بزدل، کمزور اور ڈرپوک نہیں!
آؤ راگ الاپتے چلیں، آزادی کا راگ —،
اب مردہ دلوں میں طمانیت آگئی ہے
جانتے نہیں راکھ کے نیچے چنگاریاں دبی رہتی ہیں۔

آؤ قبروں سے مردے اکھاڑ ڈالو، شمشان مسمار کردو
اب ہم مردہ ہڈیوں میں جان ڈالدیں گے
اور قوانین کا خاتمہ کرکے اندھیرے میں اجالا کریں گے۔
ہمدم بس اتنا یاد رکھو
مدہوشی کی موت کی کوئی قیمت نہیں
وطن کی پکار پر ہمیشہ لبیک کہو۔
اب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بیدار ہو جاؤ
دیکھو طوفانی رات کی سانس اکھڑ گئی
ماں کے لبوں پر بھی تبسم کی سنہری لکیریں پھیل گئی ہیں (براہ راست بنگالی سے)

۴۸

اشتراکی نظام

تحسین سروری

صبح نو نے کچھ عجب انداز سے چھیڑا رباب
جھلملاتے سے ستارے بن گئے ہیں آفتاب
ہر بلندی پر نظر ہے۔ ہر نظر میں ایک طور
جانے کتنی جستجوئیں ہو گئی ہیں کامیاب
خود بخود روشن ہوئے جاتے ہیں منزل کے چراغ
جانے کس دل کی تمناؤں نے دیکھا تھا یہ خواب

اب خزاں رنگیں گلستانوں پہ منڈلاتی نہیں،
چھٹ گئیں تاریکیاں، اب روح گھبراتی نہیں
اب زمانہ ہو نہیں سکتا اسیرِ اضطراب
غم عطا کر کے مسرت چھین لی جاتی نہیں
ذوق آزادی نے کچھ ایسے بچھا رکھے ہیں دام
کوئی بجلی اب نشیمن کے قریب آتی نہیں

ہر طرف نغمہ کناں بیداریوں کا ساز ہے
آندھیوں میں بھی غزلخواں روح کی آواز ہے

پریم ناتھ پردیسی

صبح و شام

صبح ہو گئی ـــــ

فروری کی میلی دھوپ کا جال تڑاخ سے کرۂ ارض پر پھیل گیا۔ اور ایک ہلکی سی بدصورت سی مسکراہٹ ہر چیز پر لوٹنے لگی۔ آؤں پر کام کرنے والے نیم عریاں مزدور، شمشان کے چوکیدار دریا کے کنارے پر بہتی لاشوں کا انتظار کرنے والے کتے اور گدھ سب اس جال کے نیچے حرکت میں آ گئے۔ اور اپنی آنکھیں کھول کر دُور دُور دیکھنے لگے۔ جدھر سے کوڑے کرکٹ اور غلاظت سے بھرے ہوئے نچو، بجر مر کرنے والے سفید کفن میں ملبوس انسانی لاشیں اور دریا کی نرم و نازک لہروں پر تیرتے ہوئے مُردار آتے تھے، دریا کے اس پار والی کولتار کی سیاہ سڑک پر مہین آنچل کی طرح ہلکی کہر سر شام ہی لپٹ گئی تھی۔ جو دھوپ کی کرنوں میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی تھی۔ کہیں کہیں ایک آدھ متنفس سر سے پاؤں تک لوئی اوڑھے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ اور دور گاجر اور پیاز کے کھیتوں سے دھواں سا اٹھنے لگا تھا۔ جو فضا میں تحلیل ہوتا جاتا تھا اور جھولوں کی ننگی شاخوں پر چڑیاں اپنے اُلجھے ہوئے فالتو پر چُن چُن کر نیچے پھینک رہی تھیں جو ہوا میں بل کھا کھا کر آوارہ ہو جاتے تھے۔

زندگی نئی صبح پر سوار ہو کر آ گئی تھی۔ اور ابھی تک جاوید بستر استراحت پر دراز چھت کی میلی کڑیوں کو بے مطلب تک رہا تھا۔ رات کو سونے سے قبل جن جذبات سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ذہن میں سنہرا جال بننا شروع کیا تھا۔ وہ ابھی تک اسے ڈھیلا ڈھیلا سا ہی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ اس میں بے شمار گرہیں آ گئی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ خواب نے کس وقت اسے اپنی آغوش میں لیکر اس کے ذہن کو مبہم فکر سے نجات دلائی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ اس نے سونے سے پہلے سارا جال کیوں نہ بُنا ـــ

دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے شیشے میں سے میلی دھوپ کی ایک لکیر اس کے

چہرے اور بستر پر پھیل گئی۔ اور وہ کروٹ بدل کر اٹھا۔ دریا کے بندھ کا شور اس کے لاشعور میں گونجنے لگا۔ اور کھڑکی کھولتے ہی اُسکی نگاہ بدصورت آوں اور خاموش مرگھٹ کے چھپر سے ٹکرائی جسکی چھت کی نئی ٹین دھوپ سے پگھلی ہوئی کُہر کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ اسے محسوس ہُوا جیسے یہ آوے آدمرگھٹ کتنے اور مزدور، بڑھتی ہوئی زندگی کے ایسے خلا ہیں، جو کبھی پُر ہی نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ کوڑا کرکٹ جل جاتا ہے، لاشیں بھسم ہوتی ہیں۔ مردار صرف پنجر رہ جاتا ہے، بھوک انتڑیاں کاٹنے لگتی ہے اور پھر سب کے سب نئے شکار، نئی بھرائی کے منتظر رہتے ہیں۔ زندگی کا ایک دن ختم ہوتا ہے۔ دھوپ کا جال ٹوٹ جاتا ہے، اور تاریکی سسکتے ہوئے لمحوں کی سلائی سے زندگی کی تھکی ہوئی آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے۔

جاوید کمرے سے نکلا۔ اور سڑک پر آیا۔ زندگی کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں اور دیہات سے آنے والی کچی اور پکی سڑکوں پر مرد اور عورتیں شہر کی طرف آنے لگے تھے۔ سر پر سر گٹھیں، ساگ سبزی اناج، دودھ اور مچھلیوں کے ہلکے پھلکے بوجھ لئے ہوئے، کچھ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے، اور کچھ اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے رہے تھے۔ ایک دریا سا تھا جو بہ رہا تھا۔ جس میں بوجھ اٹھائے ہوئے مرد اور عورتیں اُن لاشوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جن کا انتظار آوں کے دامن میں پھیلی ہوئی ریت پر سکتے اور گدھ کرتے رہتے تھے۔

جاوید کا ذہن بیدار ہو گیا۔ وہ سڑک پر ٹہلنے لگا۔ اُسے دنیا آپ بھی بہتا ہوا لاشہ سا دکھائی دیا۔ لیکن کسی خلا کو پُر کرنے کے لئے؟ دیہات سے آنے والے مرد اور عورتیں شہر کے خلا کو پُر کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ اسکی زندگی، اسکی جذبات پرست زندگی کسی خلا کو پُر کرنے کے لئے حسین سُرمئی سڑک پر بہی جا رہی ہے۔ کیا کہیں آس پاس ہی کوئی سرد آوا، کوئی خاموش مرگھٹ، کوئی مریل سا گدھ اُس کی تاک میں تھا؟ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دریا بہ رہا تھا۔ اور دریا سے پار نیم عُریاں مزدور کوڑے کرکٹ کے ٹوکرے اٹھائے آوں کے شکم پُر کر رہے تھے۔ نیچے نو بالغ کا شمشان دھوپ میں نہا رہا تھا۔ ننگی شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں اڑ گئی تھیں۔ چونگی کی چوکی پر میلے کچیلے منشی بھاری بھر کم کتابوں پر جھک گئے تھے۔ اور پاس ہی پیاز کے کھیتوں میں قرمزی پیرہن پہنے ایک حسین عورت اُسے گھور رہی تھی۔ جاوید کی نگاہیں

اس کے ساتھ ٹکرائیں اور پلٹ آئیں — پھر ٹکرائیں — اور پھر وہ حسین عورت پیاز کے ننھے ننھے پودوں کو اپنے پاؤں سے روندنے لگی۔ جاوید کو محسوس ہوا۔ جیسے یہ گورے گورے پاؤں اس کے سینے پر ایک ہلکا اور میٹھا بوجھ بن کر آ گئے ہیں۔ وہ اُسے دیکھتا رہا اور اس کے گندمی حسن اور دلفریب نقش و نگار کا تجزیہ کرنے لگا۔ کاش امین نے اُسے رات کو دیکھا ہوتا تاکہ اس کا سنہرا جال مکمل ہو جاتا۔ عورت ابتک سر جھکائے کھڑی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسکی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالتی تھی۔ اور اسوقت جاوید کو اپنے دل میں جھٹکے کا سا احساس ہوتا تھا۔ معًا چونگی کی چوکی پر شور رسا برپا ہوا۔ لوگ ٹوٹے ہوئے دایروں کی شکل میں چوکی کے آگے جمع ہو گئے تھے۔

"چور ہے سالا — سرکار کو دھوکا دینا چاہتا تھا"

"دو چھ انڈے کس صفائی سے اپنی جیب میں چھپا رکھے تھے۔"

"اس کا چالان کر دو۔ ایسے کو چھوڑنا گناہ ہے"

چھ انڈوں کو چھپانے والا غنیمت مان رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ سرگین سے بھرا ہوا اسکا تھیلا سڑک پر گر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میلے کپڑے کی وہ چادر بھی جو اُس نے دستار کے طور پر باندھی تھی، جیب میں چھپائے ہوئے انڈوں نے اُسے چوراہے پر ننگا کیا تھا۔ اور سرکاری مالیہ کے محافظ اسکی بے حرمتی اور عریانی پر قہقہے لگا رہے تھے۔ تماشہ دیکھنے والوں میں سے اکثر اسکی دیدہ دلیری اور ہاتھ کی صفائی پر اپنی انگلیاں چبا رہے تھے۔

"پکا بدمعاش ہے"

"کتنی دفعہ دھوکا دیا ہے"

"سُنار کے سو لوہار کا ایک، اب حضرت کو چالاکی کا بھاؤ معلوم ہوگا"

چھ انڈے چھپانے والا کبھی ایک کے پاؤں پکڑتا تھا اور کبھی دوسرے کے۔ اور پھر رحم جویانہ نظروں سے جمع ہوئے تماشہ بینوں کی طرف دیکھتا تھا۔ وہاں کسی کو اپنا ہمدرد نہ دیکھکر دوبارہ چپڑاسی کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔

"یہ بیمار کے لئے ہیں چپڑاسی جی، خدا کی قسم میں چور نہیں ہوں"

"حرامی اب بہانے بنانے لگا"
"بہانہ نہیں چپڑاسی جی۔ میری گھر والی بہرآر کے ہسپتال میں ہے۔ ڈاگڈار (ڈاکٹر) نے اُسے انڈے کھانے کو کہا ہے"
چپڑاسی زور سے ہنسا۔ جیسے کہ رہا ہو۔ یہ مُنھ اور مسور کی دال، تمھاری گھر والی اور انڈوں کی فرمائش
"اَبے حرامی جھوٹ پر جھوٹ کیوں بولتا ہے"
جاوید اب تک دُور سے یہ باتیں سُن رہا تھا۔ تو اب آگے بڑھا۔ اس کے منہ میں بے شمار باتیں جمع ہو گئی تھیں، جنھیں وہ اُگلنا چاہتا تھا ـــ
ایک موٹر کار بھوں بھوں کرتی ہوئی چبوترے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تماشہ بین چند قدم پیچھے ہٹ گئے، اور پھر ایک لہر کی طرح واپس آ گئے۔
کار کی پچھلی سیٹ سے ایک انگریز شکاری نے کتابوں پر جھکے ہوئے منشی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ منشی نے جلد جلد کرسی پر اپنی ٹوپی پھینک دی۔ اور پگڑی کو ٹھیک کرتا ہوا، کوٹ کے بٹنوں کو کاج میں بند کرتا ہوا اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"ویل بابو، ہمارے پاس چھ گنیر (Gunners) ہیں اور چار ڈزن انڈے"
"چھ گنیر اور چار درجن انڈے ــــ؟"
"ہاں ہاں، ہم نے خود مارا ہے ہوکر لیک (HOKAR LAKE) میں۔ یہ سب ہمارا پرسنل ہے"
"پرسنل ــــ؟ لیکن حضور انڈا ــــ"
"اوہ ــــ وہ ہمارا میم صاحب کو بڑا پسند ہے۔ وہ انڈا دیکھکر بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہم نے اُس کے واسطے ایک مسلمان سے خریدا ہے ــــ"
"دو آنے حُضور ــــ!"
"دو آنے! کیوں؟ یہ ہمارا پرسنل ہے"
"بہت اچھا حضور ــــ"
"تھینک یو ــــ"
کار فرّاٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف دوڑی۔ منشی خوش خوش اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

کتنے نیک لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں چھپاتے" اُس نے تماشہ بینوں اور چپڑاسیوں سے کہا"
ورپھر چار درجن انڈے اِن لوگوں کے نزدیک ہونے ہی کیا ہیں — وہ دن کی خوراک!"
یک نہ ہوتے تو دنیا پر راج کیسے کرتے!" ایک بوڑھے مسلمان نے کہا" خدا نیتوں کا پھل دیتا ہے"
یہ انڈے چھپانے والا چور اپنے دونوں ہاتھ مَل رہا تھا۔ منشی نے اسے دیکھا۔ اور رعب دار لہجے میں کہا
لا ایک پیسہ دے" آئندہ پھر ایسی کوشش کرے گا تو کھال اُتار دونگا"
ایک پیسہ؟ خدا کے لئے معاف کرو گنڈروان صاحب"
ایک چپڑاسی نے آگے بڑھ کر اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا" حرام زادہ۔ اب محصول کے لئے بھی نخرے کرتا ہے"
اُس نے ایک میلے رومال سے ایک پیسہ نکالا۔ اور منشی کے ہاتھ میں دیا
کان پکڑ — اب آئندہ چوری نہیں کرونگا" منشی نے پیسہ لیتے ہوئے کہا۔
اُس نے دونوں کان پکڑے۔ پھر دستار باندھی، سرکین کا ٹھیلا سر پر اٹھایا اور شہر کی طرف چلا گیا سرمئی سڑک پر کار کے پہیوں کی دو لکیریں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ وہ اُن سے بچتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے ہولیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انجانے میں نیک لوگوں کی لکیریں اُس کے ننگے پاؤں سے روندی جائیں۔ ہجوم منتشر ہوگیا۔ تجربہ کار منشی کے انصاف اور تدبر پر سب حیران رہ گئے۔ کیسی اندر آدم دوست اور ترس کھانے والا بندہ ہے۔ چور کو پکڑ کر چھوڑ دیا۔ اور صرف محصول کا ایک پیسہ وصول کرکے حالانکہ وہ اُس کے خلاف مقدمہ بنا سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ وہ اسکی کہانی سُن کر خدا کے آگے کیا جواب دیتا۔ جب اُس نے کہا تھا۔ کہ ڈاکٹر نے میری بیمار بیوی کو انڈے کھانے کی تجویز کی ہے۔

جاوید کے منہ میں جمع ہوئی باتیں، ریت میں پانی کی طرح اندر ہی اندر جذب ہوگئیں۔ امتیاز کے واضح تاثرات نے اُس کے ذہن کو دوبارہ منتشر کردیا۔ اور پھر نیک اور بد کا فلسفہ' خدا اور نیت کا واسطہ! اس کے محسوسات میں آگ سی لگ گئی۔ کیا یہی سرکاری مالیہ کا تحفظ ہے۔ کہ کار میں بیٹھے ہوئے انگریز سے کچھ بھی نہ لیا جائے اور ایک غریب کو ایک پیسے کے لئے خوار و ذلیل کیا جائے۔
آپ انگریز سے آپنے کچھ بھی نہ لیا منشی صاحب!" اُس نے منشی سے زہر خندہ کرکے پوچھا۔
منشی نے گردن اوپر اٹھا کر کہا۔ اُس کے پاس تھا کیا —؟

گنیز تھے 'چار درجن انڈے تھے ۔' جاوید نے اسی انداز میں کہا ۔
لیکن وہ اسکی پرسنل چیزیں تھیں ۔ اور پرسنل چیزوں پر محصول نہیں لیا جاتا " منشی نے فخریہ انداز میں کہا
"چار درجن کے مقابلے میں صرف چھ انڈے پرسنل نہیں ہو سکتے تھے ؟" اس نے دوبارہ پوچھا
منشی مسکرا دیا ۔ بولا " آدمی کی پوزیشن دیکھ کر پرسنل کا معیار قایم کیا جاتا ہے ۔ یہ تو صاف چور تھا "
جاوید نے طنز آمیز قہقہہ لگایا ۔ اور اپنے آپ "پوزیشن" کا لفظ دہراتا ہوا پیاز کے کھیتوں کی طرف چلا
گیا ۔ منشی نے اس کا طنز محسوس کیا ۔ اسے اپنے منہ پر کسی کا لگایا ہوا تھپیڑ سا محسوس ہونے لگا ۔ لیکن جاوید
جا چکا تھا ۔ اور دور سڑک کے کنارے پیاز کے کھیت کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ جہاں حسین عورت کے آگے ایک
مرد غصے سے کانپ رہا تھا ۔
"کیا کر رہی تھی وہاں ؟"
"تماشہ دیکھتی تھی "
تماشہ ۔ کیا بندر ناچ رہا تھا ؟
"گذروان نے چور پکڑا تھا ۔ چھ انڈوں کا چور "
"چپ مالزادی ۔ مجھے بہکا رہی ہے ۔ میں سب کچھ دیکھ چکا "
حسین عورت سہم گئی ۔ پیرہن کا قرمزی رنگ فیک کراس کے چہرے پر آبیٹھا ۔ اور وہ سر سے پاؤں
تک اسی تھرتھراتے ہوئے رنگ میں ڈوب گئی ۔
"کیا دیکھ چکے ۔۔ ؟" عورت نے مضبوطی سے پوچھا
"مرد کو عورت کا یہ سوال بہت ناگوار گذرا ، اس نے اس کے بائیں گال پر ایک طمانچہ رسید کیا " کنجری ،
مجھے سبق سکھاتی ہے ۔ ہم وہاں پنیری کا انتظار کرتے ہیں ۔ اور تو یہاں آنکھیں لڑاتی ہے "
عورت رونے لگی ۔ مرد نے اس کا گریبان پکڑا اور اسے گھسیٹ کر لے گیا ۔ اور جاوید صم' بکم' ہو کر انھیں
دیکھنے لگا ، اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ عورت کا قصور کیا تھا ۔ اسے مرد پر غصہ آیا ۔ اگر اس کا بس چلتا ۔ تو اسے
وہیں گولی سے مار دیتا ۔ جس نے لڑکی کو دور سے محض تماشہ دیکھنے کے لئے اتنی فحش گالیاں دی تھیں ۔
اور پھر طمانچہ ۔۔۔! کیا عورت موم کی گڑیا ہے ۔ جو آنکھ کے ایک اشارے سے پگھل سکتی ہے ۔ کیا مرد
اپنے آپ کو اسقدر ذمہ دار سمجھتا ہے ، کہ عورت کا تماشہ دیکھنا تک ، اسکی ذمہ داری برداشت نہیں

کر سکتی ؟ نئی دنیا کو تعمیر کرنے والے غلاموں کے یہ مزدور خدا کب تک اپنی شہ زوری پہ ناز کرتے رہیں گے
وہ انہی جذبات کے سیلاب میں بہتا ہوا دریا کی طرف آیا۔ کوڑا کرکٹ ڈھونے والے کچھ مزدور ریت
پر۔ کچی اینٹوں کی قطاریں لگا رہے تھے۔ اُن سے ذرا دور اُن کا ایک ساتھی چولہے پر چائے بنا رہا تھا
تھوڑے فاصلے پر چند کتے پانی میں تیرتے ہوئے مردار کو کنارے کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ اور ساتھ
ہی ساتھ ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے۔ فضا میں مکروہ صورت سفید گدھ ننگی گردنیں جھکا کر منڈلا
رہے تھے۔ اور بار بار لڑنے والے کتوں پر جھپٹنا چاہتے تھے۔ بالآخر لاش کنارے پر آ گئی۔ کتے اور
گدھ دونوں اُسی پر پل پڑے۔ اس امتیاز کے باوجود کہ ایک خشکی پر دوڑ سکتا تھا اور دوسرا صرف
ہوا میں۔

جاوید بے زبانوں کی اس اشتراکیت پر حیراں رہ گیا۔ مکروہ مردار نے دونوں کی ہستیوں کو فنا
کر دیا تھا۔ اور خودی، برتری اور کمتری کے جذبات یکسر مٹا دئے تھے۔ آخر کیوں — ؟ کیا مردار اتنا
میٹھا ہوتا ہے کہ کسی دوسری لذت کو محسوس کرنے کی قوت ہی سلب ہو جاتی ہے۔

وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب باہر کوئی رعنائی نہ تھی۔ کم از کم جاوید کے لئے نہ تھی۔
اس بڑھتی ہوئی زندگی میں بھی نہیں، جو دیہات سے آنی والی کچی اور پکی سڑکوں پر رواں تھی، جو چونگی
کی چوکی کے سامنے خوار و ذلیل ہوتی تھی، جو پیاز کے کھیتوں میں گھسیٹی جاتی تھی۔ جسے ہڑپ کرنے کے
لئے بدصورت آدمی، خاموش شمشان اور دریا کے کنارے ہر وقت منتظر رہتے تھے۔

وہ اپنے دل کو بہلانے کے لئے اہرن برگ کا تازہ ناول پڑھنے لگا۔ لیکن حروف ایک دوسرے سے
ملے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے پر چپٹے ہوئے سے دکھائی دئیے۔ اُسے ایسا نظر آیا، جیسے سیاہی کی بے شمار
سیدھی لکیریں کتاب کے صفحوں پر کھچی ہوئی ہیں۔ جن کے کوئی معنی نہیں۔ بے مطلب سی لکیریں جیسے کسی
ضدی بچے نے کھینچی ہوں۔ ناچار اُس نے کرسی پر کتاب پھینک دی۔ اور چار پائی پر دراز ہو کر چھت
کی کڑیوں کو دیکھنے لگا۔ متوازی اور سیدھی کڑیاں جو مل کر بہت بڑی عمارت کا بوجھ سہارے ہوئے تھیں
کاش دنیا میں کڑیاں ہی کڑیاں ہوتیں، اسی طرح متوازی اور سیدھی، جو نئی تعمیر کا بوجھ سہار سکیں
اور انھیں دیکھنے والا مبہوت و حیران رہ جاتا۔

اُس کے ذہن سے باریک باریک سے تار نکلنے لگے، اور وہ اُن سے جال بننے لگا۔ امیدوں کا
سنہرا جال، خواہشات کا جال۔ لیکن یہ تار کہیں کہیں ٹوٹ جاتے تھے۔ اور وہ خود بے بس مکڑی کی

طرح لٹک جاتا تھا۔ سماج کی قدریں ان تاروں کو آگے جانے سے روکتی تھیں۔ لیکن وہ پھر بھی کوشش کرتا رہا۔ جتنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے آتی ہوئی میلی دھوپ اس کے سر کے اوپر سے گذر کر نکل گئی۔ اور اُسے ہوا کے ایک جھونکے سے سردی کا احساس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکلی ہوئی دھوپ کا بھی ــــ ! اس نے اٹھکر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کچھ مزدور کوڑا کرکٹ ڈھو رہے تھے۔ کچھ کچی اینٹیں بنا رہے تھے۔ دریا کے کنارے سے منہ کھولے ہوئے آوے تک پاؤں کے نشانوں کی پگ ڈنڈی سی بن گئی تھی۔ جو آوے کے کھلے منہ پر ختم ہوتی تھی۔ جہاں ایک خوش پوش انسان ایک مزدور سے باتیں کر رہا تھا۔ شاید وہ آوے کا مالک تھا۔ اور کام کی رفتار دیکھنے کے لئے آگیا تھا۔ باقی مزدوروں میں اسکی موجودگی سے کافی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اور سب کے سب مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔ چائے پکانے والا مزدور چولھے پر مٹی کی ہانڈی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا شاید مالک کو دیکھتے ہی کام کرنے لگا ہے۔ مٹی کی ہانڈی سے بھاپ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اور چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیاں آہستہ آہستہ بجھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد آوے کا مالک چلا گیا۔ اور تمام مزدور اچھلتے کودتے کچھ اینٹیں بنانے والا کے گرد جمع ہو گئے اور خوشی کے اظہار میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ ہوا میں خالی ٹوکرے اور پھٹی پرانی بوریاں لہرانے لگے۔ چائے پکانے والا مزدور جلد جلد چولھے کی طرف متوجہ ہوا لکڑیاں پھر سے چیخ چیخ کر جلنے لگیں۔ اور ہانڈی کے نیچے شعلوں میں شاعری کرنے لگیں۔ شاید وہ بھی مالک کے چلے جانے پر مسرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ جاوید کے ہونٹوں پر خود بخود ہنسی آگئی۔ اس دنیا میں خوشی کا فلسفہ کسقدر غلط ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ خصوصاً اس خوشی کا جو حقیقت میں خوشی نہیں ہوتی۔ ظلم ہوتا ہے۔ جبر ہوتا ہے۔ اُسے ایک بہت بڑے غیر ملکی مفکر کا مقولہ یاد آگیا۔ ہماری ہنسی ہمارے آنسوؤں کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ جو آنکھوں کی بجائے ہونٹوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مزدوروں کا ایک دوسرے کو گالیاں دینا، ہوا میں خالی بوریاں اور ٹوکرے پھینکنا آنسوؤں کی بدلی ہوئی صورت تھی۔؟ اُسے محسوس ہوا۔ جیسے دریا کے پار سے سب مزدور ایک آواز میں چیخ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں۔ احتجاج کر رہے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بہت بڑے آوے کا بوجھ سہارا ہوا تھا۔ لیکن وہ چھت کی کڑیوں کی طرح نہ متوازی تھے نہ سیدھے۔ انکی زندگیاں بیل میں خم تھے۔ اُن کی قسموں میں خم تھے۔ اور کیا تعجب ہے۔ ۔

خم سائے آتے ہی کو گراتے۔ ایسا گراتے کہ اسکی جگہ لاکھوں خوش پوش انسان بھی نیا آوہ نہ بنا سکیں۔ لیکن کب ـــ ؟ کیا کسی جھٹکے کی ضرورت تھی۔ ؟ جو چاروں دیواروں کو اور خم دار کڑیوں کے سہارے ہوئے مکان کو زمین بوس کراتے ؟

یہی سوچتے سوچتے اسکی آنکھ لگ گئی۔ وہ سوگیا اور باہر لمحے پر لمحہ گذرتا گیا۔ اور دھوپ کا جال ٹیڑھا ہوتا گیا۔ جب وہ جاگا۔ تو دن بہت آگے نکل چکا تھا۔ اور پہاڑوں پر صبح کا شکاری اپنا جال سکھا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ خدا جانے اسے اس کھڑکی سے محبت سی کیوں ہونے لگی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ کُتے جا چکے تھے۔ گِدھ ذرباغ کے ننگے چناروں پر اونگھ رہے تھے مزدور کیچڑ سے لت پت ٹانگیں دھو رہے تھے۔ اور کنارے پر گھسیٹا ہوا مردار سفید ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

باہر سڑک پر زندگی کا شور دھم پڑا تھا۔ البتہ دریا اسی روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اور اس کے بہنے کا نغمہ ہر لمحہ بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ اُسے یاد آگیا۔ کہ اُس نے صبح روٹی بھی نہیں کھائی تھی۔ سوچنے کی عادت نے جواب اسکی فطرتِ ثانی بن چکی تھی۔ اسے اپنی زندگی سے کتنا بے پرواہ بنا دیا تھا۔ یکا یک اُس کے کمرہ کا دروازہ کھُلا۔ اس کا بڑا بھائی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جاوید ـــ !"

جاوید اُٹھ بیٹھا ـــ

تم دن کو بھی سوتے ہو ـــ ؟

جاوید نے کوئی جواب نہ دیا۔

"صبح تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی" ؟

"بھوک ہی نہ تھی"

"میں سب کچھ جانتا ہوں"

جاوید کی آنکھیں حیرت میں گیند کے برابر ہو گئیں

"آج صبح تم سڑک پر کیا کر رہے تھے ؟"

"کچھ بھی تو نہیں ـــ !"

"جھوٹ - میرے منشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے ؟"

"شاید آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے - میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی ؛"

"لیکن تم کوارٹر سے باہر گئے ہی کیوں ؟"

جاوید کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا " کیا میں قیدی ہوں ؟" اس نے اپنے آپ میں مضبوطی پیدا کر کے کہا

"جہاں میری عزت کا سوال ہو - وہاں اس بھی زیادہ —— !

اُکا بڑا بھائی یہ کہہ کر غصے سے باہر نکلا - اور جاوید اپنے آپ سے ہکتا رہا - "اُس بھی زیادہ " مگر کیوں اِس لئے کہ جنتِ ارضی کے اِس پائیں حصہ میں مردار زیادہ ہوتے ہیں اور زندہ کم !

اُس کے جذبات میں آگ لگ گئی - میں کسی کا قیدی نہیں ہوں - مجھے آزادی کا حق ہے - میں اپنی تمام لذات کو فنا نہیں کرنا چاہتا - میں زندگی کے اقدار کو جانتا ہوں - زندگی کی حقیقی مسرتوں کو سمجھتا ہوں - اور کسی کے تمام حِس فنا ہو چکے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اوروں کو بھی یہی درس دیتا پھرے - تمھیں اپنی سرپرستی کا غرور ہے تو جاؤ مجھے اسکی بھی ضرورت نہیں - میں سرپرستی کے بغیر ہی زندگی سے اپنے لئے جدوجہد کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں - تمہارے مُنہ سے وہی بُو آتی ہے ' جو آدں کے دھویں سے آتی ہے - جو گدھیوں کی ننگی گردنوں اور سرخ چونچوں سے آتی ہے -

وہ تڑپ کر اٹھا - اپنا بستر باندھا - اور باہر نکلا - جہاں رات کی مشاطہ سسکتے ہوئے لمحوں کو کاجل میں ڈبو رہی تھی - باہر منشیوں نے اسے بستر اٹھائے ہوئے دیکھا - تو وہ حیران ہو گئے - اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگے " بڑا مغرور بنا پھرتا تھا سالا —— دو چار دن اور ٹھہرتا - تو کسی سے محصول بھی وصول نہ کرنے دیتا —— ہی ہی ہی "

اس نے تانگے والا کو آواز دی - اور تانگے پر بیٹھکر جب اس نے مڑکر دیکھا تو چونگی کے منشی سائے ننگے چناروں پر اونگھتے ہوئے گدھوں کی طرح نظر آئے - اور دریا سے پار آدں پر ایک موہوم خاموشی اور جمود دکھائی دیا - زندگی کے اِن منہ کھولے ہوئے خلاوں کا یہی علاج ہے کہ ان پر ہمیشہ کے لئے موت کا سا جمود چھایا رہے "

اُس نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا " تاکہ زندگی ان کی مداخلت کے بغیر ہی دریا کی نرم و نازک لہروں کی طرح کمروہ مرداروں اور لاشوں کو بہائے بغیر آگے بڑھے - آگے بڑھے

— اور بڑھتی ہی رہے —— "

وہ چلا گیا —— اور پھر شام ہو گئی —— !

زندگی کی تھکی ہوئی آنکھوں میں رات نے کاجل لگا دیا تھا —— !

عبدالقادر سروری

فراق کی غزلیں

شعلۂ ساز اردو کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے، اور کئی اعتبار سے قابل توجہ ہے۔

اردو غزل گوئی کا رنگ حالی کے بعد سے کچھ پھیکا سا پڑنے لگا تھا، اور درمیانی دور میں، جو ایک طرح پر پچھلے عصر کی اصلاحی تحریکات اور خصوصاً چند فکری نقاط کے ردّعمل کا دور تھا، نیز موجودہ دور میں غزل مقبول تو رہی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نظم کے تنوع اور اس کی مقبولیت کے مقابلے میں غزل جلد ہی اردو ادب کے لئے ایک بھولی ہوئی صنف ہو کر رہ جائیگی لیکن اردو غزل کی یہ خوش نصیبی تھی کہ حالیہ دور میں ایک طرف تو علامہ اقبال کے اثر سے اس کا پایہ کچھ بلند ہونے لگا تھا دوسری طرف اس دور میں کچھ شاعر ایسے بھی پیدا ہوگئے جنھیں غزل سے خاص لگاؤ تھا اور انھوں نے غزل کی اصلاح اور ترقی پر کمر ہمت چست باندھ لی۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر مولانا حسرت موہانی ہیں، جنھوں نے غزل کو ایک طرف تو میر کے سادہ اسالیب کی طرف لوٹانے کی کوشش کی، دوسری طرف اپنے عصر کے خیالات اور فکر کے مخصوص انداز کا اس میں پیوند لگا کر اردو غزل کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ حسرت موہانی کے دوش بدوش صفی اور عزیز لکھنوی نے بھی لکھنو کی غزل کے مخصوص انداز کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور نہ صرف ان کی بلکہ ان کے تلامذہ جیسے جعفر علی خاں اثر وغیرہ کی مساعی کے سبب لکھنؤ میں غزل گوئی کا احیا ہوسکا۔

حسرت موہانی نے غزل کے نئے دبستان کی جو بنیاد رکھی تھی، اس کا ارتقا فانی۔ اصغر اور جگر کی غزل گوئی میں نظر آتا ہے۔ فانی پر غالب کے دبستان کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔ گو اس رنگ کو

شعلۂ ساز۔ از فراق گورکھپوری (مکتبہ اردو، لاہور) قیمت چار روپیئے

مرتبہ

روا پنے مخصوص انداز سے برت گئے۔ اصغر بھی غالب کے اثر سے بالکل کورے نہیں تھے تاہم
ن کے مخصوص ترنم، فلسفیانہ اور متصوفانہ رجحانات نے ان کی غزل کو دوسرے معاصرین
سے ممیز کر دیا۔ جگر کی غزل کا رنگ ان سب سے الگ ہے۔ اس میں میر کی سادہ بیانی کے ساتھ
ساتھ جذبات کی گہرائی اسالیب کا تنوع اور زبان اور خیال کے ارتقا کا پورا عکس موجود ہے ایک بات
جو ان سب غزل گو شعراء میں مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے پاس غزل کی اہمیت کم سے کم نہ
گئی ہے

اصغر، فانی اور جگر کے بعد بلکہ خود ان کے زمانے کے آخری ایام سے اردو ادب اور
شاعری میں، نئی تحریکیں رونما ہونے لگیں، جو کچھ تو بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھا
اور کسی حد تک اس عصر تک اردو شعری فکر میں جو ارتقا ہو چکا تھا وہ بھی اس کا ذمہ دار تھا۔
اس دور کے نمایاں غزل گو شاعر، فراق گو رکھ پوری ہیں، جن کے ہاتھوں میں غزل ایک دفعہ پھر
خاموش انقلاب کی طرف قدم بڑھاتی دکھائی دیتی ہے، اور نظم کے دوش بدوش نئی تحریکوں
سے ہم آہنگ ہو کر خیال اور ادب و اسالیب کے ارتقا اور ایک حد تک موجودہ ادبی رجحانات
کی وہ جھلک پیدا کر لی ہے، جس کی وسیع نمائندگی اس دور کا ادب اور شاعری کر رہے ہیں۔
اس طرح اُردو غزل، پھر ایک مرتبہ نظم کے مقابلے میں مسابقت پر کمر بستہ دکھائی دے
رہی ہے۔ لیکن نئی تحریکوں کا اثر فراق کی غزل میں سطح پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے تار و پود میں سرایت
کئے ہوئے ہے اور یہ مشکل کام اس طرح آسان ہو سکا کہ فراق کو غزل کی شاعری سے خاص لگاؤ
ہے وہ غزل کے اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے بنیادی عناصر پر بھی مشاق اساتذہ کی
طرح حاوی ہیں۔ اردو سخن گوئی کے ارتقا کی تاریخ میں فراق کی غزل ایک نیا نشان راہ دکھاتی
ہے اور اس امر کی عمدہ مثال پیش کر رہی ہے کہ ایک فطری شاعر جس نے غزل کی حقیقی فضا
میں پرورش پائی ہو، ماحول کی گوناگوں شعری تحریکوں کو اپنے فن کے تانے بانے میں جذب کر کے
غزل کی صنف کو ایک زندہ دلچسپی بنا سکتا ہے۔

فراق کا دور اگلے تمام اساتذۂ غزل سے مختلف ہے۔ اس دور کے خمیر میں بغاوتوں
کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ سماجی اور سیاسی حالات اور زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ

عناصر کے احساس اور معیار اور اظہار کے سانچے بھی بدل رہے ہیں۔ ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر ادبی اصناف اور اظہار میں من مانے انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والوں سے قطع نظر کرکے بھی جن کی شاعری میں اگر کچھ جان ہے تو نشریاتی اور ادعائی جذبے کی شعوری تحریک سے ضمحل ہوکر رہ جاتی ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ ان تحریکات سے کوئی شاعر، بجز اس کے وہ بیٹے کا اندھا ہو، متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ لیکن ادب ایک ارتقائی ادارہ ہے، اس میں کوئی ایسا انقلاب کامیاب نہیں ہوسکتا جو تفہیم و ترسیل کے سارے اشارات کو چوپٹ کردے۔ فراق کی غزل، اس صنف کے سارے اصطلاحی لوازم کی تکمیل کرتے ہوتے بھی، معنوی لحاظ سے ایک خاموش انقلاب کے عناصر اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ اس کا رشتہ ایک طرف تو اس زمانے کے مخصوص فکری انداز سے استوار ہے، دوسری طرف غزل کے منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدت فکر کا ایک احساس جاری نظر آتا ہے۔ انھوں نے غزل کو بعض نئی بحروں سے روشناس کرنے کی بھی کوشش کی ہے، جس کا محرک نئی تحریکات کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ چند نئے الفاظ بھی انھوں نے استعمال کئے ہیں جو ہندی شاعری سے ماخوذ ہیں۔ ممکن ہے کہ اردو خواں ان میں پہلے پہل کچھ اجنبیت سی محسوس کریں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اردو غزل میں اسی طرح گھل مل جائیں گے جس طرح بہت سے عربی اور فارسی کے الفاظ گھل مل گئے ہیں۔ نئے احساسات عموماً اپنے ساتھ نئی لفظیات اور اظہار کے نئے سانچے بھی لاتے ہیں اور اچھے الفاظ اور ترکیبوں کے لئے اردو کا آغوش ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔

فراق انگریزی ادب اور شاعری کے بھی اچھے عالم ہیں۔ اس لئے غیر شعوری طور پر ان کی فکر پر جا بہ جا، انگریزی شاعری اور غالبًا انگریزی کے توسط سے مغربی شاعری کے نئے انداز کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ فراق کی غزل اکثر ایک بے عنوان نظم ہوتی ہے احساس کی انفرادیت اور پاکیزہ ذوق کے جیسے نمونے بعض وقت ان کی غزل میں نظر آتے ہیں معاصرانہ غزل میں کم دکھائی دیں گے۔ فراق کی شاعری محض اسالیب کی شاعری نہیں ہے بلکہ خیال کی رعنائی، شگفتہ تشبیہوں اور بلیغ استعاروں کی شاعری اور ترنم کی شاعری ہے۔ وہ نئے دبستان کی شاعری ہے، جو شعریت اور کسی طرح کی اہمیت میں پیوند

کا نگاہ بھی ہے۔ قلبی کیفیات کو ادا کرنے کے لئے فراق کا ذوق نئے نئے اسالیب اور دلکش سانچے مہیا کر لیتا ہے۔ راز دل کو باتوں باتوں میں کہہ جانے کا انھیں خوب ڈھنگ آتا ہے۔ اس شاعری میں صناعی بھی ہے، لیکن اس صناعی کو علم بدیع کی ٹھونس ٹھانس سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ یہ نازک نفسیاتی کیفیتوں کے اظہار اور تشبیہوں اور استعاروں کی تازگی کی صناعی ہے۔

ان جدید غزل گو شعرا کے کلام کو دیکھتے ہوئے، ایک طرف تو اردو زبان کی ان وسعتوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے، جو خیال کی نزاکتوں اور فکر کی گہرائیوں کے لئے اس میں موجود ہیں، دوسرے اس چیز کا بھی ایقان ہوتا ہے کہ غزل ماحول کے نکھری شاخوں کو اپنے اندر جگہ دے کر ہر زمانے اور ہر دور میں اردو شاعری اور خاص طور پر غنائی طرز کی شاعری کا نہایت دلکش مظہر بن سکتی ہے۔

کسی جدید شاعر کے بارے میں بھی، خواہ وہ جدت پسندانہ افراط و تفریط کے کسی حدود تک کیوں نہ پہنچ جاتا ہو، یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس زمانے فکر اور اسالیب کے اگلے ذخیروں سے استفادہ ہی نہیں کیا۔ اس اعتبار سے اگر فراق کے پاس بھی غزل گو شعرا کے عام مضامین موجود ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حسن و عشق کی نیرنگیاں ساری دنیا کی غنائی شاعری کی طرح غزل کا خاص موضوع ہیں۔ فراق کی غزل بھی اس حکم سے خارج نہیں ہے، لیکن ان کا انداز بیان بلکہ ان کی فکر کے زاویے ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دماغ سے سوچنے والے شاعر ہیں۔ چنانچہ غالب کی زمینوں میں جو چند غزلیں انھوں نے کہی ہیں، ان سے اس بات کا پتہ چل سکتا ہے۔ بعض مضامین کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ غالب نے ایک بات کہی تھی ؎

"صحرا میں لے خدا کوئی دیوار بھی نہیں"

یہی بات فراق کی زبان سے سنئے ؎

سر بھی انھیں ملا در و دیوار بھی مگر کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

عاشقانہ گوئی کی طرف، فراق ہمیشہ جذبات کے تجربے اور نفسیاتی تحلیل کے احساس کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ اس لحاظ سے قدیم اساتذہ کی عاشقانہ گوئی سے ان کا انداز فکر مختلف

ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں جذبات اور احساسات کے نازک فرق کو قلمبند کرنے میں ہمارے عصر کی سی کاوش کا ثبوت ہمیشہ نہیں ملتا۔

فراق کی حسن کاری اور صناعی کا ایک مخصوص انداز ہے، جسے ہم "تضاد اظہار" سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ان کے بعض بہترین اشعار وہی ہیں، جن میں یہ صنعت موجود ہے مثال کے لئے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

آؤ اس تنگنائے دنیا کی		وسعتِ بیکراں میں کھو جائیں

تھی غرورِ حسن میں بھی اک ادائے انکسار		عجز میں بھی عشق کا انداز گستاخانہ تھا

میں سکون مضطرب ہوں اضطراب پر سکوں		ہاں مجھی میں عشق کے اسرار پنہاں دیکھئے

لطفِ مرگ ناگہاں کیف حیات جاوداں		اس نگاہِ ناز میں دونوں کو پنہاں دیکھئے

آئے گنہ گارانِ محبت		نادم نادم، نازاں نازاں

یہ تضاد بعض وقت اس وجہ سے رونما ہوتا ہے کہ شاعر عاشقانہ اصطلاحوں میں رازہائے حیات وکائنات کو فاش کرنا چاہتا ہے، لیکن کبھی کبھی فلسفیانہ وسعتِ نظر اور احساس کی نزاکت بھی اس کا سبب بن جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے ان قارئین کے لئے، جن کے ذہن فوراً اس تضاد احساس اور اظہار سے وراء الورا پہنچ کر معنوی یگانگت اور نزاکت کو نہیں تاڑ سکتے۔ کہیں کہیں ابہام سا پیدا ہو جاتا ہے تاہم فراق کے کلام میں یہ چیز اکثر عروس شعریت کا زیور اور حسن معنی کے لئے نکھار بنجاتی ہے

"شعلہ ساز" میں تغزل کے جو نمونے ملتے ہیں، ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان جذبات کو رسمی اور "برائے شعر گفتن" قسم کے عشق و محبت سے الہام حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں حسن بسیط کو بے نقاب کرنے کا لطف اور ایک روحانی لذت پوشیدہ ہے۔ خود فراق کے قول کے مطابق وہ درد کے ساز پر تغزل کے نغمے الاپتے ہیں ؎

بھول پائیں نہ ترے رنگ تغزل کو فراق
درد کے ساز پہ وہ نغمہ سنا آج مجھے

نیا دور

اختر انصاری

مجاز کی شاعری

شب تاب[1] جناب اسرار الحق مجاز کے ابتک کے کل کلام کا مجموعہ ہے۔ مجاز کی نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ آج سے تقریباً چھ سال قبل شایع ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہی مجموعہ چند نئی نظموں کے اضافے کے ساتھ ضخیم تر شکل میں شائع کیا گیا۔ اور اب تیسری مرتبہ اسی مجموعے کو کچھ اور نئی تخلیقات کے مزید اضافے کے ساتھ شب تاب کے نئے نام سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کسی شاعر کا اپنے کلام کو پے درپے چھاپنا (اسطرح) کہ ہر نئی اشاعت کے ساتھ پچھلی اشاعت یا اشاعتیں بیکار ہوتی چلی آئیں کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ یہ طریقہ ناشر کے تجارتی مفاد کے پیشِ نظر یا مصنف اور ناشر کے باہمی تعلقات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب ہو تو ہو، لیکن اس میں ان لوگوں کو بہت دقت ہوتی ہے جو اس شاعر کے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی کتاب کو اپنی لائبریری کی زینت بنانا پسند کرتے ہیں۔ انھیں ہر مرتبہ محض چند نئی نظموں کی خاطر ایک نئی کتاب خریدنی پڑتی ہے، اور پھر پچھلی کتاب نہ تو تلف ہی کی جاسکتی ہے اور نہ بظاہر اس کا کوئی مصرف ہی نظر آتا ہے۔ ہونا دراصل یہ چاہئے کہ جب کسی شاعر کا مجموعہ شایع ہو تو اس کی یہ حیثیت مستقل ہو۔ یعنی آئندہ اشاعتوں میں کتاب اپنے مواد اور اندراجات کے لحاظ سے جوں کی توں قائم رہے اور بعد کا کلام جیسے جیسے مرتب ہوتا جائے۔ نئے مجموعوں کی شکل میں پیش کیا جائے۔ واضح رہے کہ کسی مجموعہ اشعار پر نظر ثانی کرنا اور بات ہے اور اس میں نئے مواد کا مستقل اضافہ کر دینا بالکل دوسری بات ہے۔ بہرحال اس وقت ہمارے سامنے جو مجموعہ ہے وہ مجاز کی کل شعری پیداوار پر مشتمل ہے اور اس پر شروع سے آخر تک نظر ڈالنا مجاز کی شاعری کے تمام ادوار کا جائزہ لینے اور اس کے مختلف فکری و جذباتی رجحانات پر تبصرہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس مجموعے میں کلام کی ترتیب زمانے کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک ایسا شخص جس کی ادبی دلچسپی سرسری

[1] مجموعہ کلام از اسرار الحق مجاز (نگارستان بک ایجنسی دہلی)

اور ادبی مطالعہ اتفاق رہا ہو، اس مجموعے سے شاعر کے ذہن و میلان کی عہد بعہد ترقی یا تبدیلی کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مگر جن لوگوں نے مجاز کی شاعرانہ سرگرمیوں کو ابتداء سے لیکر اس وقت تک اپنی نظر میں رکھا ہے وہ اس کی شاعری کو آسانی کے ساتھ تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور مجاز کی آگرہ اور علیگڈھ کی طالب علمی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور میں وہ ایک خالص غنائی اور جذباتی شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ شب تاب کی نظموں میں مجبوریاں، کس سے محبت ہے۔ فدا آج کی رات۔ بتانِ حرم۔ اصنامِ عشق، اور چند کامیاب غزلیں اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں کوئی خاص وزن اور گہرائی نہیں پائی جاتی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی توقع بھی فضول ہے۔ کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوا ہو جو خالص غنائی شاعری میں وہ مفکرانہ وزن، گراں مایگی اور سطوت پیدا کر سکا ہو جو دنیا کی بڑی اور باعظمت شاعری کی پہچان ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مجاز کی یہ غنائی اور جذباتی شاعری کوئی سطحی اور ادنیٰ قسم کی عشقیہ شاعری نہ تھی۔ چنانچہ اس میں جذبات نگاری تو ہے مگر سستی جذبہ فروشی یا مریضانہ جذباتیت نہیں ہے۔ وہ ایک تندرست اور صالح حسن پرستی کا ثبوت ضرور دیتی ہے۔ لیکن رکیک عشق بازی اور بیمارانہ لذت پسندی کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔ نظم کس سے محبت ہے کے دو بند سنئے :۔

وہ میرے آسمان پہ اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
میرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے نغمیں پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

نظم جشنِ سالگرہ کی پیکر نگاری دیکھئے :۔

اِک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا، لب پہ ہنسی، آئی ہوئی سی

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہاں رقص میں افلاک، زمیں گھوم رہی ہے۔

شاعر کی دنیا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

نظم نورا میں یہی پیکر نگاری ہے۔ لیکن رنگ و آہنگ کی شوخی پہلے سے بہت بڑھی ہوئی ہے:۔

وہ ارمنِ کلیسا کی اک ماہ پارہ　　وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
جوانی سے طفلی گلے مِل رہی تھی　　ہوا چل رہی تھی، کلی کھِل رہی تھی
وہ پر رعب تیور، وہ شاداب چہرہ　　متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
وہ اک مرمریں حور خلد بریں کی　　وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی

نظم اصنامِ عشق بھی سراپا ایسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور نذرِ حرم میں تو یہ رنگ پختگی اور رچاؤ کی تکمیل کو پہنچا ہوا ہے:۔

نرم صوفے گود میں فردوس رعنائی لئے　　زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے
وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار　　آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار
رخ پہ شادابی لبوں پر سُرس تبسم برق پاش　　چست پیراہن، نمایاں جسم سیمیں کی تراش
آنچلوں کی سرسراہٹ، زمزمے گاتی ہوئی　　پیرہن سے نکہت خلد بریں آتی ہوئی

مجاز کی ان نمائندہ نظموں میں نظم آج کی رات خروشِ جذبات اور پختگی کا ایک لاجواب نمونہ ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات　　میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
نور ہی نور ہے جس سمت اٹھاؤں آنکھیں　　حسن ہی حسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہئے　　گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات
اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں　　کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ ادھر آج کی رات

ان نظموں میں جو صحت مندی اور توانائی پائی جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ یہ مزاجی رومانیت یا کھوکھلی خیال پرستی کے مرقعے نہیں ہیں، بلکہ ان میں جذباتی و جمالی تجربات کی ترجمانی کی گئی ہے، وہ شاعر کے مادی ماحول کے پیداوار ہیں اور واقعات کی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ خارجی حقیقت کا عکس ان شعروں میں اتنا واضح ہے:۔

زباں پر بے خودی میں نام اس کا آہی جاتا ہے

اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

مدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے

کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

اِن نظموں کی ایک اور نمایاں خصوصیت بین والنہار کی پختگی، ہمدردی اور رنگینی ہے ہیں مجاز کے یہاں شروع سے آخر تک نہایت رچی ہوئی فارسیت آمیز زبان ملتی ہے اُس کے مصرعوں میں کہیں جھول نہیں پڑتا۔ بندشوں کی چستی اور ترکیبوں کی خوشنمائی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ناپختگی اور کھردراپن جو اردو کے نئے شاعروں کی عام خصوصیت ہے، مجاز کے یہاں یکسر مفقود ہے۔

انھیں نظموں کے ساتھ ساتھ مجاز نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ شاید بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں مجاز صرف حضرت فانی مرحوم کی صحبتوں سے فیض یاب اور ان کے قیمتی مشوروں سے متمتع ہوئے ہیں۔ مجاز کے کلام میں فانی کے ابتدائی کا سراغ لگانا بظاہر ایک بیکار سی بات ہے، مگر اس سلسلہ میں دو ایک باتیں کہنی ضروری معلوم ہوتی ہیں، مجاز کے یہاں فانی کے ابتدائی کلام کی رقت پسندی اور آہ و بکا تو خیر سرے سے نہیں ہے۔ مگر اُن کی بعد کی شاعری میں جو حزن، بلکہ الم پرستی اور یاسیت پائی جاتی ہے مجاز کی شاعری کو اس سے بھی کوئی نسبت نہیں ہے۔ جہاں تک معنوی کیفیات اور ذہنی میلانات کا تعلق ہے، مجاز پر فانی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن مجاز کے پیرایۂ بیان میں جو پختگی، الفاظ و اصوات میں جو وزن اور لب و لہجے میں جو وقار پایا جاتا ہے اس کو ضرور ایک حد تک فانی کے اثر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر اسی اثر نے جوش کے اثرات سے مل کر مجاز کے مخصوص فارسی آمیز طرز کی حیثیت تعین کی۔ مجاز کی ابتدائی دور کی ایک غزل کے چند اشعار سنئے اور اندازہ لگائیے کہ اِن میں فانی کا اثر کہاں تک پایا جاتا ہے :-

سارا عالم گوش بر آواز ہے — آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم — میری مے خواری ابھی تک راز ہے

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر — اب تو بس آواز ہی آواز ہے

مجاز کی شاعری کا دوسرا دور جو ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہو کر ۱۹۴۰ء میں ختم ہوتا ہے، اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے میں ہم آہنگ ہے اسی دور میں مجاز کی شعری و فکری صلاحیتوں کو پنپنے اور پورے طور پر نشو و نما پانے کا موقع ملا۔ مجاز کی اس دور کی نظمیں اس کی بہترین نظمیں ہیں۔ اور ان میں خواب سحر آوارہ، سرمایہ داری، پردہ اور عصمت، اور نوجوان خاتون سے، ترقی پسند شاعری کے کامیاب ترین نمونوں اور جدید اردو شاعری کے بہترین کارناموں میں بھی شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ یہ نظمیں اس درجہ مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اور ان پر اس قدر کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس موقع پر ان کے اقتباسات پیش کرنا یا ان پر تبصرہ کرنا غیر ضروری ہوگا۔ البتہ عمومی حیثیت سے مجاز کی ترقی پسندانہ اور انقلابی شاعری پر کچھ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اردو میں ابتک جتنی ترقی پسند شاعری کی گئی ہے اس کا بہت قلیل حصہ ایسا ہے جو فن کے اعلیٰ جمالیاتی معیاروں پر پورا اترے اور اس بنا پر ہمارے ادب کے غیر فانی سرمائے کا جزو قرار پا سکے، اور یہ کوئی نئی اور عجیب بات نہیں۔ ہر زمانے کا ادب کا بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جو اسی زمانے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور بہت کم چیزیں ابدیت کی حامل بنتی ہیں۔ اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہوں گے وہاں ایک یہ بھی ہے کہ جب ادب کی دنیا میں انقلاب آتا ہے اور کوئی نئی تحریک برپا ہوتی ہے تو اس تحریک کے علم بردار اکثر و بیشتر جوش میں آ کر جائز حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض نئی چیزیں اوّل فیشن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور وہ لکھنے والے جو محض اپنی فیشن پرستی کی تسکین کیلئے لکھتے ہیں۔ ادب میں بے اعتدالی اور بے راہ روی کے رجحان کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے میں ہماری شاعری پر بھی یہی افتاد پڑی۔ کثرت کے ساتھ ایسی نظمیں لکھی گئیں جن میں خون، آگ، دھواں۔ آندھی۔ طوفان۔ جنگ اور انقلاب جیسے الفاظ کی مسلسل تکرار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ خالص تبلیغی شاعری تھی۔ کہیں اس میں نری نعرہ زنی

تھی، کہیں خارجی حقایق کی بے جان مصوّری اور کہیں عقلی عقاید کی بے روح تشریح
انداز ہر جگہ کم وبیش واعظانہ اور خطیبانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی شاعری
میں حسن کاری کا عنصر معمولی اور تاثیر کی خصوصیت برائے نام ہی ہو سکتی ہے۔
مجاز کی اس دور کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی شاعری
کو بحیثیت مجموعی اس وبائی رنگ سے بچایا۔ انقلاب اور اندھیری رات کا مسافر جیسی دو
تین نظموں میں یہ رنگ ایک حد تک جھلکتا ہے اور بس۔ اس کا سبب اگر ایک طرف مجاز
کی طبعی تمنائیت تھی تو دوسری طرف اس کے حسن مزاج۔ اس کی اس دور کی زیادہ تر
نظمیں ایسی ہیں جو مقصدی ادب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے تخلیقی آرٹ کی کڑی شرطوں
کو بھی پورا کرتی ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں جس کا اجتماعی
احساس اور نظریاتی شعور اچھی طرح ترقی پا چکا ہے، اور جو اپنی شاعری کو ایک مخصوص
تصورِ حیات کے تابع کر چکا ہو۔ لیکن اس کے باوجود فن کے مطالبات کو کسی قیمت پر نظر
انداز کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نظموں کی طرح مجاز کی اس دور کی غزلیں بھی اس کی
بہترین غزلیں ہیں۔ ان میں جو کس بل، رہک، شدت اور آب وتاب ہے۔ وہ
روایتی تغزل سے علیحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو مجاز کے عام رجائی اندازِ نظر کی ترجمان
معلوم ہوتی ہے۔
مجاز کی شاعری کا تیسرا اور موجودہ دور تقریباً ۴۰ء سے شروع ہوتا ہے، یہی
اردو شاعری کا وہ نیا تجرباتی دور ہے جس میں شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے
مواد اور موضوع کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ہئیت، ٹکنیک اور اسلوب کے سلسلے میں مختلف
تجربات کئے۔ اس زمانے میں نظمِ آزاد اور نظمِ معرّا نے رواج پایا۔ ان نئے اسلوبوں کو
اختیار کرنے والے شعراء نے رومانیت اور تخئیلیت میں پناہ لی اور "ہاتھی دانت کے
میناروں والی شاعری" کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ جنس، اور لاشعور کا تجزیہ
ان کا مقبول ترین موضوع ٹھہرا اور حد سے زیادہ ابہام اور اشاریت ان کے کلام کی سب
سے بڑی خصوصیت قرار پائی۔ یہ تمام رجحانات گویا مقصدی ادب اور ترقی پسند نظریۂ

ادب کا ردِ عمل تھے۔

مجاز نے اکثر ترقی پسند شاعروں کی طرح اِن رجحانات سے کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جن سانچوں کو منتخب کر چکا تھا انھیں سے کام لیتا رہا۔ مگر اس کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اُن راہوں پر بھی چلتا رہا جو اس نے اپنے لئے مقرر کی تھیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تیسرے دور میں اول تو اُس کے کام کی مقدار بہت کم ہے اور جو ہے وہ معمولی درجے کی غزلوں اور ہلکے پھلکے رومانی انداز کی نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ غزلیں اور نظمیں شب تاب کے ابتدائی ۳۴ صفحوں کو محیط ہیں۔ ان میں شہرِ نگار، عیادت، اور اعتراف اچھی نظمیں ہیں۔ مگر ایسی کہ مجاز کے ابتدائی دور کے نظموں کے مقابلے میں بھی پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ اور دوسری اور درمیانی دور کی نظموں کا مقصدی رجحان اور اجتماعی شعور تو اِن میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجاز کی شاعری ایک انحطاطی دور سے گزر رہی ہے اس کا سبب مجاز کی لاابالی طبیعت ہے، اُس کی ذہنی زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے اور اُس کے تجربات میں نیا خون داخل نہیں ہو رہا ہے۔ مگر اُس کی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ امید بندھتی ہے کہ یہ کیفیت عارضی ثابت ہو گی۔ اور بہت جلد وہ شاعری پر اپنی گرفت کو پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شب تاب میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے مختصر دیباچے بھی شامل ہیں فیض کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ فیض کے دیباچے سے مجاز کی شاعری کے داخلی پہلوؤں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور سجاد ظہیر کا دیباچہ اس کے خارجی ماحول پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ مصنف کا ایک پنسل اسکیچ بھی زینتِ اوراق ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو - دہلی)

صدیقہ بیگم سیوہاروی

کیرم بورڈ کے مہرے

نوشابہ دوا پیستی جا رہی تھی۔ بالکل مشین کی طرح، اس کے ہاتھ ایک ہی انداز سے سل پر چل رہے تھے۔ آج نہ جانے کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی شعر گنگنائے۔ لیکن شاید ابھی ہمارا شاعر اس بلندی پر نہیں پہونچا جہاں وہ فرداً فرداً ہر شخص کے احساسات کی ترجمانی کرے۔ اس کو اپنی لاعلمی کا تو احساس نہ تھا اور وہ ان شاعروں کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی جنھوں نے دیوان کے دیوان گوڑالے، دسوں دیوان تو اس نے بھی پڑھ ڈالے تھے پر اپنے حسب حال ایک شعر بھی اس کی نظر سے نہ گزرا۔ اور ان نئے شاعروں کا تو ذکر ہی فضول ہے جن کے پاس سوائے "بھوک" یا۔ پھر عورت کے دوسرا موضوع ہی نہیں — عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔

چند دنوں سے وہ اپنے سیاسی دماغ کو خیرباد کہہ چکی تھی جو ہمہ وقت دنیا بھر کے بکھیڑوں میں پھنسا رہتا تھا۔ چنانچہ کہاں تو ہر وقت اخبارات میں سیاسی ادب کی چھان بین — کہاں اب ہر وقت مومن۔ ناسخ۔ آتش کے اشعار زبان پر جیسے وہی زندگی کے حقیقی ترجمان ہیں — وہ پھر اپنے خیالات میں کھو گئی — سیاست — ہونہہ اس نے ہونٹ بچکائے — ایک وقتی حرارت ہے، کیا دھرا ہے ان چیزوں میں۔ زندگی کی مستقل قدروں میں انکا شمار کبھی نہیں ہو سکتا۔ آج وہ اپنی اس عمارت کو ڈھانے پر تلی ہوئی تھی جسکی بنیادوں کو اس نے اپنے خونِ جگر سے بنایا تھا۔ سیاست کا جہاں تک تعلق ہے کالج کی لڑکیوں میں دور دور نوشابہ سے بہتر کوئی لڑکی نہ تھی۔ اسکی تقریریں ہمیشہ ہی اول درجہ کی مانی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس کے پاس سیاست کا ایک نظریہ تھا جس پر وہ مضبوطی سے قدم جمائے رکھتی تھی — اٹل — پر آج رومان کی ایک ہلکی سی لپک نے اسکو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ سچ مچ لپک ہی تو تھی جس نے اسکی روح تک میں چنگاری

ردیں — اور اب وہ چنگاریاں اس کے روئیں روئیں سے پھوٹ رہی تھیں۔ اب وہ سوچ
رہی تھی کہ رومان ہی زندگی کی ابدی حقیقت ہے، جس کو کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔
اسکی حقیقت سیاسی نظریوں کی طرح تبدیل ہونے والی نہیں۔ اس کا ہات بدستور سِلپر چل رہا
تھا۔ اور خیالات دماغ میں الجھ رہے تھے۔ یکایک اُمّی کی گرجدار آواز نے انکو منتشر کردیا جیسے
کیرم بورڈ" کے مہرے "اسٹرائیکر" کی ذراسی جنبش سے بات کی بات میں منتشر ہوجاتے ہیں۔
یہ اُمّی بھی اچھی خاصی مصیبت ہیں۔ جب چلاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے بجلی تڑخ رہی ہے
میرے تو کان اڑ جاتے ہیں —

"کیا ہے — اُمّی؟" اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔ لیکن پھر اُس نے محسوس کیا کہ اُس
کے الفاظ کا زور زیادہ بڑھ گیا۔ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر گئے۔ اسی لئے فوراً ہی اسکی تلافی
کے لئے اس نے بڑے میٹھے اور نرم لہجہ میں کہا —

"بس ذرا سا اور رگڑا لگے گا، کوئی کام ہے اُمّی؟"

نوشابہ باوجود کوشش کے اس تلخی کو نہ مٹا سکی جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی
نوشو! یہ تو نے مفت کی مصیبت مول لے لی، ڈال پرے کو — ڈھیر کا ڈھیر ہے کہاں
تک پیسے گی — ہات بھی درد کرنے لگے ہونگے"

"جہاں اتنا کیا ہے وہاں تھوڑا اور سہی — اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ بچارے پردیسی
ہیں، اب بیمار ہیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ بچارے مصیبت میں پھنسے ہیں" وہ بار بار "بچارے"
کہہ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو یہی ایک گُر تھا جس سے وہ اُمّی کے جذبات کو پگھلا کر موم کر دیتی
تھی۔ اور پھر اُن کو ان طالبعلموں کی کس مپرسی کی زندگی پر افسوس سا ہونے لگتا — اگر اپنے
گھر ہوتے تو ان کے ماں باپ ان کے لئے کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اُمّی کو غیر معمولی
طور پر غصہ آرہا تھا، انھوں نے کچھ بھی تو نہ سنا جھٹ منہ پھیر کر ایک طرف کو چلدیں نوشو اپنے
کام میں لگ گئی۔ آج اس کا جی بُرا بُرا ہو رہا تھا — یہ اُمّی — جیسے انھیں کبھی کسی سے —
حالانکہ کوئی بری بات نہ تھی کیونکہ یہ تو اس کے نزدیک ابدی حقیقت تھی — پھر بھی اسکا
ذہن جملہ پورا نہ کرسکا اور وہ اس خیال کو ہی دماغ سے نکال سکی، اس نے ایسا محسوس کیا جیسے

کسی غار کے سامنے کوئی بھاری پتھر رکھا ہو اور اندر سے کوئی زور زور سے دھکے دے رہا ہو۔
نہیں امی اس کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں سوچ سکتیں — آخر یہ کالج کے لڑکوں کی اتنی دشمن کیوں ہیں — کالج کے لڑکے نہ ہوئے "ہوا" ہو گئے۔ اب ایسا بھی کیا — بچارے پردیسی ہیں۔ کتنے دن مکان خالی پڑا رہا مگر امی کو تو دھن سوار تھی کہ کسی کالج کے لونڈے کو نہ دونگی۔ آخر کو جھک مار کر دیا نا — اب کون سے غیب سے اللہ میاں نے اتارے۔ انکی باتوں کو تو بس اللہ ہی سمجھے —

"تم لونڈی لاروسمت بولا کرو بیچ میں۔ جب تم سمجھتے ہی نہیں تو کیوں بڑبڑ کرتے ہو"
اس کو یہ سوچ کر ہنسی سی آئی۔ کتنے لڑکے مکان کے لئے آئے۔ پیشگی کرایہ تک دینے کو تیار تھے۔ مگر امی کو تو ایک "نہیں ہے۔ نہیں" کی رٹ سوار تھی۔ کالج قریب ہے اور یہاں کام ہی کیسا ہے جو آتا۔ یا تو پھر مکان ہی کس دفتر کے پاس بنوایا ہوتا جو کوئی کلرک اپنی بیوی اور ایک درجن "چیلی چاپڑ" سمیت آکر بستا۔ وہ برابر ہات چلائے جارہی تھی۔ ایک مرتبہ جو اس نے تیزی سے ہات چلائے تو بالوں کی ایک لٹ سِل پہ آگری۔ کاش وہ دیکھ سکتے۔ پھر وہ جھینپ سی گئی، اور بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے ڈال لیا۔ بڑا تنگ کرتے ہیں یہ بھی — اور پھر لمبے بھی تو ہیں غضب کے "کالے ناگ" اب وہ اردو شاعری کے جملے یاد کر رہی تھی جس سے لطف اندوز ہونے لگی، سچ مچ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں یہ شاعر۔ پھر اس نے نیچے جھک کر غور سے دیکھا۔ چند لڑکے آنگن میں بیٹھے "مرغ کی طرح پر پھیلائے" دھوپ کھارہے تھے — اور وہ — ان میں انکی صورت نظر نہ پڑی نہ جانے کیا حال ہوگا۔ بچارے پڑے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کہا وہ جاسکتی۔ مگر اس کو کیا پڑی ہے، وہ اس کے کیا — نوشو آگے سوچنا نہیں چاہتی تھی۔
اور اسی لئے اس نے جھٹ سِل پر سے دوا اٹھائی اور لڑکے کے حوالے کر دی جو دیر سے دوا کے لئے کھڑا تھا، ستون کی طرح بے حس، اور اپنی ناک سے ایک مقررہ وقفہ کے بعد "سڑر ... سڑر" کی عجیب سی لے نکالتا جاتا تھا البتہ کبھی کبھی ذرا سی جنبش کرتا۔ وہ بھی اپنی انگلی کو ناک کے سوراخوں میں پھرانے کے لئے جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو —

"کیسی طبیعت ہے تمہارے صاحب کی ؟"

"صاحب جی!" وہ اپنے دلچسپ مشغلے سے چونکا
"جی ہاں بہت خراب ہے کئی روز سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔" اور پھر جیسے کچھ سوچنے لگا
اور چارپائی سے اٹھ بھی تو نہیں سکتے۔"
نوشو کے جی میں آیا کہ کہدے "پرہیزی کھانا پکوانا ہو تو بتلا دیں، میں خود پکا دونگی۔
آج کالج کا کام نہ ہوگا نہ سہی — مگر یہ امی — امی کی آواز اسکے تخیل میں گونجی "ابھی کیا تھا
کھانا بھی پکنے لگا" اسکی آنکھوں کے سامنے غصہ میں بھری ہوئی امی کی شکل ناچ گئی —
اور دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ نہ جانے انکو کیوں دشمنی ہے۔ کالج کے لڑکوں سے اگر کہیں
وہ لڑکا ہوتی اور باہر کالج میں پڑھتی ہوتی — اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، لڑکا دوا لیکر جا چکا
تھا۔ نوشو اٹھی اور چارپائی پر اوندھی جا پڑی جیسے تھک کر چور ہو گئی ہو۔ نہ جانے کتنی
دیر وہ اس طرح پڑی رہی۔
"نوشو"! امی کسی کام سے آئی تھیں وہ اس کو اس طرح اوندھے منہ پڑے دیکھکر گھبرا گئیں
وہ یہ بھی بھول گئیں کہ کس کام سے آئی تھیں "بیٹا! ایسے کیوں پڑی ہو؟"
کچھ نہیں — یونہی ہی ذرا لیٹی تھی۔" اور وہ اٹھ بیٹھی۔
میں کہتی ہوں تو مفت میں ہلکان ہوتی ہے۔ یہ نگوڑ مارے کالج کے لونڈے تو آئے
دن بیمار ہی رہتے ہیں۔ کھالیا ہوگا کچھ "الم غلم" آپ لوٹ پوٹ کر اچھا ہو جائے گا۔
کوئی کہاں تک انکی خدمت کرے۔ تو اپنے ہاتوں میں زبردستی بھیڑیں ڈالے لیتی ہے۔ ذرا دیکھ تو
اپنی شکل آئینہ میں — منہ پر ہوائیں اڑ رہی ہیں۔
"نہیں۔ امی کچھ بھی تو نہیں —" اوندھے منہ۔ لیٹنے سے اس کے بال چہرہ پر بے
ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ اس نے جھٹک کر پیچھے ڈال لئے۔ لیکن اس بار "اس ان" کالے
ناگوں، میں ذرا بھی تو مزا نہ آیا۔ الٹی الجھن ہو رہی تھی۔
امی جیسے طوفان کی طرح گرجتی، اچھلتی آئی تھیں ویسے ہی واپس چلی گئیں۔ نوشو
پھر ایک بے نام خلا میں کھو گئی۔ جیسے ہوا میں پرواز کر رہی ہو۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے
ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ کسی کے کراہنے کی آواز مدھم مدھم آوازیں آنے لگیں۔ شائد زیادہ

بیمار ہیں، کوئی پرسان حال نہیں۔ اُس کو غصہ سا آنے لگا، اُس نے یونہی میز پر سے کتاب اٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگی —— ہاتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔ دماغ اپنی فکر میں غلطاں و پیچاں —— ایک دوسرے سے بہت دُور۔ وہ ان الجھنوں کے کاغذ کے ان اوراق میں لپیٹ دینا چاہتی تھی کہ شعور اور لاشعور کی گہرائیوں اور پنہائیوں سے انکو نکال کر پھینک دے —— لیکن خیال کی لہریں —— یہ لہریں ساحل سے آکر ٹکراتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ندی کی آغوش میں کھو جاتی ہیں۔ پھر اس لمحہ دوسری لہریں یکے بعد دیگرے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیئے آتی جاتی ہیں۔ جیسے پرکار گردش کرنے کے باوجود اپنے محور پر قائم رہتا ہے یہ گہرائیوں سے اُبھر کر پھر اپنی گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں تاکہ انکے وجود کا یہ لامتناہی سلسلہ یونہی زندہ جاوید رہے۔ ورق پر ورق الٹتے جاتے ہیں پھر ان کے پلٹنے کا فعل یونہی جاری رہتا ہے۔ نوشابہ کو ایسی محبت تو نہ تھی، پھر بھی ہمدردی کے تمام جذبات یونہی آتے اور ختم ہو جاتے اور پھر نئے سرے اس کے دماغ میں جنم لینے لگتے۔

کراہنے کی دھیمی دھیمی آوازیں رات کے سناٹے میں گونج رہی تھیں۔ فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا جیسے بربط کے تاروں سے آواز نکلتی ہے، جیسے کوئل متواتر کوکو کرتی ہے تاکہ کوئی بچہ اسکی اسی آواز کو پھر اسی تک پہنچائے۔ کیا اس کا سلسلہ بھی یونہی، لامتناہی سا ہے۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے یہ آہیں کائنات کے ہر ذرہ میں پنہاں ہیں کتاب کے ہر ورق کے ساتھ پیوست ہیں اور فضا میں ان مہین ذروں کی طرح تیر رہی ہیں جو خوردبین تک سے بمشکل نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے سر کو جنبش دی جیسے وہ ان کو ختم کر دے گی لیکن یہ کبھی نہ ختم ہونے والی کہیں ایک جنبش سے ختم ہوتی ہے۔ اس کی نظریں کتاب پر ایک جگہ جم کر رہ گئیں ——

فسطائیت سرمایہ داری کا یہ آخری حربہ آج اپنے آخری فیصلے کے لئے میدان میں کود پڑا ہے وہ اپنے ٹل تاریک مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تاریخ کی باگ ڈور اپنے ہاتوں میں لے کر پیچھے کو موڑنا چاہتی ہے۔ لیکن کیا تاریخ کے قوانین اتنے کمزور ہو گئے کہ وہ اپنے کو اتنی آسانی سے فسطائیت کے غار میں ڈھکیل دینگی۔ جہاں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے ——

گھٹا ٹوپ — جس میں اُدھورے انسان کراہ رہے ہیں ——"

نوشو چونک پڑی جیسے وہ کسی اور ماحول میں پہنچ گئی تھی — ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر اوں کی اداسی نے اسکو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کراہ رہا ہے جیسے ادبی فضا میں فسطائیت کی حکومت ہے۔ اس کا یہ گھر بھی تو فسطائیت کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے۔ جہاں — اس نے اپنے خیالات کے روشندان کو بند کر دیا نہیں تو وہ انہیں اپنے دماغ کے محل میں گھسنے نہیں دیگی۔ ہوگا کوئی بیمار۔ وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ہوا چل رہی تھی، کتاب کے ورق پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے تھپڑ مار رہے تھے۔ اس سے انکا یہ جھگڑا نہ دیکھا گیا اور اس نے پلنگ سے کتاب بند کر دی، لیکن جب اس نے دوبارہ اس کو کھولا تو زیادہ تر ورق مڑ چکے تھے اور بعض تو پھٹ بھی گئے — لو یہ ہے تمہاری سزا آپس میں لڑنے کی۔ نوشو نے پھر کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا ذہن تو جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا نہ جانے یہ کتاب کے حروف اڑ اڑ کر اس کے ذہن میں دھنسے جا رہے تھے۔ یا اس کے ذہن سے یہ خیالات نکل نکل کر کاغذ کی سطح پر جم رہے تھے ——

"اس دور سرمایہ داری میں غریب ہونا بھی ایک بہت بڑا پاپ ہے۔ ایک بہت بڑا جرم ہے جسکی تلافی بغیر ایک غیر طبقاتی نظام کے ناممکن ہے اور جبتک یہ نظام قائم نہ ہوگا انسانیت ہمیشہ ہی خاک و خون کی ہولی کھیلتی رہے گی"۔

نوشو پڑھتے پڑھتے چونک پڑی، تو گویا انسانیت کی یہ جُبلی ہے۔ سلور جبلی یا گولڈن — یہ جبلی ہمیشہ ہی ہوتی رہے گی۔ اور ہمیشہ انھیں قیمتی دھاتوں کی ہوگی —— لیکن نہیں —— اس نے اپنے سر کو جنبش دی، آنکھیں دونوں ہاتوں سے ملیں جیسے وہ اپنی اداسی کو ان آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے دفن کر رہی ہو —— یہ جبلیاں ختم ہو جائیں گی اور پھر انسانیت کی پہلی جُبلی ہوگی جس میں پھر کوئی نہیں کراہے گا۔ کوئی اس طرح بیمار نہ ہوگا کہ اسکی محبوبہ اس کی تیمارداری نہ کر سکے —— وہ شرما گئی اور نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا —— میں بھی کیا کیا سوچنے لگتی ہوں —— اور وہ پھر سر جھکا کر

پڑھے گی۔

"بس وہ سرمایہ داری میں غریب ہونا بھی ایک بہت بڑا پاپ ہے، اور ہندوستانی لڑکی ہونا تو اس سے بھی بڑا پاپ ہے ۔ آج کتنے دن بعد وہ سیاست کے بربط پر انگلیاں پھیر رہی تھی ۔ مگر ہر تار سے بے ربط آواز نکل رہی تھی، وہ اس پر گانا چاہتی تھی پر اس کی آواز ساز سے الگ تھی ـــــ اس کا نغمہ آزاد تھا ـــــ جو فضا میں گونج کر اپنا ساز آپ بنا لیتا تھا اور پھر مغنی کے لئے ہوا میں اڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دور تک اسی طرح اڑتی چلی جائے گی۔ افق کے اس پار جا کر دم لیگی، جہاں ساز کے بغیر ہی نغمہ پُرکیف ہو ــــ دماغ اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا مگر دل خاموش تھا جیسے ساز کے سارے تار ٹوٹ گئے ہوں، وہ محبت کے پُرسوز راگ الاپ رہا تھا، ٹوٹے ہوئے تاروں سے کتنا جگر دوز نغمہ نکل رہا تھا ـــــ کیا انسانیت کی آواز میں بھی اتنا ہی سوز ہوگا ـــــ وہ چونک پڑی ننھو میاں کھڑے باجی کے بالوں سے کھیل رہے تھے ۔

"باجی ـــــ باجی ـــــ کالج کے لڑکے بیمار نہیں ہیں، اچھے خاصے تو ہیں۔"

"کالج کے لڑکے ـــــ" اس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہ سنا ـــــ وہ بپھر گئی۔

"یہ بھی کوئی نام ہے ۔ کتنی دفعہ سمجھایا کہ بھیّا اس طرح نہ کہا کرو مگر وہ تو مانتا ہی نہیں ـــــ کلّے کلّے کونچوں گی تیرے ـــــ شریر کہیں کا ـــ" نوشو نے دانت پیسے

"امّی بھی تو یہی کہتی ہیں" اس نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

" ان کی تیری ریس ہے ۔ بڑا چلا ہے برابری کرنے" شمّو چڑسا ہوگیا۔ نوشو پھر کچھ نہ بولی

"ہائے تو کیا کہہ رہا تھا تو ـــــ؟"

"میں کہہ رہا تھا ـــــ باجی ـــــ یہ کالج کے لڑکے جو ہیں نا ـــــ اور وہ پھر گھبرا گیا کیونکہ باجی کی آنکھیں لال انگارہ سی ہوگئی تھیں ۔ لیکن وہ پھر ہنس پڑی ۔

" اب نام نہیں یاد آتا تو کیا کروں" ـــــ اس نے پھر کہنا شروع کیا "تو یہ جو ہیں بیمار تھوڑا ہی ہیں ـــــ بنتے ہیں" ـــــ اُس نے منہ بنا کر کہا۔

نوشو نے اُسے گود میں بٹھا لیا، اور اس کے نرم نرم گالوں پہ ہات پھیرتے ہوئے بولی

"تجھے کیسے معلوم"؟

"میں جو گیا تھا ـــــ نا ـــــ ابھی"۔ اس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔ "پہلے تو سب کے سب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل کر ـــــ وہی جو بیمار ہیں نا ـــــ جھٹ لحاف میں گھس گئے، اور کُونھ ـــــ کُونھ ـــــ" وہ آگے کہنا چاہتا تھا کہ سامنے سے اُمی بھی آگئیں ـــــ

"کیا بات ہے شمو؟" انھوں نے بڑے پیار سے کہا۔ شمو نے جو امی کے لہجہ میں ایک ایک خاص قسم کا لوچ دیکھا جس میں ذرا بھی ترشی نہ تھی۔ تو وہ نوشو کی گود سے اچھل ـــــ اُمی کے پاس پہنچ گیا۔

"اُمی یہ کالج کے لڑکے بیمار تھوڑا ہی ہیں"ـــــ اس نے نوشو کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو، کہ دیکھو میں امی کی برابری کر رہا ہوں، کرلو میرا کیا کرتی ہو۔

نوشو نے ساتھ ہی ساتھ سنا کہ پاس والے کمرہ میں وہی بازارو گیت گایا جارہا تھا جس سے اُمی کو بیحد غصہ آتا تھا ـــــ

گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے

بستر بچھا دیا ہے ترے در کے سامنے

نوشو پھلانگ مار ریڈیو کے پاس پہونچ گئی۔ اس نے جلدی سے پلگ لگا کر "ناب" زور سے اینٹھا ـــــ دھڑ ـــــ دھڑ ـــــ دھڑ ـــــ بڑی تیز دل ہلا دینے والی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں ـــــ جیسے کوئی بہت بڑی عمارت گر رہی ہو۔ پورا کمرہ گونج اٹھا ـــــ پھر خاموشی ـــــ اور پھر وہی گانا ـــــ

گھر ہم نے لے لیا ہے تیرے گھر کے سامنے

قرۃ العین حیدر

اودھ کی شام

عجیب — بیحد عجیب — تو تم میرے ساتھ نہیں ناچوگی — نہیں۔ کیونکہ تم انگریز ہو۔ اور اعلیٰ خاندانوں کی ہندوستانی لڑکیوں کا فوجیوں اور خصوصاً انگریز اور امریکن فوجیوں کے ساتھ رقص کرنا بڑی ویسی بات ہے۔ اور جو یہ دیوزادسا فوجی پچھلے آدھ گھنٹے سے برابر تمہارے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ وہ تو ہندوستانی ہے۔ اور میرے چچا کا دوست ہے۔ تم ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی محبت ہے۔ اور کیا۔ ہٹی۔ ارے جم تم تو انگریز ہو۔ فرنگی۔ بنئے۔ سفید فام چقندر یا شلجم۔ ایک تم خوبصورت ہو تو کیا ہوا تمہارے بھائی بند تو چقندروں ایسے ہوتے ہیں۔ سارے کے سارے۔ بڑی بے ایمان قوم ہے تمہاری۔ اب تمہیں ہم کان پکڑ کر باہر نکال دینگے کہ تشریف لیجائیے۔ آپ گھر کو دو ہوئیے۔ کیونکہ بھئی ہم کو تو آزادی ملنے والی ہے۔ سمجھے۔ ارے یہ بال روم میں پولیٹکس کس بدمذاق نے چھیڑ دی۔ ارے، جم تم اسکی کچھ مت سننا۔ یہ بڑی وہ ہے۔ مسلم لیگر بڑی سخت۔ یہ تمہیں بتائے گی کہ جناح ایشیا کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ جم اگر ہندوستان کو سمجھنا چاہتے ہو تو میں تمہیں کتابیں دونگی پڑھنے کو۔ ٹیگور کی گیتانجلی اور مہاتما جی کی سوانح عمری اسکے علاوہ رامائن اور مہابھارت بھی کافی مفید ہے۔ اس سے کرما اور نروان اور مکتی کے سب راز عیاں ہوجائیں گے۔ چودہ طبق روشن ہوجائیں گے تم پر — اور بھئی جم ہم تو کسی غیر ملکی سے بات بھی کرنا روا نہیں رکھتے — اور کیا لیکن تمہاری بات ذرا دوسری ہے اسی لئے تمہیں ہم نے آج مدعو کرلیا ہے کیونکہ تم ایک لارڈ کے لڑکے ہو اور میرے بھائی کے ساتھ آکسفرڈ میں پڑھ چکے ہو اور اس طرح کے نہیں ہو جس طرح کے تمہارے ہم وطن عام طور پر نظر آتے ہیں اور تم بیحد خوبصورت اور دلکش ہو۔ تمہاری سبز آنکھوں میں رومان، افسردگی، بیکسی اور شرارت سب کی ملی جلی لہریں تیرتی رہتی ہیں۔ مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رقص نہیں کرونگی۔ تمہارا لہجہ بہت عمدہ ہے۔ تم پہلے انگریز ہو جو صحیح اور اچھے تلفظ کے ساتھ انگریزی بول سکنے کے علاوہ کسی ٹھوس اور سنجیدہ موضوع پر دیر تک آسانی سے گفتگو کر سکتے ہو۔ تم سگریٹ کے

دھویں کے مرغولے اڑاتے ہوئے کورنل واٹیلڈ کے سے انداز میں کہتے ہو کہ ہندوستان کے
دو ہفتے کے قیام میں تم جن تین چار ہندوستانی لڑکیوں سے ملے انھوں نے تم کو بہت زیادہ
امپریس کیا۔ وہ بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ انکے دماغ میں ideas ہیں۔ اور وہ چین کی خانہ
جنگی، کمیونزم اور انڈونیشیا کی آزادی پر لمبی لمبی ثقیل بحثیں اس خوبصورتی سے کرتی ہیں جس
خوبصورتی کے ساتھ وہ مانی پوری اور کتھا کلی اور رمبا کرتی ہیں۔ انکے انداز میں لوچ اور گفتار
میں شیرینی ہے۔ انکے قہقہے جلترنگ جیسے ہوتے ہیں اور انکے لباس گویا مرقع چغتائی کے نقرئی اوراق
کھول دیئے گئے ہوں۔ ہم نے تمھاری ان باتوں کو بہت پسند کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز
ہوتے ہوئے بھی تم میں جمالیاتی ذوق اور عقل کافی موجود ہے۔ تم نے بتایا کہ تم نے بال روم میں
فلور پر سب سے پہلے میرے روپہلے غرارے کو نوٹس کیا تھا۔ تو تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم لکھنؤ میں
ہو۔ جہاں شام اودھ ہوتی ہے۔ یہ اودھ دراصل ایک بڑی رومنٹک سی سلطنت تھی۔
تاریخ کی کتابیں پڑھو تو معلوم ہوگا۔ اور اس کے بادشاہ اوپیرا اور سنگیت سبھاؤں میں راجہ اندر
اور جوگی بنا کرتے تھے بڑے نالائق اور نکمے تھے وہ لوگ جبھی تو یہ جگمگاتی ہوئی پرستان جیسی سرزمین
ان سے چھین لی گئی اور یہ جو بیکار اور بے مصرف سے تعلقہ دار انکے زمانے کی یادگار باقی رہ گئے
ہیں انکی ریاستیں اور زمینیں ہماری نئی جمہوری حکومت اب بچارے مظلوم کسانوں کو دیدیگی
کیونکہ یہ جنتا راج کا نیا زمانہ ہے۔ آیا خیال شریف میں تمھارے اور تم نے اوما کی مرہٹی اسٹائیل
کی ساری کی بھی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اسطرح کی ایک ساری تم اپنی بہن کے لئے
ولایت لیجاؤ گے تو وہ بھی کیا یاد کریگی بچاری۔ اور تمہیں زینت کے جوڑے میں سجے ہوئے زرد اور
بنفشی پھول جدید آرٹسٹک نظر آئے تھے۔ دراصل ہم لوگوں کو بالوں میں پھول سجانے کا ایک خاص
فن آتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان پھولوں، خوشبوؤں اور نغموں کا ملک ہے۔ سمجھے ——— ارے
کیا ہندوستان ہندوستان چلا رہی ہو۔ آج ہی صبح گئی تھیں ملک کی واحد قومی جماعت کے خلاف
الیکشن لڑنے۔ لیگ کی ایجنٹ تھیں کی۔ جی میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ اس سے پولیٹکس کی باتیں
نہ کرو۔ یہ تمھیں اپنے پاکستان کا مطلب بھی نہیں سمجھا سکیگی۔ آج تک نہیں سمجھا پائی — اور پاکستان
ہو جائیگا بس آمد تو آپ سے ملنے کے لئے پہلے پاسپورٹ حاصل کرنا پڑیگا۔ یعنی بھئی اگر لاہور جا

ہے تو پہلے پاسپورٹ بنواتے پھرو، پھر حصول لوا کرو بڑی طوالت ہوگی — یہ ترقی کی باتیں مت کرو آنند۔ کتنے معقول ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہوگا — چلو ناچیں والز کے لئے ہال کی روشنیاں کم کردی گئی ہیں، پاکستان کے متعلق پھر لطیفے کرتے رہیں گے۔ عجیب۔ بیحد عجیب۔ کیا بات ہے جِم۔ تمہاری آنکھوں میں پھر وہی جھلک لہرا اٹھی جیسے چڑیا کا ایک معصوم چھوٹا سا بچہ سخت کرب اور بےچینی میں مبتلا ہو اور بےبسی کے مارے تڑپ بھی نہ سکے۔ تم اپنی کرسی پیچھے سرکا کر ایک طرف کو کیوں جھک گئے جیک، والز کا ایک پیارا سا نغمہ اپنی پوری دلآویزی کے ساتھ بج رہا ہے اور مرمریں فلور پر رقصاں جوڑے ہال کے کناروں پر بکھری ہوئی میزوں اور کرسیوں کے قریب سے تیزی کے ساتھ چکر کاٹتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ غرارے اور ساریاں اور ساٹن۔ جاؤ تم بھی ناچو اور ناچتے ہوئے انسانوں کے اس متحرک اور رنگارنگ جوار بھاٹا میں کھو کر بھول جاؤ کہ تم کہاں ہو اور کس سے باتیں کر رہے ہو۔ ہم لوگوں سے ملتے وقت تمہیں سوچنے کی عادت بالکل چھوڑ دینی چاہیئے جب اپنے ویلز کی شکارگاہوں کو واپس جاؤگے، اس وقت تمہیں کافی فرصت ہوگی کہ ہمارے کمینہ پن احسان فراموش اور جنسی غلاظت کا اپنی عظمت اپنی اعلیٰ تہذیب اور اپنی چاک کی سفید پہاڑیوں اور نیلے سمندروں کی خوبصورتی سے موازنہ کرکے ایک آدھ کتاب لکھ ڈالو — کہاں تک لڑے جاؤگی بھائی۔ اس سے متعارف ہوئے ابھی تمہیں ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا اور تم لڑتے لڑتے اسکا دماغ چاٹ گئیں۔ جھکی آدمی۔ وہ بیچارہ اپنے ہم قوموں کی پچھلی ساری نالائقیوں پر سخت شرمندہ اور نادم اور پشیماں ہے اور اسکی سبز آنکھوں میں، وہی رومان۔ غمگینی۔ بیکسی اور شرارت کی ملی جلی لہریں جھلملا رہی ہیں اور اس کے معصوم اور بہادر برطانوی دل میں صرف یہی ایک خواہش ہے کہ تم اس کے ساتھ ایک آخری والز کر لو۔ کیونکہ کل صبح ہندوستان کو آزادی ملنے والی ہے اور اسے کان پکڑ کر تمہارے گھر سے نکال دیا جائیگا۔ اور رات گہری ہوتی جارہی ہے۔ اور آرکیسٹرا کے پلیٹ فارم کے پیچھے اسٹیج کے بھاری زرد پردوں کے سائے میں نیلگوں مرمری فرش پر کھیرے کی دو سفید فام لڑکیوں نے شب کا آخری ناچ شروع کر دیا ہے۔ اور ہال کے بڑے بڑے اور چوڑے دریچوں کے باہر خوابیدہ فضاؤں میں "گڈ نائٹ لیڈی" کے اداس سُر لرز رہے ہیں۔ جِم کی آنکھیں نیند سے جھکتی جارہی ہیں۔ جِم تم خواب کیوں دیکھتے ہو۔ تمہیں خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ انگریز

ہمیشہ جاگتا رہتا ہے ۔ وہ صرف سینن گن چلانا جانتا ہے ۔ تم بھی جھوٹے ہو ۔ پوزیر ہو بڑے زبردست ۔ تم غلط کہتے ہو کہ تمہیں اس پر اسرار سرزمین سے عشق ہے جس میں ٹیگور کے گیت ہیں اور اودے شنکر کا ناچ ہے اور ہمالیہ کی برفانی بلندیاں اور نیلوفر سے بھری ہوئی وادیاں ہیں ۔ اور ۔ اور جہاں کی سیاہ آنکھوں والی لڑکیاں اپنے بالوں میں زرد اور بنفشی پھول سجاتی ہیں اور وہ چھلے غرارے پہنتی ہیں یہ سب غلط ہے ۔ جھوٹ ہے ۔ دھوکا ہے بہت بڑا ۔ یہاں پر فقر گندگی ہے ۔ اور غربت اور بے رنگی اور زندگی کا ناگوار ناقابل برداشت بوجھ ۔ زندگی کا کوئی مقصد نہیں ۔ کوئی مصرف نہیں ۔ اس یکرنگی اس بے کیفی اس خستگی اور اکتاہٹ کے شدید احساس کو تم نہیں سمجھ سکتے ۔ تم ۔ ہ مئیر کے نیلگوں ائرکنڈیشنڈ بال روم میں بیٹھ کر ہندوستان سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتے ہو ۔ تم گدھے ہو بہت اعلیٰ قسم کے ۔ سمجھے ؟ اودھ کی شام بہت کالی اور بہت خنک ہواؤں میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ اور تمہے مئیر کی گیسٹ نائٹ اختتام پر ہے ۔ تمہاری پلکیں خوابوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں ۔ زینت کے بالوں کے زرد پھول مرجھا کر فرش پر گر چکے ہیں جنہیں روندتے ہوئے ہم ابھی نیچے چلے جائیں گے ۔ ہم سب کے سب ۔ اور یہ جگمگاتا ہوا رقص کا ایوان خالی ہو جائیگا اور اسکی تیز برقی روشنیاں ایک ایک کر بجھا دی جائینگی ۔ اور آج کی رات کے بعد ہم سب تمہیں بھول جائینگے ۔ یہ سیاہ فام مدراسی کارٹونسٹ جو ایک کونے میں خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی اسکیچ بک میں تمہارے بیشمار پورٹریٹ بنا چکا ہے ۔ اور یہ خوبصورت اور ڈیشنگ اور مغرور ہمارے ہاں کے ڈزنا انگریزی اخبار کا اڈیٹر ۔ اور آنند ریڈیو کا یہ پروگرام ڈائرکٹر جو انگریزی میں شاعری کرتے کرتے سب کو بور کر دیتا ہے ۔ اور آرما جو ہیڈی لیمار کی طرح حسین ہے اور تمہیں پورن برہما کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش میں اپنی ساری شام ضایع کر چکی ہے ۔ اور وہ کہہ رہی ہے کہ وہ اگلے اتوار کو بانیئر کے میگزین سیکشن میں تمہارے متعلق ایک کہانی لکھے گی ۔ اور زینت جو شہزادی ہے ، اور میرے بھائی کی منگیتر وہ تمہاری یاد میں ایک گیت کمپوز کرنے والی ہے ۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہاری ایک تصویر بناؤنگی اور اسمیں تمہاری آنکھوں کے لئے آسمان کی نیلاہٹ اور کشمیر کی گلمرگ جھیلوں کی سبزی اور چاند کی بھیگی بھیگی کرنوں کے جھلملاہٹ کے رنگ استعمال کرونگی ۔ اور آنند انگریزی نظموں کا جو مجموعہ لندن سے شایع کروا رہا ہے اسمیں تمہارے اوپر بھی چند شعر شامل کریگا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ کل صبح کے بعد جبکہ تم ہندوستان سے جا چکے ہوگے تم اس آسانی اور اطمینان کے ساتھ فراموش کر دیے جاؤ گے جس آسانی اور اطمینان سے زندگی کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اور واقعات بھلا دیئے جاتے ہیں۔ دراصل یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ تم نے ہماری تصویروں کی تعریف کی ہمارے رقص دیکھے، ہماری موسیقی کو پرکھا۔ لیکن یقین جانو کہ ہماری تصویریں۔ ہمارے افسانے اور ہمارے ناچ کوئی معنے نہیں رکھتے۔ جب زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے تو ان چیزوں کا کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی End ہی نہیں تو Means کی بہتری یا افادیت میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ شاید ہم سب فرار چاہتے ہیں لیکن پناہ کہیں بھی نہیں ملتی۔ تمہارے میٹر آف فیکٹ برطانوی دماغ کے لیئے یہ بڑا انوکھی باتیں ہیں نا ــــ دراصل ہم سب اچھے خاصے پاگل ہیں، اوما اور زینت اور میں اور آنند۔ سارے کے سارے۔ ہم ناچتے ہیں اور لکھتے ہیں اور ایک سے ایک الٹی پلٹی باتیں کر کے ہمیشہ ایکدوسرے سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ زندگی جس طرح بھی سامنے آئے اسے اپنا لو۔ یہ میرا اور آوا کا فلسفہ ہے جسے ہم Confusionism کا فلسفہ کہتے ہیں جو بہترین اور انتہائی مفید۔ نرالا فلسفہ ہے نا ــــ ہر نرالی چیز ہی تو دلچسپ ہوتی ہے۔ ورنہ ہم اسوقت یہاں نہ ہوتے۔ یہ اقدامیت کی بیحد انوکھی تھی جسکی وجہ سے تم اپنے ولیش تعلے اور انہی پہاڑی نشکار گاہوں اور اپنے لارڈ باپ کی کشتیوں پر سر لیکے لیبر گورنمنٹ کے بجٹ پر نکتہ چینی کرنے کے لئے چھوڑ کر اسوقت یہاں ہمے' نیر بال روم میں بیٹھے، ویدانت کے فلسفے اور پاکستان کے جوازسے سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ یہ زندگی اور یہ شامیں بالکل نرالی ہیں جن میں آئیو لئے قحط اور مسٹر ہوور کے متعلق اپنے اپنے اندیشے ظاہر کرنے کے بعد اپنی میزوں پر سے اٹھ اٹھ کر رقص میں گھومتے گھومتے پانچ چھ گھنٹے گذر جاتے ہیں اور ہم بالکل نہیں تھکتے۔ اوما انتہائی انوکھی لڑکی ہے کہ اعتقاداً سخت ہندو ہونے کے باوجود ایک مسلمان سے شادی کر کے غرارہ پہنکر سلام علیک کہتی ہے اور میں شاید اس سے بھی زیادہ انوکھی ہوں کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی جے ہند اور نمسکار کر لیتی ہوں جبکہ تمھیں بتایا گیا ہے کہ ہم لوگ بازاروں میں ایکدوسرے کے گلا کاٹ ڈالتے ہیں۔ "گوڈ سیو دی کنگ" بجنا شروع ہو گیا ہے۔ جم فوراً کھڑے ہو جاؤ۔ تم میرے ساتھ ان باتوں میں اسقدر محو ہو گئے ہو کہ تمھیں اسکا بھی خیال نہیں رہا۔ ہم لوگ نیچے جا رہے ہیں۔ اپنے نیشنل انتھم کے بعد نیچے آکر پورٹیکو

ہیں ہم سے رخصت ہو لینا کیونکہ رات بھیگتی جا رہی ہے' اور سفیدے کے درختوں کے پیچھے
سے ابھی چاند طلوع نہیں ہوا ہے۔ اور تمھیں معلوم ہونا چاہیئے مسٹر کہ اندھیری راتوں میں ہم لکھنؤ والوں
کو خواہ مخواہ ڈر لگا کرتا ہے۔ رات خاموش ہے اور ہماری کار تیزی سے تے قیصر کے مرمریں پورٹیکو کی نیلگوں
اور خنک دھندلی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتی آ رہی ہے۔ دور لا مارٹینیر کالج کی پرشکوہ فرانسیسی عمارتوں
کا سیاہ عکس انکی سیڑھیوں کے نیچے سوتی ہوئی جھیل پر لرز رہا ہے۔ چپ چاپ اور بے حس۔ اور سکندر باغ
و دلکشا اور بنارسی باغ کے وسیع سبز مخملیں میدان اور سفیدے کے جنگل مدھم چاندنی کے سناٹے میں سائیں
سائیں کر رہے ہیں۔ اور گومتی کے شاندار پل کے کنارے دریا پر جھکی ہوئی سرخ پتھر کی ایک شہ نشین پر
آسمان کے مقابلے میں ایک سفید سا نظر آ رہا ہے اور اس کے سامنے چھتر منزل خاموشی اور غرور سے
آدھی رات کے آسمان کی طرف اپنی سنہری چھتری بلند کئے اپنی رقص گاہ کی روشنیاں اپنے قدموں میں
بہتی ہوئی گومتی کی سطح پر پھینک رہی ہے۔ یہ اودھ کی رات ہے۔ اور مسٹر تم چند گھنٹوں بعد ان راتوں
سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ گے۔ اور تمھارا ایکسپریس طیارہ گومتی اور سرجو اور گنگا کی روپہلی لکیریں پیچھے
اوپر سے گزرتا انھیں نیچے چھوڑتا ہوا دور مغربی سمندروں کے اونچے بادلوں میں کھو جائے گا۔
آدھی رات کا پر اسرار سناٹا چھا رہا ہے۔ چاروں طرف دور دور تک پھیلی ہوئی خوابیدہ کائنات پر ہراس
کا سحر چھا رہا ہے، دریچے کے باہر شہتوت کے درختوں کی دوسری جانب سڑک کے کنارے وہ پرانا
پھاٹک خاموشی سے استادہ ہے اور اسکی اوپر کی منزلوں اور شہ نشینوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی
ہیں۔ دور چوکیدار باغ کی رکھوالی کرتے کرتے چلا اٹھتا ہے ہو ہو ہو۔ لا لا لا۔ ... اسکی پر ہول کی
آواز بازگشت دیر تک گومتی کی روپہلی بیتوں پر گونجتی رہتی ہے۔ اور اپریل کے بانس پر بیٹھے ہوئے
چنڈول کی تیز آواز کے رات کے سناٹے کو کاٹتی ہوئی اندھیرے کی وسعتوں میں پھیلتی جا رہی
ہے۔ چنڈول وا تیکے لحاظ آلو کے چھوٹے بھائی کی ایک قسم ہے۔ مسٹر بھی الو کا پٹھا جاتی ہے۔ اور
مجھے یاد ہے کہ اس نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر خدا حافظ کہتے وقت کار کا دروازہ بند کرتے
ہوئے جھک کر میرے غرارے کے پائنچے سمیٹ کر اندر اٹھانے میں میری مدد کی تھی جو فٹ بورڈ پر
گرے جا رہے تھے۔ اور اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی مسز جمن کو سگریٹ کا دھواں اڑاتے دیکھ
کر مجھ سے چپکے سے کہا تھا کہ اسے عورتوں کا سگریٹ پینا بالکل پسند نہیں اور وہ اپنی بہنوں کو بھی

سگریٹ نہیں پینے دیتا کیونکہ وہ امریکن نہیں انگریز ہے اور انگریز سب قدامت پسند ہوتے ہیں۔ اور ساتھ کے دو بجنے والے ہیں۔ اور فرش پر برقی چولہے کے قریب کافی کی پیالیاں بے ترتیبی اور اکتاہٹ کے انداز میں منتشر ہیں۔ ابھی بہت پڑھنا ہے کیونکہ امتحان میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ کیا کرینگے اتنا پڑھ کر جانے۔ پرانے بادشاہوں کے زمانے کا وہ بھیانک اندھیرے میں زیادہ بلند زیادہ ہیبت ناک اور زیادہ خوبصورت نظر آرہا ہے جسکی خوبصورتی اور عظمت سے دل میں ایک ناقابل بیان خوف سا محسوس ہوتا ہے اور جسکی عظیم الشان محرابوں کے نیچے سے دن بھر بی۔ ٹی۔ سی کے جیب اور لائبریری کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والی لڑکیوں کے گروہ گذرتے رہتے ہیں۔ اور میں پڑھنے کے بجائے تصویریں بنا رہی ہوں۔ اور زینت کہتی ہے کہ تم تصویریں کیوں بناتی ہو۔ مت بنایا کرو تصویریں۔ بلکہ کوئی اور زیادہ مفید کام شروع کردو۔ مثلاً باورچیخانے کے باغ میں گوبھی کی کیاریاں تیار کرو تاکہ زیادہ غذا پیدا کیجائے اور گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں گورنر صاحب کی میم صاحب ہم لوگوں کی زیادہ تعریف کیا کریں۔ اور زینت اکنومکس کی موٹی سی کتاب کو قالین پر پھینک کر اپنی پیانو کی کاپی کے ورق الٹتے ہوئے سلام کا کوئی بیکار اور لغو سا شعر گنگنا رہی ہے۔ میں اگر زندہ ہوں پھر شامِ اودھ آئیگی۔ یا جانے کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم سب چغد ہیں

نصرت تمکین

غزل

طوفان سے لڑنے والے کب ساحل سے نظارا کرتے ہیں
واقف ہیں جو رازِ ہستی سے ہر غم کو گوارا کرتے ہیں

اب ایسی اندھیری راتوں میں کیا ذکر اندھیری راتوں کا
بے نور چراغوں سے کب تاریکی میں اجالا کرتے ہیں

اے راہروانِ تیز قدم، ہم سُست عناصر بھی اک دن
منزل پہ پہنچ کر دم لینگے، کچھ اور نظارا کرتے ہیں

اِس دورِ تمدن میں ابتک، ہے حسن بہت مجبور ابھی
پردے کی انھیں خواہش بھی نہیں اور پھر بھی پردا کرتے ہیں

اے ذوقِ حصولِ دریابی اک جامِ حوادث اور سہی
مستی کی طلب میں تھوڑی سی تلخی بھی گوارا کرتے ہیں

نالہ نہ زباں تک آنے دے، احساس کو یوں بدنام نہ کر
کیا رازِ درونِ پردہ کو اِس طرح سے رسوا کرتے ہیں؟

کیا غم ہے جو موجِ طوفاں سے ٹکرا کے سفینہ ٹوٹ گیا
ہم اپنی قوّتِ بازو پر تمکینؔ بھروسا کرتے ہیں

اقبال متین

تانبہ اور پانی

ٹُخ ٹُخ ٹُخ ٹُخ —— ہڑ —— اور گھوڑا بدکا۔ گول مول منڈھا ہوا سر تختے سے ٹکرایا۔

ایں اوں ۔ دھت تیری ماں کا ۔ اور اس نے ایک موٹی سی گالی جڑ دی

میں نے ناک سکیڑ کر کہا ۔ ہانکنا بھی آتا ہے تم کو ؟ گھوڑا تو جمعرات کے بازار کا معلوم ہوتا ہے شخص ۔ ساری کی ساری کمائی خود ہی ہڑپ کر جاتے ہو۔ جانور کا بھی کچھ خیال ہے ۔ آج یہ شخص ختم ہو جائے تو بس بھوکے مرجاؤ۔ تم اور یہ تمہارا ننھا —— اور میں نے محبت سے اس کے چکنے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ بے سہارا آنسو جو کسی کی توجہ نہ پا کر خشک ہو گئے تھے میرے ہاتھ کی جنبش کے سہارے پھر بہ نکلے ۔ جیسے میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اتنا بوجھ ڈالا ہے کہ آنسو نکل پڑیں ۔ بالکل ایک پانی بھرے ہوئے ربر کے پتلے گولے کی طرح کہ وزن ڈالیں اور پانی بہہ جائے —— ایں ایں ایں —— دھت تیری روتی ماں کی ، چپ بے ان کے —— اور اس نے ایک دھول لگا دی —— ربر کا ڈلا کھ پچکا ۔ کچھ اور موٹے قطرے لڑھکنے لگے ۔

یہ اس غریب نے کیا بگاڑا ہے ۔ بچوں کو ایسی فحش گالیاں بھی بکتے ہیں کہیں ۔ کل کے دن تمہاری سنی ہوئی گالیاں وہ تم پر ہی نہیں دہرائے گا ؟ کیوں نہ چھوڑ دیا اس کو گھر میں ۔ ایسے لئے پھرتے ہو جیسے زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس کے بغیر ۔ ان کے لئے اس کا پالنا دوبھر ہو گیا ہے کیا ؟ اور میری انگلیاں خود ہی پھر گول مول منڈھے ہوئے ٹنڈ منڈ سر پر کھسکنے لگیں —— ایں ایں اوں میں اب زیادتی ہو گئی تھی —— میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ میں جانتا تھا کہ تانبے کے ایک ٹکڑے کی اہمیت اور اس کی افادیت یہ چھوٹا گھٹا ہوا سر بھی محسوس کر سکتا ہے ۔ میری انگلیاں اپنی جیب میں تیزی سے بھٹکنے لگیں —— ہزاروں آنسو —— گھٹے ہوئے سروں کے نیچے لگی ہوئی مدھم آنکھوں سے نکلے ہوئے ہزاروں ایسے پانی کے قطرے منجمد ہو کر تانبے کے گول گول ٹکڑوں کی صورت میں میری جیب میں محفوظ پڑے تھے ۔ ان پانی کے بوندوں کی ۔ ان خون کے قطروں کی ان سرد کنکروں کی

قیمت مجھے معلوم تھی ـــــ چھوٹے سے بھینچے ہوئے ہاتھ میں، میں نے ایک تانبے کا ٹکڑا ٹھونس دیا اور سارے آنسو جاذب کی طرح اس ٹھوس دھات میں جذب ہو گئے۔

یہ کیا کرتے ہیں آپ ؟ ـــــ اور میرے دل پر ایک دھچکا لگا ـــــ کیا ہو گئی وہ ساری کرختگی ـــ وہ جہالت ـــ دھت تیری ماں کے ـــــــــ اور اب باپ بن بتاتا ہے لچا کہیں کا ـــــ کیا کرتا ہوں ؟ جیسے جانتا ہی نہیں ـــ پیسہ دیتا ہوں پیسہ۔ سکڑے ہوئے پیٹ میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے پانی دیتا ہوں۔ بہت ٹھوس بہت سخت کٹھل اور تانبہ کا سنہرا پانی ـــ بہتا ہوا نہیں منجمد ـــ مجھ سے پوچھتا ہے کیا کرتا ہوں۔ اپنے لونڈے کی آنکھوں کو نہیں دیکھتا ـــ اس کی پتلیوں میں نہیں جھانکتا ـــ ان سرخ ڈوروں کی طرف نظریں نہیں اٹھاتا۔ جو اس تانبہ نے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں دوڑا دئے ہیں ـــ کیا کرتا ہوں۔ جیسے گناہ کیا ہے میں نے ـــ جیسے فرشتہ ہے اس ٹکڑ گدے کا لونڈا۔ جیسے انمول جواہر تھے ان گدلی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ـــ اور جو یہ مٹھی ٹٹولی جائے تو ؟ ـــ آنسو ہی آنسو۔ تانبے کے ان گول سیال ٹکڑوں کے لئے ـــ لیکن یہ ٹکڑے کئی آنسوؤں کو جذب کئے ہوئے ٹکڑے میری کسی جیب میں محفوظ ہو جائیں گے ـــ کمینہ کہیں کا نیچ۔

عادت خراب ہو جائے گی سرکار لونڈے کی ـــ چھوٹی مٹھی میں بھنچا ہوا نم آلود پیسہ میری انگلیوں کی پوروں کو بھگوتا ہوا پھر میری جیب میں محفوظ ہو گیا تھا ـــ ایں ایں اوں۔ جیسے اس تانبہ کی ٹکیہ نے اس کے حلق میں آواز اور آنکھوں میں پانی کو اٹکا رکھا تھا ـــ میرے دماغ کی طرف سوئیاں سی رینگنے لگیں۔ صدیوں سے ہزاروں آنسو اسی تانبے میں جذب ہوتے آئے ہیں۔ اور آج ـــ آج جیسے تانبہ سچ مچ کا تانبہ ہو گیا ہے ـ ٹھوس بہت ٹھوس سخت سخت کچھ بھی نہیں جذب کر سکتا ـــ خون جذب کرنے والا ٹکڑا آج آنسو بھی جذب نہ کر سکا ؟ ایں ایں اوں ـــــ تب کٹھل اور تانبہ کے سہارے ہی تو جیتا ہوں۔ انھیں ٹکڑوں میں میں نے اپنی زندگی کی کتنی داستانیں دفن کر دی ہیں ـــ پانی، خون، اور اس سے بھی زیادہ اور کچھ ـــ میں جھلا گیا۔ ایں اوں جیسے سانپ ڈس رہا ہو جو میرے کان کے پردوں کو ـــ دھت تیری ماں کے۔ اور اب تک انھوں نے گالی بھی نہیں دی ـــ سات پشت کی جہالت، گھٹی میں پڑی ہوئی نکبت جیسے

میں شرافت سے بدل گئی تھی۔ ایسی شرافت جو کثل اور تانبہ سے زیادہ قیمتی ہے۔

اترجائیے مالک! اور میں نے محسوس کیا تانگہ رک گیا ہے۔ گول مول ربر کا پھٹا ہوا گولا میری طرف گھوما۔ سوراخوں سے پانی چھلک رہا تھا۔ بس ہاتھ دیکھو اور بہہ نکلے۔ میری ساری ہمدردی میری ساری محبت انھیں سوراخوں کی اتھاہ میں گہرائی میں کہیں ڈوب مری تھی ——

انگلیاں پھر جیب میں بھٹکنے لگیں —— ایک دو تین اور آٹھ —— آٹھ آنے میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پانی کا ایک گرم گرم قطرہ میرے ہاتھ کی پشت پر چپک گیا —— میں نے دیکھا —— گول مول ٹنڈ منڈ سر کے پاس ہی اس سے ملتا جلتا ایک اور سر جھکا ہوا ہے۔ ایک اور ربر کا پانی بھرا پھٹا گولا —— ہائیں —— تم —— یہ کیا —— کیسی بچوں کی سی حرکت کرتے ہو —— میں نے محسوس کیا جیسے یہ تانبے کے ٹکڑے اب کبھی پانی کو جذب نہ کر سکیں گے۔ اور جیسے ہاتھ کی پشت پر چپکا ہوا پانی کا قطرہ چمڑی کو بھسم کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک سرخ نشان چھوڑ دے گا، ایک دھبہ، ایک کہنہ گدرایا ہوا بھوڑا تانبہ کے رنگ کا —— اور جیسے ہزاروں ربر کے پھٹے ہوئے گولے پچک گئے۔ اُن کے اگلے ہوئے پانی کی طغیانی میں بہہ گیا۔ ڈوب گیا۔ مر گیا ؎

ہوں، اچھا، اچھا تو سنو۔ اب مجھے کچھ کام نہیں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔ چلو چلو، چلوگے واپس؟ —— اور میں بوکھلا کر پھر تانگے میں پھلانگ گیا —— آپ —— آ —— مالک —— کچھ کام نہیں؟ —————— ہوں ہوں —— چلو چلو —— ہشپ ھڑ۔ اور تانگہ رینگنے لگا

میرا ہاتھ پھر اٹھا نہ جانے کیوں؟ کس جذبہ کے تحت —— گول مول ٹنڈ منڈ سر پر رینگتے ہوئے میری انگلیوں کے لمس نے کچھ غیر مانوس سا محسوس کیا —— جیسے کوئی بڑا کھیکڑا غیر ارادی طور پر میرے پنجے میں آ گیا ہو —— میں نے دیکھا ٹنڈ منڈ سر پر پہلے ہی سے ایک کھردرا سخت ہاتھ رینگ رہا ہے۔ ربڑ کے پھٹے ہوئے گولے کے سوراخ جیسے بالکل خشک ہو گئے ہوں۔ جیسے سارا پانی اس کھیکڑے نے پی لیا ہو۔

کتنی محبت، کتنا پیار۔ زندگی کے کتنے ہجوم اور بے لوث جذبے آج اس کے ہاتھ میں

کھنچ کر محدود ہو گئے تھے ——— میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ ایسے سخت ہاتھ تانبہ کی ٹکیوں سے زیادہ ٹھلیاؤں کو جذب کر سکتے ہیں۔

صرف اسی لونڈے کے لئے ہی جندگی کے باکی دن کاٹ رہا ہوں مالک — چھ مہینے ہو گئے ماں مر گئی اسکی۔ کوئی گرض ہو تو دنیا والے آؤ بھاؤ کرتے ہیں۔ کون کرے دیکھ بھال گریب کی — ماں مر گئی — میں نہ مرا۔ اب ڈھویا ڈھویا پھرتا ہوں ——— چاٹ پڑ گئی ہے لونڈے کو گھومنے پھرنے کی ——— یوں ہی لاٹ صاحب کی طرح دن بھر تانگے میں گھومتا ہے۔ بجیہ دلا دو — مرکل دلا دو — آیس کریم دلا دو۔ بڑا جیوٹ بڑا شریر ہے سرکار۔ جانتا ہوں۔ کچھ لکھا پڑھا دوں۔ لکھ پڑھ لیگا تو یاد کرے گا نہیں تو کھیر پر موتیگا بڑا ہو کر۔ اسکی ماں مر گئی، میری کمر ٹوٹ گئی مالک ——— کمر ٹوٹ گئی مالک ——— کھرمی جی لگ گیا جان کو ——— کچھ بھی ہو اس کا سکھ چین دیکھوں بس یہی کمالیس ہے دنیا میں ——— یتیم کھانے میں دال دون تو کچھ کام کاج سیکھ لے گا ——— لیکن چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو ——— یوں کب تک مارا مارا پھرے گا ——— تانگہ ہکالیگا کیا میری طرح۔

باتیں کرتے میں کئی بار اسکی آواز حلق میں پھنس کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے ابھر آتے ہوئے دلی جذبات کو میں اس کے ہاتھ کی حرکات و سکنات سے صاف پہچان رہا تھا۔ آنکھوں کی وہ ساری خصوصیات جو دل کے تابع ہوتی ہیں آج اس کے ہاتھ میں محدود ہو گئی تھیں ——— میں صرف سن اور دیکھ رہا تھا۔ مجھ میں قوت گویائی نام کو نہ تھی۔ دماغ اور آنکھوں کے سوا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جسم کا ہر عضو معطل ہو گیا ہے۔ ایک گہری خاموشی ایک بے نام سناٹا میرے اطراف محیط تھا۔

ٹنڈ منڈ سر پر اسی طرح کھیکڑا رینگتا رہا ——— ٹنڈ منڈ سروں پر اسی طرح کھیکڑے رینگتے رہتے ہیں، لیکن جب یہ کھیکڑے کچھ بے دم سے ہو جاتے ہیں تو ٹنڈ منڈ سر ان کو رینگنے نہیں دیتے

تانگار کا ——— نام کیا ہے جی تمہارا ——— بندو ہے سرکار ——— بندو ہے؟ جی —

میری انگلیاں اوپری جیب میں بھٹکنے لگیں ——— چلر ہے تمہارے پاس؟ ——— ایک دو اور آٹھ ——— دھی تانبے اور کتھل کے آٹھ ٹکڑے ——— وہی منجمد آنسو پھر میرے ہاتھ میں جھنک رہے تھے ——— میں نے پھر ان کو اپنی جیب میں محفوظ کر لیا۔

ٹنڈ منڈ سر کے نیچے پانی سے بھرے ہوئے سوراخوں پر ڈھکنے لگ گئے تھے۔ موٹے موٹے پپوٹوں کے نیچے اسکی آنکھیں کچھ ایسی چھپ گئی تھیں کہ جیسے اب کبھی ایک بوند بھی وہ تانبے کی ٹکیوں کے بھینٹ نہ چڑھائیگی ــــ آداب مالک بندو نے رندھی ہوئی آواز سے کہا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو دعت تیری ماں کے ــــ لیکن میں دروازہ میں گھس گیا تھا ربر کا یہ پھٹا ہوا پانی بھرا گولا ـــ میرے ہاتھ پر ایک دوامی داغ چھوڑ جانے والا گرم آنسو ـــ کھیکرٹے کی طرح ایک سخت اور کھردرا ہاتھ ــــ اور ان سب سے زیادہ ـــ کونین کی ایک کڑوی گولی جسے میں ہضم نہ کر سکا تھا ـــ ایک تلخ جملہ جو کتھل اور تانبے سے زیادہ کسی شرافت کا حامی تھا۔ میرے ذہن میں یہ سب ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے منقش ہو گئے تھے۔

دن گزرتے گئے ـــ میرے ماضی پر گرد جمتی گئی ـــ تانبے اور پانی کا کھیل ہوتا رہا ــــ پرانا کھیل ہوتا رہا ـــ پرانا کھیل پرانی ریت۔ آبائی میراث مارچ کی ایک سرد اور کالی رات میں میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ آج مجھے تانبے کے ٹکڑوں کی پوری قوت آزمانی تھی۔ میری زندگی کا سہارا ـــ میری اندھیری راتوں کا اجالا۔ تانبے کی ٹکیاں، چاندی کے سکے۔ کاغذ کے نوٹ۔ میری اوپری جیب میں سب کچھ محفوظ تھے۔ اور آج۔ آج میں آنسو، خون اور ان سے بھی زیادہ کچھ اور چاہتا تھا ـــ پانی اور خون سے تر کیا ہوا کچا کچا گوشت گداز جسم۔ جس پر تانبے کی ٹکیوں کی مہر لگا کر میں اسکی ساری رعنائی ساری تری کو کھینچ لے سکوں ـــ اور مہر لگ رہی ہے ـــ

تانگے والے، او تانگے والے ـــ ارے میاں، بہرا ہو گیا ہے کیا؟ بھئی ٹھہر تو ہی مرغی کے بچے

تانگا رکا اور میں لپکا ـــ چلو چلو جلدی چلو۔ اور میں نے محسوس کیا میں اڑا جا رہا ہوں اپنی جیب کے سہارے ـــ لیکن ـــ یہ کیا ـــ یہ کیا بدتمیزی ہے ـــ اے بھئی کرایہ بھی کرے گا کہ نہیں کیا دھینگا مشتی مچا رکھی ہے ـــ شرم نہیں آتی بڈھے پر ہاتھ اٹھاتے ـــ بھلا کوئی اس طرح بھول جاتا ہے اپنے کو ـــ کیا واہی تواہی بکے جا رہا ہے ـــ ارے ـــ یہ کیا واہیات حرکت ہے ـــ کہاں ٹھٹھرتا پھرے گا۔ بوڑھا بیچارہ ـــ مر تو نہیں رہا تھا تیرا ٹمٹم اس غریب کے بوجھ سے ـــ نہیں بٹھالے گا ـــ کرایہ دے دوں گا علیحدہ ـــ پھر بھی نہیں!! ـــ ذلیل کہیں کا ٹھرڈنا ـــ یہاں آنا پڑے میاں ــــ ہاں بندو ـــ اور ـــ اور وہ ٹنڈ منڈ سر

—— وہ برکا چھتا ہوا پانی بھرا گولا —— میرے کلیجے پر ایک دھچکا لگا —— جیسے اب میں اپنی جیب کے سہارے کچھ اور آگے نہ اڑ سکوں گا ——

کوئی میرے اطراف ناچ رہا تھا —— کانوں پر ہونٹ رکھے، مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا —— صرف اسی لمڈے کے لیئے ہی جندگی کے باکی دن گجار دیا ہوں مالک —— بھجیہ دلا دو —— مرکل دلا دو —— آیس کروٹ دلا دو —— اس کا سکھ چین دیکھوں بس یہی کھاہیں ہے —— دنیا میں —— لیکن چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو —— یوہی کوئی ناچ رہا تھا میرے داہن، باین، آگے پیچھے —— کئی سال پہلے ٹپکے ہوئے آنسو کی حدت پھر مجھے اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس ہونے لگی

میری انگلیاں اوپری جیب میں جھکیں —— دو چمکتے ہوئے سکے میں نے بوڑھے کے ہاتھ میں ٹھنس دیئے —— مدھم مدھم آنکھوں کے کناروں پر گدلی گدلی پانی کی بوندیاں اٹکی ہوئی تھیں —— میں نے محسوس کیا اب اس کے آنسوؤں کی حدت اسی کی آنکھوں کو جلا دے گی —— آج میرے ہاتھ کی ان تک رسائی نہ ہوئی تھی —— اور اب کسی کے ہاتھ کی ان تک رسائی نہ ہوگی

کوئی چلا رہا تھا —— کستل اور تانبہ انسانیت سے زیادہ قیمتی ہیں —— اور —— اور تانبہ کی یہ ٹکیاں یونہی طغیانیوں کو جذب کرتی رہینگی ۔

کیفی عرفانی

آنے والی کل ہے درخشاں

دھندلی دھندلی ہے آس کی دنیا
ہر قدم پر ہے یاس کی دنیا
میں ہوں پردیس میں مری محبوب

تو نے لکھا ہے "خط نہیں بھیجا
اس لئے کچھ اداس رہتی ہوں
جیسے بجھتے ہوئے چراغ کی لو
اس طرح محو یاس رہتی ہوں"

میں نے اک مل میں نوکری کی تھی
کل مہینے کا آخری دن تھا
آج ہڑتال ہو گئی مل میں
دل کی ہر بات رہ گئی دل میں
تن پہ سوشیل کے، پھٹا کرتہ
تیرے اشکوں کی داستاں ہوگا
کیا کہے گا وہ جب جواں ہوگا
کتنے مفلس تھے والدین مرے

میری محبوب تم ہی بتلاؤ

اس میں اپنا قصور ہی کیا ہے
اپنے اجداد بھی تو مفلس تھے
ان کے حصے میں بھی غریبی تھی
ان کے لب پر بھی تھے یہی شکوے
وہ بھی تھے شاکئ غم دوراں
اپنی میراث ہیں یہ آہ و فغاں

فرق اتنا ہے وہ رہے مظلوم
اپنی آواز کر سکے نہ بلند
ہم ہیں باغی نظام دولت سے
لے کے تازہ بغاوتوں کی کمند
اہل زر کا نظام بدلیں گے
گردش صبح و شام بدلیں گے

میری محبوب اپنے ننھے کو
میرے خط کا جواب سمجھانا
اسکے ننھے سے دل کی دنیا میں
تم بغاوت کی آگ بھڑکانا
تاکہ پھر وہ جوان ہوتے ہی
رسم افلاس کو کچل ڈالے
اور پھر جانتی ہو کیا ہو گا
زخم سینوں کے مندمل ہونگے
ہم عناں گبر آب و گل ہونگے

"آدم"

تاج محل تک

تاج محل؟ ممتاز محل کے دھڑکتے ہوئے دل کی ایک دھڑکن، شاہجہاں اور ممتاز محل کی بے پناہ محبت کی ایک صدائے بازگشت، اور وقت کے سینے پر سوئی ہوئی ایک پر اسرار سرگوشی، اور اسی سرگوشی کو سننے کے لئے آج ہم آگرہ جا رہے تھے۔

پلیٹ فارم پر انسانوں کا ایک جم غفیر پھیلا ہوا تھا۔ بعض ساکت و صامت ایک ستون سے دوسرے ستون تک رینگتے ہوئے چلے جاتے تھے، جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ لیکن بعض انسان چپ چاپ بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ جیسے نیم تاریک نیم روشن فضا میں جھاڑیوں کے زمین پر آسودگی سے لیٹے ہوئے سائے اور دور مغرب میں سگنل کی دو بتیاں یوں سسک رہی تھیں، جیسے کسی راکشش کی آنکھیں شدت گریہ سے ابل کر گالوں پر لٹک آئی ہوں — آگرہ جانے والی گاڑی چار گھنٹے لیٹ تھی۔

میرے سامنے دیہاتیوں کا ایک گروہ فرش پہ بیٹھا ڈبل روٹی کھا رہا تھا۔ دائیں جانب تھوڑے سے فاصلے پر ایک دیہاتی نوجوان لڑکی گھٹنوں کے گرد بانہیں لپیٹے۔ اپنے بچے کے چہرے کو گھور رہی تھی۔ بچہ جو روٹی کا ایک خشک سا ٹکڑا چوس رہا تھا۔

دیہاتی گروہ کے عقب میں بنچ پر ساڑھی میں ملبوس ایک موٹی بھدی عورت سو رہی تھی۔ اس کے اردگرد انسانوں کا ایک بحر بیکراں ابلتا ہوا دور تک پھیل گیا تھا۔

موٹی بھدی عورت کا بچہ سوتے سوتے گویا چونک پڑا "ماں! ماں!!" اس نے اس کے گالوں پر اپنا ننھا سا ہاتھ رکھدیا "ماں! ماں!!" — مگر وہ موٹی عورت چپ چاپ بیٹھی رہی جیسے کوئی کالی بھینس مری پڑی ہو۔

ماں! ماں!! بچے نے اسکے کالے لمبے بالوں کو پکڑ کر نوچا، ماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی "کیا ہے موئے" وہ تنک کر بولی "سوتا کیوں نہیں رنڈیے" لیکن بچہ بدستور ماں ماں چیخ رہا تھا۔

ماں نے ڈبے میں سے بسکٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ "لو" اور پھر اونگھنے کے لئے جھک گئی۔

ایک سرخ دم کتا کتا نہ جانے وہاں کیسے آ گیا جیسے زمین سے ہی تو اُگ آیا ہے۔ دیر تک کان ہلاتا رہا پھر آنکھیں میچ کر اونگھنے لگا۔ وہ دیہاتی نوجوان لڑکی یا ممی اپنے بچے کے لئے پانی لانے نلکے کی جانب جا رہی تھی۔ اور جب وہ لوٹ کر آئی تو اس کے پیچھے پیچھے ایک کتے کا کالا پیلا خارش زدہ قریب سوکھی کھڑ کھڑاتی ہوئی ہڈیوں کا پنجر آ رہا تھا۔ اور جلد ہی ستون سے کمر ٹیک کر بچے کو حسرت آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ بچے نے روٹی کا آخری ٹکڑا کالے پلے کی جانب پھینک دیا۔ وہ اونگھتا ہوا سوں سوں کرتا ہوا ٹکڑے کی جانب بڑھا لیکن —— ! دوسرے ستون سے وہ سرخ دم کتا، کتا ایک تیز و تند بگولے کی مانند دوڑا آیا۔ اور لپک کر اس کالے مریل، خارش زدہ پلے کو گردن سے پکڑ کر دور تک گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

"چیاوں، چیاوں" کالا پلہ وفور کرب اندوہ سے چلایا اونگھتے ہوئے مسلمان خوانچہ فروش نے آنکھیں کھولیں "شی، شی" اس نے اپنے میلا کچیلا رومال ہلایا۔ سرخ کتا روٹی کا ٹکڑا کبھی کا پیٹ میں ٹھونس چکا تھا۔ کالا پلا دم کو ٹانگوں میں دباتا ہوا اندھا دھند پلیٹ فارم سے بھاگا۔ ایک لمبی زقند لگائی اور لائین کے عین وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اور گردن کو چاٹنے لگا۔ جہاں خون کی ایک سوئی سی تہ سردی سے منجمد ہو گئی تھی۔ پھر وہ ایک خالی مال گاڑی کے ڈبے تلے بیٹھ کر چیاؤں چیاؤں کرتا رہا۔

ٹن، ٹن، ٹن اسٹیشن کے مشرقی گوشہ میں گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی اور بچی کو کہا "اٹھو"۔ تمام مسافر جاگ پڑے تھے گویا صور اسرافیل پھونک دیا گیا ہو اور مرقد قبروں سے نکل آئے ہوں۔ ریل گاڑی تیزی سے چنگھاڑتی ہوئی آئی اور ایک عظیم الجثہ دیو کے مانند گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔ مسافر ڈبوں کی طرف بھوکی چیلوں کی مانند لپکے۔ میں نے ایک دو زنانے ڈبوں کی جانب رخ کیا مگر ڈبوں میں تو عورتیں یوں ٹھنسی ہوئی تھیں جیسے مٹی کے مجسمے ٹھونس ٹھونس کر بھر دئے گئے ہوں۔ میں ایک اور ڈبہ کی جانب لپکا۔ وہی موٹی بھدی عورت کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ گردن باہر نکال کر قدرے خشمگیں لہجہ میں بولی۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں نے اسکی باتوں کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ننھی رشید کی کو کھڑکی میں سے اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر تہمینہ بھی اندر داخل ہو گئی۔ اور میں بھی لپک کر انگلے ڈبے میں سوار ہو گیا۔

قریب کی نشست پر ایک لحیم و شحیم گورے چٹے لالہ جی اپنی دھرم پتنی اور ایک سیاہ رنگ کا ثقیل ٹرنک سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ٹرنک کو لاکنڈلے سے پکڑ کر نیچے دھکیلا اور ٹرنک والی کشادہ جگہ پر آرام سے بیٹھ گیا۔ لالہ جی نے غنودگی زدہ آنکھوں سے پہلے ٹرنک پر حسرت آلود نظر ڈالی اور پھر میری جانب گھورنے جیسے کہہ رہے ہوں کیوں میاں۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ لیکن میرے نیلے رنگ کے سوٹ کو دیکھ کر منہ سکوڑ کر چپ ہو گئے۔ چند مسافر اور آگئے اور یہ چھوٹا سا ڈبہ بالکل پر ہو گیا۔ گارڈ نے آخری وسل دی۔ انجن نے دھواں اگلا اور گاڑی چل پڑی۔ میں نے اسٹیشن پر ایک الوداعی نظر ڈالنے کے لئے گردن کھڑکی سے باہر نکالی۔ یاتری مخالف سمت سے بچے کو سنبھالے بھاگی آرہی تھی۔ شاید اسے کہیں جگہ نہ ملی تھی۔ اور آخر ش ہمارے ڈبہ سے ہی لٹک گئی۔

بوڑھا لالہ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے گردن باہر نکال کر چیخا۔ "اتر جاؤ رے مائی اتر جاؤ" لیکن یاتری رقت آمیز لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ بابا دروازہ کھولو بابا میرا بچہ بابا دروازہ کھولو اور گاڑی بدستور رینگ رہی تھی۔ بوڑھا لالہ جھنجھلا کر بولا "اتر جاؤ مائی رے مائی مر جاؤ گی" اور دروازہ کھول دیا۔

ڈبہ کے شمالی کونہ میں سات آٹھ آدمیوں کا ایک گروہ تھا اسکے قریب ہی ایک نیا شادی شدہ جوڑا کبھی کبھی خواہ مخواہ ہنس پڑتا تھا۔ جیسے ندی کا پانی قلقل کرتا ہوا بہہ رہا ہو۔ اس جوڑے کے سامنے چند اجلے کپڑوں والے سکھ بیٹھے تھے۔ ان سکھوں کے نزدیک ایک کونے میں وہ بوڑھا لالہ۔ اسکی بیوی اور میں بیٹھے تھے۔ ہمارے قریب ہی فرش پر لالہ کا ایک بڑا ٹرنک سکھوں کے سفید سفید پانچ چھ گٹھریاں وغیرہ تھیں جن سے فرش بالکل گھرا ہوا تھا۔ یہیں ایک سلاخ کے مانند کھڑکی کے قریب یاتری نصب تھی۔ بیٹھے یا سونے سے لاچار۔! جلد ہی بوڑھا لالہ اونگھتے اونگھتے کونہ میں اندھا ہو گیا۔ گلوبند گلے کے بجائے ٹانگوں سے الجھ رہا تھا۔ شال زمین پر لٹک رہی تھی۔ اور اسکی نوجوان بیوی اس کے پہلو کے قریب یوں سو رہی تھی۔ جیسے وہ فراعنہ مصر کی ایک حنوط شدہ لاش ہے۔

شمالی کونہ میں وہ نیا شادی شدہ جوڑا ابھی تک کھڑکی سے سر باہر نکال کر جھانکنے لگتا اور بادل میں گھرے ہوئے چاند کی دھندلی دھندلی روشنی میں سرگوشیاں تیرنے لگتی —— وہ —— وہ گنبد دیکھ رہی ہو، یہ عہد عتیق کی ایک شکستہ عمارت کا ہے، یہاں شہنشاہ —— لیکن یک لخت لڑکی نے نصف آنکھیں بھینچتے ہوئے سر کو اندر کرلیا۔ اور جلدی سے ریشمی رومال کے ایک کونہ سے آنکھیں ملنے لگی۔

نیلاہو۔
کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ نوجوان چلایا گویا دل میں کرب و درد نے ٹیس سی ہو۔ لیکن وہ چپ چاپ رومال کے گوشہ سے آنکھیں مسل رہی تھی۔ کیا ہوا؟ وہ اس کے رومال کو اسکی آنکھوں سے پرے ہٹاتے ہوئے بولا کیا ہوا؟ اور پھر ایک گہری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے —"میری جان"

"کوئلہ؟" لڑکی کرب انگیز لہجہ میں بولی
"کوئلہ؟" نوجوان چلایا۔ تو پانی کے چھینٹے دو نا" لیکن سردی میں پانی کہاں؟ اور وہ بدستور اپنی نازک مخروطی انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹوں کو مسلنے لگی۔

نوجوان نے لڑکی کے ہاتھوں سے رومال چھین لیا۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھوں کو مسلنے لگا۔
بس! بس!! لڑکی نے جلدی سے سرکو پیچھے ہٹا لیا۔ اور آنکھیں بجلی کے لٹو کی جانب پلٹ دیں جہاں ایک پروانہ اونگھتے ہوئے ابھی تک لٹو کے گرد گھوم رہا تھا۔

"ایں، ایں" بامی کا بچہ اسکی ٹانگوں سے لپٹا ہوا رونے لگا۔ میں نے غنودگی زدہ آنکھوں سے اسے گھورا۔ بامی ایک دھندلا لرزتا ہوا سایہ نظر آرہی تھی

"آ۔ آ۔ آؤ۔ او" منہ میں انگلی ڈال کر وہ بچہ کو چپ کرانے لگی۔ لالہ جی اونگھتے اونگھتے چونک پڑے انکی دھرم پتنی نے ایک کروٹ لی۔

"مائی اسے کہہ چپ کر" لالہ جی بولے
"توبہ!" انکی دھرم پتنی ایک اور کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑائی۔ بچہ چند لمحوں کے لئے چپ کر گیا لیکن بامی کے سے بچے کا سر اونگھتے اونگھتے کھٹ سے کسی چیز سے ٹکرایا۔ بچے نے بلند آواز سے چیخ ماری بامی نے نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑا۔

لالہ جی! ایک لخت بامی التجا آمیز لہجہ میں بولی تھوڑی سی جگہ دیدو۔ لالہ جی اور اس نے اپنی تھکا سے شل ٹانگ کو حرکت دی۔
"پیچھے ہٹ مائی" لالہ جی گرجے
انکی دھرم پتنی نحیف و نزار لہجہ میں بڑبڑائی "توبہ"!
بابو جی! بامی جیسے مجھے کہہ رہی تھی۔ "مائی جگہ نہیں"۔ میں بڑبڑایا اور پھر میری نیند سے بوجھل آنکھوں کے پپوٹے آپس میں جڑ گئے۔ اور ایک لخت میں نے محسوس کیا۔

جیسے کسی غیر مرئی ہستی نے مجھے نور کے ابلتے ہوئے سیلاب سے اٹھا کر تاریکی کے طویل اور بھیانک غار میں دھکیل دیا ہے ــــ میں سو رہا تھا۔

ــــ لیکن جلد ہی تاریکی کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی جگمگاتی ہوئی ایک عمارت آسمان سے زمین پر اترنے لگی۔ جیسے دھوئیں کے مرغولے فضا میں اڑا کرتے ہیں یا روئی کے گالے غیر محسوس ترنم کے ساتھ اتر رہے ہوں ــــ تاج محل ــ ؟

میں رنگین اور چمکیلی تاج محل کی قوس قزح کی مانند نازک اور خوبصورت روشوں پر نہ معلوم کب تک مسرت سے ناچتے ہوئے دوڑتے رہے۔ پھر دفعتہً یہ خواب منتشر ہوگیا: تاج محل دھبوں اور سایوں کے ایک بہت بڑے انبار میں منتقل ہوگیا۔ اور میں چونک پڑا۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ چاند سیاہ و تاریک بادلوں کے غار میں سو رہا تھا۔ اور خنک آلود ہوا کے جھونکے چیختے ہوئے چل رہے تھے۔ ایں! ایں!! اں!! ایامی کا بچہ چیخا۔ اونگھتی ہوئی یامی نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں لالہ نے اپنی بھاری بھرکم ٹانگ نیند کی حالت میں بچے کے منہ پر دے ماری تھی۔ ایں! ایں!! بچہ رو رہا تھا۔ چپ! چپ!! یامی کہہ رہی تھی۔ بچہ چپ کر گیا۔ اور میرے بستر پر رکھے ہوئے اخبار سے کھیلنے لگا۔ یامی کی نیند سے ابلتی ہوئی آنکھیں چند ثانیہ کے لئے بند ہو کر یکدم کھل جاتی تھیں جیسے کوئی بھیانک خیال دیکھ لیا ہو۔ اور اب بھی چند لمحات کے لئے اس کا اونگھتا ہوا سر شانوں کی جانب ڈھلک گیا

"کھر! کھر!! بچہ کاغذ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر منہ میں ٹھونس رہا تھا اور دوسرا ٹکڑا پھاڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اونہوں.. ہٹ ہٹ یامی نے ایک تھپڑ اسکے گالوں پر جما دیا۔ اور پھر سرخ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں اٹھا کر معذرت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہو "بچہ ہے۔ معاف کر دو۔ میں نے کاغذ ایک ٹکڑا پھاڑ کر اسکی جانب بڑھا دیا۔

لو پڑھوگے؟ یامی مجھے تشکر و امتنان کی نظروں سے گھورنے لگی۔

"نہیں باؤ ــــ بچہ ہے" لیکن میں نے زبردستی وہ رنگین تصویر والا کاغذ کا ٹکڑا بچے کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ لیکن میں چونک پڑا اسکی انگلیاں انتہائی سرد ہو رہی تھی، جیسے میں نے غلطی سے ڈسمبر کی سردی سے منجمد سطح والے جوہڑ کے پانی میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔

ننھے بچے نے سردی سے ٹھٹھر کر ایک جھرجھری لی ــــ "ایں اُں ــــ سردی سے کانپتے ہوئے اُس نے

اور
بکی لی۔ لالہ کھنکارتے ہوئے بڑبڑائے "حرامی"! اور زمین پر گری ہوئی شال کو اپنے اوپر اچھی طرح اوڑھ اور کونہ میں بدستور نیم دراز ہو گئے۔ مقابل کے کونے سے دو بوڑھی عورتیں جواب میں کھنکاریں کھانسیں اوں آخ تھو، چپ، چپ، حرامی پلے" شمالی کونہ میں نیا شادی شدہ نوجوان بڑبڑایا "میری جان" اور چپ بگیا مکھو بدستور سامعہ خراش خراٹے لے رہے تھے۔

میں نے بچہ کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا جیسے برف کا ٹکڑا!

بچے کا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے: یا می نہ اونگھتے اونگھتے نیند سے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

"بیمار ہو گیا ہے؟

"ھوں — میں زیر لب گنگنایا۔ اور پھر سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے بولا

کہاں سے آئی ہو؟

غازی نگر؟

سسرال یا —؟

سسرال یا —؟

سسرال:! وہ گلوگیر لہجہ میں بولی

"سسرال" میں نے یونہی لفظ کو دہرایا کیوں؟ ایک لایعنی سا سوال "سسرال" کا رشتہ جو ٹوٹ گیا۔ اسکی آواز میں جیسے چیخیں لرز رہی تھیں۔ تین سال ہوتے غازی نگر میں میری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے دو ماہ بعد وہ فوج میں بھرتی ہو کر برما چلے گئے اور گذشتہ ہفتہ تار آیا ہے کہ وہ جاپانیوں کے ہاتھ —؟ یکلخت وہ چپ کر گئی۔ دھندلی دھندلی روشنی میں اس کی خوبصورت آنکھوں میں لاتعداد آنسو چمک رہے تھے — کانپ رہے تھے، اور جب سفید چادر کے پلو سے اس نے آنکھوں کو پونچھا تو میں نے اس کے چہرے کو پہلی مرتبہ غور سے دیکھا آنکھیں نیند سے ابل رہی تھیں۔ جیسے ابھی پھوٹ پڑ جائیں گے اور تا ابد علیحدہ نہ ہوں گے میرا ہاتھ لاشعوری طور پر یتیم بچے کو پیار کرنے کے لئے بڑھا لیکن میں چونکا بچے کی آنکھیں بھی جاگتے رہنے کی وجہ سے ابل رہی تھیں۔ کچے گوشت کی بوٹیوں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ پیشانی پر خون کا موٹا سا قطرہ چپکا ہوا تھا۔ اور دونوں کے برابر پیشانی ابھری ہوئی تھی جیسے کانچ کی گولی اٹکی ہوئی ہو۔

"بچہ اونگھتے اونگھتے آپ ہی ٹرنک سے جا ٹکرایا اور خون نکل آیا" یاآمی خود بخود بولی۔ میں چپ تھا۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔

ہوا کے جھونکے بدستور آ رہے تھے۔ لالہ سو گیا تھا۔ فقط ٹرنک کا کنڈا کھٹ کھٹ چیخ رہا تھا۔ آگرہ کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا فقط ایک اسٹیشن باقی تھا میں حیرت و ندامت سے یاآمی اور اس کے بچے کو گھور رہا تھا۔ یک لخت میرے دل کے کسی نہ معلوم گوشے میں جیسے ایک آواز لرزنے لگی " اگر تم ایک رات سکڑ کر بیٹھ جاتے تو یہ لڑکی اور اس کا بچہ آرام سے بیٹھ جاتے۔ ان کی آنکھیں نیند سے ابل کر سرخ نہ ہوتیں۔ اور اس ننھے سے بچے کی پیشانی پر خون کا وہ موٹا سا قطرہ نہ جھلکتا جیسے ماں کا خون آلود دھڑکتا ہوا دل۔ لیکن تم تو پاؤں پھیلا کر دو آدمیوں کی جگہ گھیرے ہوئے رہے۔

لعنت! لعنت!! میں نے اس لعنت و ندامت کی تلافی کرنے کے لئے کہا "یاآمی میں یہاں اتر رہا ہوں۔ تم میری جگہ بیٹھ جانا۔ ساری رات جاگتی رہی ہو" میں بھی یہاں ہی اتر رہی ہوں؟ یاآمی نے جیسے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ آگرہ اپنی بہن کے پاس ایک دو دن گزار کر اپنے گاؤں ادھر لوٹ آؤں گی،،

گاڑی آہستہ ہو رہی تھی۔ مینو! مینو!! یاآمی بچے کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ مینو۔ یامی کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔

مینو! مینو!! اس نے اپنے ہاتھوں سے اسکی ٹھوڑی کو اونچا کرتے ہوئے کہا مینو بدستور چپ تھا۔

مینو! ننھے مینو!! میں نے اس کے سرد ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اس نے سرخ ابلتی ہوئی آنکھیں کھولیں بند کر لیں۔ اسکی نبض دھیمے دھیمے میرے ہاتھوں میں دھڑک رہی تھی۔

"نمونیہ"! میرے دل نے دھڑک کر کہا۔ بچے کا چہرہ انتہائی زرد ہو گیا تھا۔

بابو جی اسے کیا ہو گیا ہے؟ یاآمی جگر خراش لہجہ میں بولی

ہوا کا ایک سرد جھونکا میرے کانوں میں نمونیہ! نمونیہ!! چیختا ہوا بھاگ گیا۔ بچے نے سی کرتے ہوئے یوں جھرجھری لی جیسے عزرائیل روح قبض کر رہا ہو یا ابھی اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوا کے جھونکے سے لائین کے پتھروں پہ جا گرے گا۔

"بابوجی" یامی میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی
میں نے غیر اختیاری طور پر بچے کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی —— ؟ جیسے کھوپڑی میں
شیر پگھل رہے ہوں۔
اسے کیا ہو گیا ہے بابوجی ؟ یامی مجھ سے پھر التجا آمیز لہجہ میں بولی۔
"نمونیہ" میرا دل دھڑکا "نہیں کچھ نہیں۔ میں نے یونہی ٹال دیا۔
لالہ جاگ اٹھا تھا۔ وہ نوجوان اپنی بیوی کو جگا رہا تھا۔ دونوں بوڑھی عورتیں اپنی اپنی گٹھڑیاں
سنبھال رہی تھیں —— گاڑی رک گئی۔
رات کے اس طویل سفر کے دوران میں۔ میں رشیدی اور جیکی سے بالکل نہ مل سکا تھا
اس لئے گاڑی رکتے ہی، میں اُن کے ڈبے کی جانب لپکا۔
—— دروازے کے عین وسط میں ننھی رشیدی کھڑی ٹھٹھر رہی تھی۔ لب نیلے ہو گئے تھے۔ اور دونوں
ہاتھوں کو سردی کی وجہ سے بغلوں میں دبائے سی اسی !! کر رہی تھی۔ اور دروازے کے کونے میں جیکی
جیسے آنکھوں میں جنجیں بھرے کھڑی تھی۔
"کیا ہوا ؟ میں نے رشیدی کو کھڑکی میں سے باہر نکالا۔
"—— یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی تھیں" میں نے جیکی سے پوچھا رشیدی جلدی سے
میرے اوورکوٹ سے چمٹ گئی۔ آ!جی ! سردی !! اس کے نیلے نیلے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور
میری انگلیوں میں اپنی ننھی ننھی مخروطی انگلیاں الجھا دیں۔ میں یک لخت چونک پڑا جیسے برف کی
سل سے لپٹ گیا ہوں یا خود برف کا مجسمہ بن گیا ہوں۔ اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ سی!
سی !! اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اور ایک لخت میں نے محسوس کیا۔ اسٹیشن کی تمام بتیاں گل ہو گئی ہیں
چاروں طرف اندھیرا اپنے بھیانک جبڑے کھولے لیٹ گیا ہے۔ اندھیرے میں رینگتا ہوا ایک کالا پلا
روٹی کے ٹکڑے پر لپکتا ہے مگر ایک سرخ دم کٹا کتا اسکی گردن میں اپنے تیز دانت چبھو دیتا ہے۔ اور
دھتکار کر پرے پھینک دیتا ہے۔ کالا پلا ڈبہ کی جانب بھاگ جاتا ہے۔ میری آنکھیں ایک لمحہ کے لئے جھک
جاتی ہیں —— نہیں سرخ کتا نہیں۔ وہاں تو ایک کالی بھینس مری پڑی ہے .... اور ایک لخت
جیکی نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ سو رہے ہو ؟ چلو قلی ٹرنک تو لے آیا۔

نہیں تاج محل —— لیکن میں یکلخت چونکا ...... جمیلی یہ تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ اور رشیدی کے ہونٹ ...... ؟ "سردی" جمیلی قطع کلامی کرتے ہوئے بولی "اس موٹی بھدی عورت نے بیٹھنے بھی دیا کہنے لگی میں پہلے آئی ہوں۔ میں نے کہا۔ میری بچی کو سو جانے دو یہ اونگھ رہی ہے۔ کہنے لگی میں کیا کروں —— اور ایک تم —— ؟ گرم چادر والا ٹرنک بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ میں تو ساری رات جاگتی رہی انتظار ہی رہا۔ رستے میں کوئی عورت اتری بھی تو نہ سے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر قدرے توقف سے "ہاں وہ چادر تو نکالو۔ دیکھو تو رشیدی کو سردی —— لیکن یکلخت وہ رک گئی اور رشیدی کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے متوحش لہجہ میں بولی رشیدی کو کیا ہو رہا ہے ؟

رشیدی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور نبض میرے ہاتھوں میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میرا دل شدت سے دھڑکا "نمونیہ" !! اور اسی طرح ہم رشیدی کو سخت نمونیہ ہو جانے کی وجہ تاج محل دیکھے بغیر وطن واپس لوٹ آئے۔

ابنِ سعید

واپسی

پہلے تو اس کا دل کچھ گھبرانے سا لگا، جیسے وہ وہاں جانا چاہتی بھی ہو اور ساتھ ہی
جانا چاہتی ہو کہ شہر کے باہر کے حصوں میں اس کو وہ پرانے لمبے کھمبے نظر آرہے تھے
میں تیل ڈالنے کے لئے ہر روز شام کو ایک بڑی عمر والا بڈھا اپنے کندھے پر سیڑھی اور صاف
ہوئے لیمپ لٹکائے گھوما کرتا تھا —— یہ لیمپ شاید پہلے نشانات تھے جو اس کو بتاتے
ہے تھے کہ وہ اپنے شہر کے قریب پہونچی جا رہی ہے اور اس خیال کی وجہ سے ہی اس کو
ت گھبراہٹ ہونے لگی!

اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا یہ تمام سفر جو اس نے اتنے جوش و خروش
ساتھ طے کیا ہے بے کار اور بالکل بے مصرف ہوگا۔ اس کا جانا یا نہ جانا سب ایک سا ہی ہے
ش وہ یہ تمام راستہ طے کر کے اتنی دور نہ آئی ہوتی! —— اور اس کو خیال ہونے لگا
جیسے ٹین کی چھت والی وہ لاری جو اب تک باقی تمام راستہ رینگ رینگ کر طے کرتی رہی
ں۔ اب ایک دم بہت تیز چلنی شروع ہو گئی تھی۔ کاش! — اے کاش! —— اور
س کے بھاری بھاری پپوٹے، جیسے اس کی چہرے سے بھری ہوئی آنکھوں کی بدصورتی کو چھپانے
لئے اور بھی بھاری سے ہو گئے۔ اس نے اپنی چھدری چھدری پلکوں کو آنکھوں پر پوری طرح
م جانے ہی دیا۔ اس کے بجائے وہ اُن کے چھدرے پن میں سے بھی باہر کی سڑک کو تکنے لگی
و اب اکیلا تیزی کے ساتھ لاری کے نیچے سے بھاگی جا رہی تھی۔ اور اس کو خیال ہوا کہ جیسے اس
ی لاری پھسل جائے گی! —— کمبخت پھسلتی بھی تو نہیں یہ! —— اور وہ بہت کھسیانی ہو گئی
اس کو چھینک یا شاید آنسوؤں کی ایک نمی اپنی پلکوں پر محسوس ہونے لگی۔ اور اس نے اپنا
سر بالکل ہی لاری کی کھڑکی سے باہر نکال لیا تاکہ لاری کے باقی تمام اونگھتے ہوئے مسافر ا

۔سکی گھیلی اور چھدری پلکوں کو نہ دیکھ سکیں۔

نہ معلوم اس کو اپنی پلکوں کے بالوں کی وجہ سے یا شاید پھر سڑک کے دونوں کناروں
ہوئے لیمپوں کے کھمبوں کی وجہ سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سڑک پر طرح بہ طرح کے جال سے بنے ہوئے
سڑک کے ہر گڑھے پر لاری کی آواز اور بھی جیسے چرمری سی ہو جاتی۔ اور گڑھے کو اپنے پیرا
نیچے کچلتے ہوئے لاری آگے بڑھ جاتی۔ اس کی کچکچاہٹ کتنی زیادہ اونچی تھی! ـــ لیکن پھر بھی جیسے
کے لئے تیار نہ تھی۔ اور سڑک پر بنے ہوئے عجیب عجیب شکلوں کے جال تھے سرعت کے ساتھ مٹ رہے
رہے تھے۔ مگر ان جالوں کی گہری گہری لکیریں! جیسے وہ نرم سی تھی۔ ایسی نرم! ـــ ایسی
اور اس کی سمجھ میں کوئی تشبیہ بھی تو نہ آتی تھی، کیسی نرم؟ اور وہ اپنے دماغ پر جس پر اس کو کبھی بھی
پورا پورا بھروسہ نہ ہوتا تھا، زور ڈالنے لگی جیسے کوئی مزیدار سی تشبیہ سوچ رہی ہو!! ـــ
"میری پیاری ـــ او ڈارلنگ! ـــ شمبھو کے ہونٹ ہمیشہ بھنچے سے رہتے
جیسے اس کو کاٹ کے اور چبا کے چھوڑ دیئے گئے، بعض دفعہ اس کو شمبھو کے ان بھنچے ہوئے دانتوں
ہونٹوں سے کتنی گھن سی آنے لگتی تھی ـــ

"میری پیاری! او ڈارلنگ ـــ!"

اور جب وہ بولتا تو اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں میں سے یک "سی۔سی" کی آواز
نکلتی تھی۔ جس کی وجہ سے تو اس کو بالکل جھرجھری ہی آجاتی تھی، اور جب کبھی بھی اس کو اس طرح پہ جھرجھری
آجاتی اور ہلکا ہلکا سا ڈر معلوم ہونے لگتا وہ شمبھو کے گرم کوٹ کی آستین کو اور بھی بھینچ کے پکڑ لیتی تھی۔ اتنے
سے کہ سخت سخت کھردرے روئیں اس کی انگلیوں میں چبھ جاتے تھے ـــ
"او ـــ شمبھو! مجھ کو چھٹیوں کا کتنا انتظار ہے!" وہ شمبھو کے کوٹ کی آستین سے
ہی چمٹے چمٹے کہتیں

ـــ "اوہ! ـــ شمبھو ـــ شمبھو! اور جیسے شمبھو کا بدوضع سا نام اس کے منہ
اندر دانتوں کے درمیان گونج جاتا تھا، گونج جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے تمام دانت کچکچا اٹھتے تھے
پھر وہ اپنی آنکھیں بھی بند کر لیتی تھی، کیونکہ شاید اس کو یہ کچکچاہٹ بہت ہی بری لگتی تھی۔
اور پھر بعد میں تھوڑی دیر بعد جیسے شمبھو کو اس پر رحم سا آنے لگتا تھا ـــ ہاں تم کو چھٹ

انتظار ضرور ہوگا! ۔ تمھارا وہ بڑا مکان جس کی سیڑھیوں کے دونوں جانب پتھر کے شیروں کے بت بنے ہوئے ہیں ایسے بت جو بالکل زندہ معلوم ہوتے ہیں ـــــ اوہ ڈارلنگ!ـــــ"
اور جیسے اس کے اپنے گلے کی تمام رگیں بس اینٹھ کے رہ جاتی تھیں نہ وہ رگیں اس کے منہ سے کوئی اور بات نکلنے دیتی تھیں، اور نہ ہی اس کے بے چینی دور ہوتی تھی۔ گلے کی یہ تمام رگیں تو جیسے اینٹھ کر اس کا سانس گھونٹ دینے پر تلی ہوئی تھیں ـــــ اور پھر تو وہ اپنی آنکھیں اور بھی بھینچ کر کے بند کر لیتی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے شمبھو اس کی اینٹھی ہوئی رگوں کو دیکھ لیگا۔ اور پھر اس کا تمام حال تاڑ جائے گا۔ اور یہ تو وہ ہرگز بھی نہ چاہتی تھی۔ اس لئے تو وہ اس خیال پر اپنی آنکھیں مضبوطی کے ساتھ بند کر لیتی تھی۔ تاکہ شمبھو کو کسی بات کا بھی پتہ نہ چلے۔ جیسے کہ اس کے اپنے آنکھیں بند کر لینے کی وجہ سے شمبھو بھی کوئی چیز دیکھنے سے قاصر رہے گا!ـــــ

ـــــ اور پھر جیسے شمبھو کے کوٹ کی کھردری آستین بھی نرم اور آرام دہ بننی شروع ہو جاتی تھی، وہ روئیں اس کے ناخونوں کے نیچے گوشت میں اور نہ چبھتے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ اس سکون پر ہی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ شمبھو کا بھاری سا ہاتھ، اس کو خوب تھپک تھپک کر سلائے، اور اس کی بے صبری آنکھوں میں بھی ایک نرماہٹ جھلک آئے۔ ان میں وہ تیزی باقی نہ رہے جو ان میں اکثر جھلک آتی تھی ـــــ اور شمبھو کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں آرام کے ساتھ گھورنے لگیں، ایسے کہ اس کو یہ محسوس نہ ہو کہ جیسے اس کی اپنی چھدری سی پلکیں اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں پر چبھی جا رہی ہیں، اور بس یونہی گھورتے گھورتے شمبھو کہنے لگے۔

"کوشو!ـــــ کوشو!ـــــ تم تو سو جاؤ دیکھو یہ تمھاری آنکھیں، ان میں کتنی نیند بھری ہے۔ اگر تم اب بھی جاگتی رہیں تو یہ آنکھیں اپنی تمام خوبصورتی کھو دینگی۔ اور یہ پلکیں بھی بالکل چھدری ہو کے رہ جائیں گی ـــــ تو، کوشو، تم ضرور سو جاؤ۔ میں تو یونہی بیٹھا گا میں تو وہ تمام باتیں دہرا دونگا جو تم نے جلی بھی مجھ کو بتائی ہیں ـــــ تمھارے مکان کے ڈرائنگ روم کے فرش پر کالے اور سفید پتھروں کا چارخانہ بنا ہوا ہے تمھارے اپنے کمرے میں جو کارنس ہے اس پر وہ صندل کی لکڑی کی بنی ہوئی خوبصورت مورتی ابھی بھی رکھی ہوئی ہے جو تمھارے وہ چچا جو

اب مر چکے ہیں جو اسے لائے تھے، وہ چچا جو تقریباً تمام دنیا کی سیر کر چکے تھے، اور پھر دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے لاہور میں مر گئے تھے ــــ اس صندل کی بنی ہوئی مورتی میں سے ابھی تک بھی خوشبو آتی ہے، وہ خوشبو جو تم کو ان گزشتہ ہوئے دنوں کی یاد دلاتی رہتی ہے ــــ وہ! ــــ ڈارلنگ ــــ کتنی خوبصورت ہوگی وہ صندل کی مورتی ــــ لیکن اتنا کہنے کے بعد جیسے شمبھو۔ اپنے لفظوں کو چبانے لگتا۔ اپنے دانتوں کو بھینچ لیتا۔ اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیتا ــــ اور اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے شمبھو اس کے کان کی لو کو چبا ڈالیگا۔ اس پر زور سے کاٹ لیگا۔ اور وہ چیخ کر اپنی نیند سے جاگ اٹھے گی۔

[illegible] شمبھو کا دھیان کسی اور طرف لگانے لگتی وہ چاہتی کہ شمبھو کو اب کچھ اور باتیں بتانے لگے مثلاً وہ شمبھو کو اپنی بڑی بہن کے بارے میں کہانیاں سنانی شروع کر دے۔ اور وہ شمبھو کو اپنی خوبصورت بڑی بہن کے تمام حالات ایک ایک کر کے بتائے اور اس لئے وہ اس کا ذکر شروع کر دیتی۔

ــــ "شمبھو! ــ او ڈارلنگ! شمبھو! ــ کیا میں واقعی خوبصورت ہوں؟ ــــ

ہاں! ــ ہاں! ــ ہاں! ــــ شمبھو کے دانت جیسے اور بھی کچکچا اٹھتے ــ ہاں! ہاں ــ ہاں ــ بہت ــ بہت ــ خوبصورت!" اور اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے شمبھو پاگل ہوئے جا رہا ہے۔ اور قبل اس کے کہ شمبھو واقعی پاگل ہو جائے، وہ سوچتی کہ وہ اس کو اپنی خوبصورت بہن کا تمام حال بتائے۔

ــــ مگر شمبھو ڈیئر ــ او! ــــ اگر تم میری بڑی بہن کو دیکھو تو تم شاید پاگل ہی ہو جاؤ اور مجھ کو بالکل ہی بھول جاؤ ــ دیکھنا! ــ اس کے بالوں کی لٹیں بالکل سنہری ہیں جب وہ دھوپ میں کھڑی ہوتی ہے، جب تو ایسا لگنے لگتا ہے جیسے وہ تمام کا تمام سونا [illegible] ہو جائے گا۔ اور ہم لوگ اس سے کہتے ہیں ــ گولڈی بہن! ــ وہاں دھوپ سے بچ کر ادھر کھڑی ہو جاؤ! ــ تو خیر ــ واقعی وہ بہت خوبصورت ہے۔ اور اس کا رنگ بھی بہت گورا ہے! ــ ہیں؟ تم تو ایسے دیکھ رہے ہو مجھ کو جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں! سچ! ــ

نہیں! ــ نہیں! ــ نہیں! ــ شمبھو ایک دم سے جیسے چونک اٹھتا ــ

نہیں میں تو یہ نہیں سمجھتا۔ بھلا تم نے کبھی مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ کوشو!
"ہاں تو خیر! —— تو کونڈا! —— مگر ہے وہ ذرا ایسی ہی لڑکی۔ اصل میں شاید
اتنی خوبصورت لڑکیاں سبھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بھلا اس کو چین کون لینے دیتا ہے؟ ——
جب دیکھو اس کے گرد سر پھرے نوجوانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ تمام وقت تمام جگہ! —— اور
وہ سب سر پھرے نوجوان! اگر ان کا بس چلتا؟ —— تو شاید اپنا سر کاٹ کر کونڈا کے حوالے
کر ڈالتے —— اور کوشو کو صاف طور پر محسوس ہوتا کہ شمبھو کی گرفت اس کی پسلیوں پر جن پر
گوشت بالکل بس نام کو ہی تھا، اور بھی سخت ہو جاتی۔ اور جب شمبھو کی گرفت اسقدر سخت ہو جاتی
تو اس کو بالکل یقین ہو جاتا کہ شمبھو کو اس کی تمام باتوں کا پورا پورا یقین ہو رہا ہے، اور اس
لئے پھر تو وہ تمام باتیں ایک سانس میں ہی کہہ ڈالتی۔ شمبھو بھی خاموش سنے جاتا۔ وہ اس کو
کونڈا کی تمام کہانیاں سنا ڈالتی۔ اس کی حرکتوں کو تھوڑا بہت برا بھلا بھی کہتی۔ اس کی مجبوریوں
کا بھی ذکر کرتی، —— اور پھر اس کا انجام!

"اوہ! —— اس دن بیچاری کونڈا کتنی روئی تھی! تمام رات وہ بیچاری چیختی اور روتی
رہی تھی۔ شاید اس کے دکھ بھی اتنا ہی ہو رہا تھا۔ ہم لوگ اس سے کہہ بھی رہے تھے کہ "کونڈا"
بہن! —— اتنا نہ روؤ —— تمھاری آنکھیں بدصورت ہو جائیں گی، ان کی تمام چمک دھل
جائے گی! —— مگر وہ بیچاری تو تمام رات ویسے ہی چیختی اور روتی رہی تھی۔ اور پھر صبح کو
اس کے ہاں وہ بچی پیدا ہوئی تھی جس کا رنگ —— جس کا رنگ! —— اور اس کو پتہ چل
جاتا کہ شمبھو پوری بات سننے کے لئے بے چین ہو گیا ہے۔ اس کا سانس کتنا پھول گیا ہے
اس کا گرم گرم بھاپ جیسا سانس اس کے منہ پر لگنے لگتا۔ اور وہ اپنی بات ختم کرتی ہوئی
کہتی —— اس کا رنگ بالکل کالا بھٹ تھا، اور بس کونڈا کی تو جیسے جان نکل گئی تھی! —— اوہ!
اور شمبھو جیسے یہ پوری بات سن کر کھسیانہ سا ہو جاتا۔ اس کو تو گویا کونڈا کا یہ
قصہ بالکل پسند نہ آیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش بیٹھا رہتا۔ شاید وہ ایسے موقع پر کچھ کہہ بھی
تو نہ سکتا تھا۔ اور پھر کوشو کا جی چاہتا کہ وہ اس کی آنکھوں میں گھورنے لگے اور پتہ چلائے
کہ آخر اس کو اس کی باتوں کا یقین آ رہا ہے یا نہیں، پر دراصل اس کو کبھی بھی شمبھو کی

آنکھوں سے کوئی بات ٹھیک پتہ ہی نہ چلتی تھی۔ وہ تو جیسے پتھر کی تھیں جن میں تمام وقت بس ایک بے صبراپن بھرا رہتا تھا۔ اور اس کو شمبھو کی آنکھوں پر غصہ آنے لگتا تھا۔ وہ کوشش کر کے اس کی آنکھوں کے پاس سے بہت دور ہٹ جانا چاہتی ——

اور پھر جب شمبھو چلا جاتا تو وہ آپ ہی آپ سوچتی کہ خواہ مخواہ اس نے کونڈالا کا تمام قصہ شمبھو کو سنا ڈالا۔ اس سے تو وہ قصہ قمر کو سناتی جو شاید اس کی باتوں پر ذرا یقین کرتا تھا۔ اور جس کی آنکھوں میں اتنا بے صبراپن بھی کبھی بھی بھرا نہیں ہوتا تھا۔

قمر! —— قمر کو دیکھتے ہی تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ وہ اس کی رنگ برنگی ٹائی میں جھولنے لگے نہ معلوم کیوں؟ پر ہمیشہ قمر کی رنگ برنگی ٹائی اس کو بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کو دیکھ کر اس کا بے اختیار جی چاہنے لگتا تھا کہ وہ اس کی ٹائی پکڑ کر خوب جھولنے لگے۔ جیسے وہ چھوٹی سی اُلّو کی شکل کی بنی ہوئی پن جو تمام وقت اس کی ٹائی میں جھولتی رہتی تھی۔

قمر! —— قمر! —— اور وہ قمر کو اپنے بھائی کا تمام حال بتا ڈالتی۔ قمر سے بھی زیادہ اس کو ہمیشہ اپنا بھائی پسند تھا۔ لیکن قمر بچارا بھی اس کے بھائی کا قصہ بالکل خاموشی سے سنتا تھا۔ بلکہ اس قصے میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اور یہ ہی بات بعض دفعہ کو شو کو بہت عجیب معلوم ہوتی تھی۔

بلکہ بعض بعض دفعہ تو قمر خود ہی اس کے بھائی کا ذکر شروع کر دیتا تھا۔ گو کہ کبھی بھی اس کو اس کے بھائی کا نام ٹھیک طرح پر یاد نہ رہتا تھا۔ یا شاید اس کے بھائی کا نام تھا ہی اتنا ٹیڑھا —— رونالڈو! —— رونالڈو! —— قمر کو بتانے کے لئے وہ اپنے بھائی کا نام کتنی ہی بار دوہرایا کرتی تھی۔

رونالڈو! —— جیسے کسی اطالوی یا ہسپانوی مصور کا نام ہو!

—— اور وہ ہے بھی بس ایسا ہی آرٹ کا شوقین، جب اٹلی کے کسی اوپیرا ہاوس کا ذکر کرتا ہے تو بس جیسے خود بھی وہیں پہنچ جاتا ہے۔ تمام وقت، مرتا ہے وہ تو بس آرٹ پر! —— اور ہم لوگ تو سب اس سے جلے مرتے ہیں۔ بچارا رونالڈو! اس کو تو شاید پتہ بھی نہیں کہ ہم

لوگ اس سے کتنے جلے مرتے ہیں!

قمر روناالڈو کا پورا پورا قصہ بہت شوق سے سنتا۔ کبھی کبھی تو وہ شمبھو کی طرح یہ بات کوشو پر ظاہر کرتا تھا کہ جیسے اس کو کوشو کی تمام باتوں کا یقین مشکل سے آتا ہے۔ بلکہ وہ تو خود بھی اپنے اٹلی کے سفر کے قصے سنانے شروع کر دیتا تھا۔ وہ اس بات پر افسوس بھی ظاہر کرتا کہ وہ اٹلی میں کبھی بھی روناالڈو سے نہ مل سکا تھا۔ اگر وہ کوشو کو پہلے سے جانتا ہوتا تو شاید وہ روناالڈو سے ملنے کا موقع ضرور نکال لیتا! —— اور بس قمر کی ایسی ہی باتوں کو سن سن کر تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہے۔ قمر کے سامنے اس کو کبھی بھی وہ ڈر محسوس نہ ہوتا تھا جو اس کو شمبھو کی موجودگی میں محسوس ہوا کرتا تھا۔ کوشو کو تو خیال ہوتا کہ اگر وہ یہ تمام باتیں کسی کو بتاتی نہ اور یونہی اپنے دل میں چھپائے رہتی تو شاید وہ اندر ہی اندر گھٹ کر مر جاتی!

اندرا اور ڈورس کی خاموشی؟ —— اُفوہ! جیسے وہ تو اس کے دماغ میں گرم گرم لوہے کی سلاخوں کی طرح چبھا کرتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اس ڈورمیٹری میں! —— تمام دن تمام رات تمام وقت! —— ان سے اس کی طبیعت کس قدر گھبرایا کرتی تھی! ہوسٹلوں کی بسری تو ایک مصیبت ہے۔ ویسے تو خیر خوب آزادی ہوتی ہے۔ پر ڈورس اور اندرا جیسی لڑکیوں کے ساتھ تمام تمام دن گزارنا پڑتا ہے۔ واقعی جیسے لوہے کی سلاخوں سے اس کے دماغ کو چھلنی کرنے کے بعد وہ دونوں اس کے دماغ میں گرم گرم ابلتا ہوا سیسہ انڈیل دیں گی۔

ڈورس کا خیال تھا کہ وہ انگریزی گانے بالکل سو فیصدی انگریزی طرز سے گا سکتی ہے انگریزی گانوں کے ساتھ ساتھ وہ دن دن بھر امریکن اور کانٹی نینٹل گانے بھی تو ہنکارتی رہتی تھی۔ آرام کرسی کی بید کی بنی ہوئی پشت پر انگلیاں تھپتھپاتے ہوئے وہ گانا شروع کر دیتی —— لاکوکاراچا —— لاکوکاراچا —— لاکوکاراچا! —— اور کوشو کو اس بات پر چلن جھنے سی لگی تھی۔ شاید اس کی جلن اس لئے اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ کوئی دس بار وہ اندرا اور ڈورس کو بتا چکی تھی کہ اس نے یہی دھن جنوبی امریکہ کے بعض بہت اچھے اچھے گانے والوں سے سن رکھی ہے جب وہ بمبئی گئی تھی! —— ہاں جب وہ ایک بار کرسمس پر بمبئی گئی تھی تو اس سے

ایک دوست نے اس کو ایک ہوٹل میں دعوت دی تھی۔ وہ ہوٹل بالکل امریکن تھا — خالص امریکن — اور وہاں پر کھانے کے وقت جنوبی امریکہ کا آرکسٹرا بج رہا تھا۔ باجہ بجانے والوں نے اسپین کے پرانی وضع کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور پھر انہوں نے یہی گانا سنایا تھا — "لاکوکاراچا لاکوکاراچا!" — اور ڈورس اٹھکر بھاگ جاتی!

ڈورس اس قصے کو کتنی ہی بار پورا پورا سن چکی تھی۔ اب تو اس کی طبیعت شاید بالکل بھر گئی تھی۔ لیکن پھر بھی جب اس کا بس چلتا تو وہ آرام کرسی کی بید کی بنی ہوئی پشت پر انگلیاں تھپتھپاتے ہوئے یہی دھن گانے لگتی تھی — اور اندرا! — وہ تو بس خاموش بیٹھی رہتی تھی جیسے وہ خاموشی ہی خاموشی میں کوشو سے کہہ رہی ہو — "کوشو! تم نے چاہے یہ گیت جنوبی امریکہ کے گانے والوں سے سنا ہو، یا چاہے کسی سے! — مگر ڈورس بھی تو کوئی بُرا تو نہیں گاتی ہے! — ذرا سنو تو اس کی آواز!" — اس کی آواز؟ — جیسے کوشو کے دماغ پر کسی نے اینٹ کھینچ ماری ہو۔ اس کا دماغ جھنجلا ہوتا۔ وہ آپ ہی آپ فیصلہ کر لیتی کہ وہ ایسی سطحی لڑکیوں پر زیادہ غور کرنا چھوڑ دے گی۔

کاش! — کاش! — وہ دونوں اس سے اسقدر نفرت نہ کرتیں اور کاش وہ خاموشی کے ساتھ اس سے اس کی بمبئی کے سیر کے حالات کم از کم ایک بار اور سن لیتیں۔ وہ پھر ان کو اور بھی تو باتیں بتا دیتی۔ ان کو جنوبی امریکہ کے گانوں کے بارے میں کتنے ہی قصے سنا ڈالتی — اوہ! — ان دونوں کے دماغ کتنے بگڑے ہوئے رہتے تھے۔ ان میں ذرا بھی تو کوئی ڈھنگ کی بات سوچنے کا سلیقہ نہ تھا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خوب زور زور سے رونے لگے، ان دونوں کا منہ نوچ ڈالے! — یا پھر اس وقت قمر یا رونالڈ یا خیر محمد ہی آ جائے، اور وہ ان لوگوں کو بتائے کہ وہ دو لڑکیاں جو اس کے ساتھ تمام وقت رہتی ہیں کتنی سطحی ہیں دراصل وہ دونوں بالکل اوچھی طبیعت کی ہیں ان کے دماغ بھی خالی ہیں ان میں کوئی بھی اعلیٰ قابلیت موجود نہیں ہے۔ اور اس لئے وہ محض اس کو دن دن بھر چڑایا کرتی ہیں، ان کے بس میں کچھ اور ہے بھی تو نہیں! اور ان دونوں کے سامنے ہی اگر وہ قمر کو جنوبی امریکہ کے گانے والوں کے حالات سنائے تو وہ ضرور یقین کر لیگا۔ ڈورس اور اندرا

کے ساتھ تو ایسی باتیں کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے ——
اس کو پتہ بھی نہ چلا کہ کس ! اور پھر تمام جال ایک دم سے غائب ہو گئے ——
وقت وہ جال غائب ہو گئے، انھوں نے تو جیسے اپنی آنکھیں جھپکائیں — اور بس ! —— جب اس
نے اپنی جھیدری جھیدری پلکوں کو پوری طرح کھول کے دیکھا تو ۔ بس سڑکوں پر سے وہ جال غائب تھے
وہ لمپوں کے کھمبوں سے پرے، اور دھندلے دھندلے حقیر سے مکانوں سے پرے شاید سورج کا فی دیر
ہوا ڈوب چکا تھا ۔ اب تو بس اس کی ایک ہلکی سی سرخی اس طرف آسمان پر باقی رہ گئی تھی ۔ اور اسی
لئے سڑکوں کے عجیب غریب جال غائب ہو گئے تھے، اور ان جالوں کے غائب ہو جانے پر جیسے کو شوکو اُمچ
ہونے لگا !

اس کو محسوس ہوا کہ جیسے ابتک تو وہ ان جالوں میں کھوئی ہوئی تھی ۔ اور اس لئے کچھ محفوظ
تھی پر اب تو ! —— وہ حقیر سے مکانوں کے ڈھانچے اندھیرے میں بھی کتنے واضح تھے ! جیسے محض
اس کو منہ چڑانے کیلئے اس اندھیرے سے باہر چلے آئے ہوں ! اور اب سب مل کر اس کو منہ
چڑا رہے تھے ۔ اور لاری بھی تو ہر ایک گڑھے میں سے جھکولے کھاتی ہوئی گزر رہی تھی، اتنی تیزی کے ساتھ
جیسے پھسل ہی پڑے گی پر پھسلتی بھی تو نہ تھی وہ کمبخت ! سڑک تو ویسے ہی اس کے ڈر سے پیچھے بھاگی
جا رہی تھی ۔

—— اور تیز سی بدبو کے ایک بڑے سے بھپکے نے اس کو بتا دیا کہ وہ شہر کے بالکل بیچ میں
پہونچ چکی ہے ۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر جھانکنا ضروری سمجھا ۔ کیونکہ وہ بغیر دیکھے ہی ٹھیک
طور پر سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس جگہ پہونچ چکی ہے ۔ اور بجائے اندھیرے میں باہر جھانکنے کے وہ اپنے
سامان کی طرف متوجہ ہو گئی ۔ اس کے سامان میں دو تین بد وضع سی پوٹلیاں خاص طور پر نمایاں اور
بے ہنگم تھیں، ان پوٹلیوں کو وہ اکیلے کیسے سنبھالے گی ! پر وہ ان بد وضع پوٹلیوں پر زیادہ وقت بھی ضائع
نہ کرنا چاہتی تھی —— اور آخر وہ لمپ کا کھمبا آن ہی پہونچا جس میں اس نے شاید اپنی تمام عمر میں
کبھی بھی روشنی جلتی نہ دیکھی تھی ۔

مہیشر ! تمہاری لاری تو اتنی دیر سے آئی ہے، اُف —— اوہ ! —— اس کا چھوٹا بھائی
ایک لمپ پوسٹ کے قریب کھڑا اونگھ رہا تھا ۔ اس نے اس کے باپ کا پرانا چسٹر پہن رکھا تھا جس میں

وہ بالکل چھپ گیا تھا۔ اور محض اس کا چوہے کی رنگت کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس نے اپنی ہاتھ کی کھردری کھال سے اپنی ناک کو رگڑنا شروع کر دیا تھا۔

ہلو ——— ایرک! لیکن جیسے تمام لفظ اس کے حلق میں پھر اٹک کے رہ گئے تھے۔ اور وہ زیادہ بولنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس لئے خاموشی سے ایرک کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا جو شاید ناک رگڑتے رہنے کی وجہ سے کچھ گیلا سا ہو رہا تھا اور ان دونوں نے تمام سامان آپس میں بانٹ لیا۔ تیزی کے ساتھ وہ دونوں چلنے لگے۔ اپنے تیز تیز چلنے کے ساتھ ساتھ ایرک کو جیسے وہ اپنے ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔

"ہلو۔ کوشو! ——— ہلو کوشو! ——— ہلو کوشو! ——— اور ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی اس کا وہی بے جان سا استقبال کیا گیا تھا۔ اور وہ فیصلہ بھی نہ کر سکی کہ کوئی دو سال بعد اپنے گھر میں واپس آجانے پر وہ خوش ہے یا نہیں!

آؤ بیٹا۔ کوشو! ——— آگئیں تم! ——— اس کی سوتیلی ماں اس پرانی آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اور اپنی عادت کے مطابق سر ہلا ہلا کر بول رہی تھیں۔ وہ بالکل اسی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں جہاں پر کوئی دو سال ہوئے وہ ان کو بیٹھا چھوڑ کر گئی تھی ——— اس نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں ابھی بھی وہ چالاکی اور بے ایمانی باقی ہے جو آج سے دو سال پہلے بھی ان میں موجود تھی، ———

"میں تو پریشان ہی ہو رہی تھی کہ لاری کو اتنی دیر کیوں لگی کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں ہے! ——— کہ تم آبھی گئیں۔ چلو اچھا ہے! آرام سے کٹا سفر ——— اور کوشو خاموش کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی سوتیلی ماں سراسر جھوٹ بول رہی تھیں نہ وہ لاری کے دیر ہو جانے پر، پریشان تھیں۔ اور نہ ہی وہ اس کے واپس آجانے کو کوئی بہت اچھی بات سمجھتی رہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں ابھی بھی وہ اکتا دینے والی گونج باقی ہے جو دو سال پہلے بھی اتنی ہی کرختگی کے ساتھ موجود تھی۔ اور جب ایک ٹمٹماتے ہوئے بلب کی مدھم روشنی سے اس کی آنکھیں مانوس ہو گئیں تو اس نے اپنی سوتیلی ماں کے چہرے کو اور بھی غور سے دیکھا۔ اس چہرے میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ البتہ کنپٹیوں کے بال ذرا اور سفید ہو گئے تھے، اور دونوں گالوں کی کھال کی جھریاں اب لٹک کر ان کے گلے کے قریب کے گلگلے گوشت سے آملی تھیں۔ اور اس کو ذرا تعجب ہونے لگا۔ اس کو خیال ہوا کہ جیسے اس آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے اور یہی طنز آمیز باتیں کرتے کرتے اس کی

لی ماں کو دو سال گزر گئے ہیں۔ یہاں سے تو دو لمحہ کو بھی وہ ہلی نہیں رہی۔ یہاں پر ہی بیٹھے بیٹھے
ی کنپٹیوں کے بال ذرا سفید ہو گئے ہیں۔ اور ان کے گالوں کے کھال کی جھریاں کچھ اور نیچے کو لٹک
رہی ہیں۔ ان کے چاروں طرف کا سامان بھی بالکل اسی طرح پر بکھرا رہا ہے۔ اور بس یوں ہی انھوں نے
ے دو سال گزار دیئے ہیں۔ محض اس لئے وہ اس کی واپسی پر اس کو اسی طنز آمیز لہجے سے "ہلو!"
ہکیں، اور وہی روکھا سا استقبال کر سکیں ——— اور کوکشو کا دل تو ابھی سے بیٹھا جا رہا تھا!

ابھی سے وہ اندر ہی اندر گھٹی جا رہی تھی۔ وہ پورے دو سال بعد یہاں آئی تھی مگر ابھی سے
س کا دل گھبرانے سا لگا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کو یہاں پر قید کر دیا گیا ہے۔ اور
س کی سوتیلی ماں کو اس پر ذرا بھی تو رحم نہ آ رہا تھا۔ بلکہ اُن کی آنکھوں میں تو وہی مسکراہٹ موجود
تھی جو ڈورس اور اڈورا کے ہونٹوں پر تمام وقت کھیلتی رہتی تھی۔

پھر رات کو جب اس کو بہت دیر تک نیند نہ آئی تو اس کو قریب کے ہی پلنگ پر ایرک کے ناک سنکنے
کی آواز کافی زور سے آئی، اور اس کو پتہ چل گیا کہ ایرک ابھی تک بھی برابر کے پلنگ پر پڑا جاگ رہا ہے۔

ایرک ——— !

"کیا ہے سسٹر؟ نیند نہیں آتی!" "آئے تو ذرا یہاں آ جاؤ نا میرے پلنگ پر۔ اور ایرک تو جیسے اس کا
منتظر ہی بیٹھا تھا، ایک چھلانگ مار کر وہ اس کے پلنگ پر کود آیا اور بالکل اس کے پیٹ پر ہی آن کر گرا۔ مگر اس کا
جی نہ چاہا کہ وہ ایرک کو اس بات پر کچھ ڈانٹے کیونکہ اسکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ایرک کی
موجودگی کی وجہ سے ذرا اس کو سکون رہیگا ورنہ وہ یہاں اپنے گھر میں واپس آکر شاید گھٹ گھٹ کر مر جائیگی۔

اور ایرک نے اس کے بغیر کہے ہی اس کی سوتیلی ماں اور محلے والوں کے تمام قصے اس کو سنانے
شروع کر دیئے، وہی پرانے قصے جو کوکشو اپنے ہوش سنبھالنے کے وقت سے برابر سنتی چلی آئی تھی۔ وہی
گھناؤنی باتیں وہی بھدے بھدے مذاق۔ وہی چھوٹی چھوٹی تقریبیں جن میں کسی نہ کسی کی لڑائی
ضرور ہوتی، اور وہی لوگوں کا ایک دوسرے پر باتیں بنانا ——— غرضیکہ اس کا تمام گھر بلکہ گھر کے چاروں
طرف کی دنیا بھی ابھی تک بالکل اسی جگہ پر تھی جہاں وہ اب سے شاید ہزاروں سال پہلے تھی اور
جیسے ان تمام سالوں کا بوجھ سہارنے کیلئے صرف وہی ایک بیچاری کوکشو رہ گئی تھی اور اس کو
محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے گی۔

"ایرک! ۔ تم کو وہ گانا آتا ہے؟ ۔ لاکو کارا چا۔ لاکو کارا چا" اس نے اتنے بے تکے پن سے یہ سوال کیا کہ ایرک دو چار منٹ خاموش لیٹا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ نہ جانے کوشو سسٹر کو کیا الٹی سیدھی باتیں یاد آ رہی ہیں اور نہ جانے وہ اس کے وہ تمام قصے سنتی بھی رہی ہیں یا نہیں جو وہ اتنی دیر سے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کو سناتا رہا تھا۔

"نہیں! ۔ کوشو سسٹر! مجھکو تو ذرا بھی نہیں آتا وہ گانا۔ ہاں بہت دن ہوئے جب میں نے ایک ٹیکنی کلر فلم دیکھی تھی اس میں یہ گانا تھا۔"

"ہاں! سا ایرک۔ یہ گانا بہت اچھا ہے نا؟ میں تم کو سکھا دونگی۔ اور پھر تم گاتے پھرنا! ۔ اور ایرک تم اٹلی جاؤ گے؟ ۔"

"اٹلی؟" ۔ ایرک نے تو اٹلی کا نام بھی صرف لڑائی کی خبروں کے ساتھ سنا تھا۔ وہ اب اندھیرے میں کوشو کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ معلوم کرے کہ آخر کوشو کے دل میں کیا بات ہے اور وہ کیوں ایسی الٹی سیدھی باتیں اس سے کر رہی ہے۔

— خیر۔ ایرک! ۔ اٹلی بہت خوبصورت ملک ہے وہاں بڑے بڑے مصور اور میوزیشن رہتے ہیں تم اٹلی ضرور جانا بیٹر جھیا! — اور وہاں پینٹنگ اور میوزک سیکھنا اور پھر جب تم اٹلی سے واپس آؤ گے تو تم اپنا نام ایرک کے بجائے ذرا آرٹسٹک رکھ لینا۔ تم اپنا نام مثلاً رونالڈو رکھ لینا۔ اور پھر تم تمام دنیا میں مشہور ہو جاؤ گے — اور پھر جب تم واپس آؤ گے تو تمہارا ایک مکان ہوگا۔ بہت بڑا۔ جس کی سیڑھیوں کے دونوں جانب شیر کے بت بنے ہوں گے —" ہاں میں شیر کے بت پر ضرور چڑھونگا۔ کمپنی باغ میں جو شیر کا بت ہے اس کا تو ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے — وہ شیر کے بت بالکل زندہ معلوم ہوں گے۔ اور تمہارے مکان کے ڈرائنگ روم کے فرش پر کالے اور سفید پتھروں کا چار خانہ بنا ہوگا۔ کارنس کے واسطے تم اٹلی کے خوبصورت مرمر کے بنے ہوئے بت لانا — ہاں دیکھو ایک خوبصورت سی مورتی میں خاص اپنے کمرے میں رکھونگی اور لوگوں کو دکھایا کرونگی کہ مورتی میرا بھائی رونالڈو اٹلی سے لایا تھا — اور تمہارے بال بھی خوبصورت ہوں گے۔ بالکل سنہری — اور تمہارے ہاتھ نرم نرم — اور ایسے — ایسے جیسے کہ تمام مصوروں اور وائلن بجانے والوں کے ہوتے ہیں — نرم — اور بھولے بھالے —"
اور کوشو نے کمبل کے اندر ایرک کا ہاتھ ٹٹولنا چاہا۔ اس کے کھردرے ہاتھ کی کھال پر ابھی تک

بھی نمی سی تھی۔ بیچارے کو نزلہ ہی اتنا رہتا تھا کہ تمام وقت وہ اپنی ہتھیلی سے رگڑ رگڑ کر ناک صاف کرتا رہتا تھا ——— اور کوشو نے پھر اپنی الٹی سیدھی باتیں شروع کر دیں۔ ایرک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے تھامے ——— اور میرے لئے کتنے ہی سر پھرے نوجوان ہمارے گھر کا چکر لگایا کریں گے۔ پھر میں گایا کروں گی "لاکوکاراچا! ——— لاکوکاراچا! ——— گاؤں گی ——— اور ——— اور ——— اور ایرک کا جماہی جیسا گرم گرم سانس بالکل اس کے چہرے پر لگ رہا تھا۔ وہ خراٹے ایسے لے رہا تھا جیسے بلی خُرخُر کر رہی ہو۔ اور کوشو کا ایک گرم گرم آنسو، اس نے اپنے ہاتھ سے پونچھ ڈالا۔ اور پھر اپنے کھردرے ہاتھوں کو کوشو ہیسٹر کے گلے میں ڈال کر پھر خُرخُر کرنے لگا! ——— ———

——— اور کوشو کے پپوٹے بھی شاید ایک طرح کی نمی کی وجہ سے بہت بھاری سے ہو گئے۔ اور جیسے اس کی چھدری چھدری پلکیں شاید اس کی آنکھوں کی بدصورتی کو چھپانے کے لئے کچھ اور جھک گئیں!! ———

ہنسراج رہبر

نئی ماں

عورتوں کے کمرے سے نکلتے ہی ساوتری نے آنکھیں کھولیں اور اس کی ممتا بھری نگاہیں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔ وہ بڑی بے صبری سے کچھ کھوج رہی تھی۔

"بچے کو دیکھنا چاہتی ہو؟" بلدیو نے دریافت کیا۔ "ہاں، کہاں ہے؟" اس نے دبی آواز میں کہا

مردہ بچہ چارپائی کے قریب فرش پر پڑا تھا بلدیو نے اس پر سے کپڑا ذرا سرکایا۔ ساوتری سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ لیکن اس کی نگاہیں ننھے پر اچھی طرح نہیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے کمزور جسم کو حرکت دی اور گردن کو مزید اوپر اٹھایا۔ اب وہ بچے کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

"آنکھیں تو بڑی بڑی ہیں"

"ہاں، آنکھیں خوب بڑی ہیں"

"اور بال ......"

دروازے پر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ساوتری کا اٹھا ہوا سر پھر تکیے پر جا گرا اور اس نے کرب آمیز لہجے میں کروٹ بدلتے ہوئے کہا:- "ڈھانپ دو، ڈھانپ دو۔ ہمارا کیا ہے اس میں مٹی ہے۔"

"اچھا جی، اب میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں" دائی نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی کہا

"ہاں لے جاؤ" بلدیو بولا۔

"میں اسے ہسپتال میں لے جا کر لیڈی ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کراؤں گی۔ وہ بتا دے گی کہ بچہ کیوں مرا ہے۔ اور کب مرا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ کے لئے احتیاط برتی جائے گی"

دائی نے بچے کی لاش کو اٹھا کر اس پر کپڑا ڈھنگ سے لپیٹنا شروع کیا۔ بلدیو جانتا تھا کہ اگر وہ اتنی جلدی کمرے میں لوٹ نہ آتی تو ساوتری بچے کو ابھی اور دیکھتی۔ اس کے دل میں دیکھنے کی حسرت باقی رہ گئی ہے۔ اس لئے وہ بولا:-

"انہیں ذرا دکھا تو دو۔ یہ دیکھنا چاہتی ہیں" اور اس نے ساوتری کے کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے اسے کروٹ بدل کر بچے کو دیکھ لینے کے لئے کہہ رہا ہو۔ دائی نے لاش کو اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

"نہیں، نہیں" ساوتری تیز آواز میں چلائی "میں نہیں دیکھوں گی، لے جاؤ۔ میں نہیں دیکھوں گی"

اس احتجاج کے بعد بلدیو اور دائی سے کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساوتری کے الفاظ "نہیں، نہیں، میں نہیں دیکھوں گی" فضا میں گونج رہے ہیں، اور وہ متواتر گونجتے رہیں گے اور ان میں کچھ ایسا ہمہ گیر درد ہے کہ ان کی کسک ہر لحظہ بڑھتی جارہی ہے۔ اور "مادرِیت" کی روح کو تڑپا رہی ہے۔

دائی کے کاروباری ہاتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ساتھ لائی تھی جس میں دوائیاں تھیں اور دیگر ضروری چیزیں بھی۔ اب اس میں سے ربڑ کا خاصہ بڑا ٹکڑا نکالا اور وہ لیے دوہرا کر کے ایک تھیلے کی شکل میں سینے لگی۔ اس نے کام جلدی ختم کرنے کے لئے سوئی کو تین چار جگہ ربڑ میں سے بیک وقت گذار دیا اور ذرا کوشش کے ساتھ اسے اوپر کھینچتے ہوئے بولی:

"مردہ بچے کو جنانا بہت مشکل ہے بابوجی۔ ۹ بجے سے لگی تھی۔ صبح کے تین بج گئے۔ محنت کرتے میری تو انگلیاں رہ گئیں"

دائی نے یہ بات چوتھی مرتبہ دہرائی۔

"جی ہاں بہت مشکل ہے۔ ایسے نوّے فیصدی کیس خراب ہو جاتے ہیں اور زچہ کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے"۔ "میں نے سینکڑوں کیس کئے ہوں گے۔ آج تک ایک بھی خراب نہیں ہوئے" دائی کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں۔ "دوسری گلی میں جو چڈھا صاحب رہتے ہیں ان کے پانچوں بچے میرے ہاتھوں میں پیدا ہوئے۔ جو ایک کیس مجھ سے کروالیتا ہے۔ پھر دوسری جگہ نہیں جاتا"

"کیوں نہیں، دنیا میں قابلیت کی قدر ہوتی ہے"

دائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بلدیو کا تعریفی جملہ سن کر وہ اتنی خوش ہوئی جیسے اسے میڈیکل بورڈ سے قابلیت کی سند مل گئی ہو۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی روح کو ایک قسم کے زرہ بکتر میں ملبوس رکھتے ہیں جس میں کوئی بھی کانٹا چبھ نہیں سکتا۔ جب جب ان کا کاروبا

پھیلتا جاتا ہے۔ یہ زرہ بکتر مضبوط تر اور ان کی مدح محفوظ تر ہوتی جاتی ہے۔

وہ ریٹر کا تھیلا سی رہی تھی اور بلدیو کو اپنے کیسوں کی کہانیاں سنا رہی تھی۔ بابو رام لال کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ جن کی بیوی پتلی دبلی سی ہے۔ گذشتہ سال ان کے پہلا بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کسی کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ مجھے لات مار کر نیچے گرا دیا۔ بابو رام لال بہت پریشان تھے۔ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ کیا بنے گا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ کہ ذرا فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور سب ٹھیک ہو گیا۔

بلدیو ہر ایک بات کی داد دے رہا تھا۔ ساوتری خاموش پڑی تھی۔ بالکل ساکن اور بے حس۔ دائی کی زبان اور ہاتھ برابر چل رہے تھے۔ آخر ربڑ کا تھیلا سل کر تیار ہو گیا۔ اور اس نے بچے کی لاش کو اس میں ڈال کر کہا:۔ "ڈاکٹر سے رپورٹ لکھوا کر وہیں دریا میں ڈال آئیں گے یہاں پھر کس لئے لائیں گے؟"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں یہاں واپس لانے کی۔ آپ کے ساتھ نوکر کو بھیج دیتا ہوں وہیں سے دریا میں ڈال آنا۔"

دائی نوکر کے ساتھ بچے کو لیکر چلی گئی۔ صرف بلدیو کمرے میں رہ گیا۔ ساوتری نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں کھول دیں:۔ "لے گئے؟"

"ہاں، لے گئے"

ساوتری کچھ نہیں بولی۔ اس کی نگاہیں جو پہلے بچے کو دیکھنے کی حسرت میں ادھر ادھر بھٹک اٹھی تھیں اب ہر ایک جذبہ سے محروم خلا میں جھانک رہی تھیں۔ بیتنی کی جذبات سے محروم آنکھوں کو دیکھنا بلدیو کے لئے بہت مشکل تھا۔ وہ اسے تسلی دینے کے لئے اس کی خالی آنکھوں میں ازلی اور ابدی جذبہ ابھارنے کے لئے بولا۔

"نہ لے جائیں، بلاؤں انہیں واپس!!"

"نہیں۔ لے جانے دو۔ مٹی ہے۔"

اس نے یہ الفاظ اس طرح کہے جیسے اپنے آپ کو ملامت کر رہی ہو۔ جیسے وہ کسی کرخت اور تکلیف دہ سوال کا جواب دے رہی ہو، جیسے کوئی شخص اس سے پوچھ رہا ہو۔ کیا نو مہینے مٹی

اور اتنی تکلیف برداشت کرنے کے لئے آنی تکلیف برداشت
پیٹ میں اٹھائے پھرتی رہی ہے ؟ کیا اس بے جان لوتھڑے کو جنم دینے کے لئے اتنی تکلیف برداشت
ہے ؟ ـــــ اس کی روح غم سے ابلنے لگی ۔ اس کا جسم بھن رہا تھا ، پھنک رہا تھا ۔ یہ کوفت ـــــ
حساس کی اذیت ۔ دردِ زہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی ۔ لیکن اب وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی ۔ اس
تکلیف کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی ۔ ندامت اسے منع کر رہی تھی ۔ مٹی کو جنم دے کر اب رونے بیٹھی ہے
چہرے سے بے چارگی ٹپک رہی تھی ۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے ۔ بلدیو پہلے سے
اٹھ کر سرہانے جا بیٹھا اور اس کے ماتھے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا ۔ ہمدردی کے لمس نے غم کو پگھلا دیا ۔ ساوتری
کے رکے ہوئے آنسو بہ نکلے اور وہ پتی کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سسکیوں کے درمیان
بولی : "میں نے تو اسے ساتھ لٹا کر بھی نہیں دیکھا ، اسے پیار بھی نہیں کیا ، اسے ......"
بلدیو کا ہاتھ ساوتری کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا ، اس کی چھاتی پر پڑا تھا جس میں سے
زندگی کی دھاریں بہہ نکلنے کے لئے تیار تھیں ۔ لیکن ان سے دودھ بہنے کی بجائے آنکھوں سے
آنسو بہہ رہے تھے ۔

ساوتری کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی تھی ۔ ماں کی روح بچے کے لئے تڑپ رہی
تھی ۔ وہ تڑپ بلدیو کی روح میں بھی سرایت کر گئی ۔ تمام جذبات جو ساوتری کی روح میں ہلچل مچا رہے
تھے ، بلدیو کی روح کو بھی جھنجھوڑنے لگے ۔

"بائیں چھاتی ابھی بہت چھوٹی ہے ۔ بچے کے منہ میں کیسے آئے گی ؟"
چند روز پہلے ساوتری نے بائیں چھاتی بلدیو کو دکھاتے ہوئے کہا تھا ۔
اور اس فقرے کے ساتھ بلدیو کے ذہن میں اور بہت سی باتیں ابھر آئیں ۔ ان باتوں
کی روشنی میں وہ سوچا کرتا تھا کہ ایک لڑکی کے دل میں ماں بننے کی تمنا اس وقت سے پرورش پانے
لگتی ہے ، جب وہ گڑیوں سے کھیلنا شروع کرتی ہے ۔ جب وہ بیاہی آئی تھی تو پہلے دن اس نے
بلدیو سے کہا تھا : "جو عورت بھی مجھے دیکھنے آتی ہے ۔ وہی کہتی ہے ۔ بھگوان تمہیں بیٹا دے ، بڑھ
سہاگن ہو ۔ میں ابھی سے بچہ نہیں چاہتی ۔ کیا تم چاہتے ہو ؟"
"ہاں میں تو چاہتا ہوں" بلدیو نے شرارت کی
"جی نہیں ، بڑا جھنجھٹ رہتا ہے ۔ ابھی ایک دو سال عیش کریں گے ۔"

پھر جب وہ ہمسائی کے ننھے منے بچے کو آنگن میں ادھر اُدھر دوڑتے دیکھتی تو اسے جھٹ گود میں اٹھا لیتی اور پیار سے منہ چوم کر بلدیو سے کہتی "بچے بھی گھر کی رونق ہوتے ہیں۔"

"اور تم تو کہتی تھیں کہ مجھے ابھی بچہ نہیں چاہئے۔"

"پھر کیا پیار کرنے میں بھی عیب ہے۔" وہ ہمسائی کے بچے کو بلدیو کی گود میں دھکیل کر بولی،

"پتاجی، پتاجی کہنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ کیا تم بھی پتاجی کہلایا کرو گے؟"

"ہاں میں بھی پتاجی کہلایا کروں گا۔"

"لیکن مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ ماتاجی کہلانا ابھی سے۔"

"تو پھر کیا کہلاؤ گی تم؟"

"دیکھا جائیگا۔ بملا کے بچے تو بی بی جی کہتے ہیں اسے۔"

"تم بھی بی بی جی کہلایا کرنا۔"

آخر ایک دن ساوتری کو یقین ہو گیا کہ اسے ماں بننا ہے۔ بلدیو دفتر سے لوٹا تھا۔ وہ اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں بولی جیسے طعنہ دے رہی ہو۔

"تم نے یہ کیا کر دیا۔ میں تو کہتی تھی کہ مجھے ابھی بچہ نہیں چاہئے۔"

"لیکن مجھے تو چاہئے۔"

ساوتری چپ ہو گئی۔ بلدیو اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس سے بظاہر بے اعتنائی سی جھلک رہی تھی۔ بلدیو کی نظریں جس جذبہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ وہاں نظر نہیں آیا۔ آخر اس نے ساوتری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ اس کی روح میں جھانک کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔ کہ کیا اسے اتنی جلد ماں بن جانے کے خیال سے واقعی کوفت ہوئی ہے یا وہ محض دکھاوا کر رہی ہے۔

"ساوتری میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا تھا کہ تم اور سب باتیں اوپر کے من سے کرتی ہو۔ دراصل تم بھی ایک بچہ چاہتی ہو۔"

"سچ بتاؤں ــــ چاہتی تو میں تھی۔" وہ قدرے جھینپ گئی۔ "پر اتنی جلدی نہیں۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب ایک بات کہوں؟"

"ہاں کہو۔"

"بھابی جی کہتی تھیں کہ اگر اس حالت میں صبح اٹھ کر ہر روز ٹھنڈا پانی پیا جائے. تو بچے کی آنکھیں بڑی بڑی ہو جاتی ہیں"

"تو پھر پیا کرنا"

"مجھے یاد دلایا کرو گے صبح اٹھ کر"

"ضرور!"

اور وہ صبح اٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتی رہی تھی تاکہ بچے کی آنکھیں بڑی بڑی ہو جائیں. اس کے علاوہ وہ کارڈ بورڈ کا ایک خوبصورت ننھا خرید لائی تھی جسے کارنس پر رکھ چھوڑا تھا. وہ اسے بڑے غور سے دیکھا کرتی تھی تاکہ کارڈ بورڈ کے اس ننھے کی طرح بچہ تندرست اور خوبصورت ہو اور اس کے بال ریشم کی طرح ملائم ہوں. اس نے نو ماہ اسی امید اور اسی کوشش میں صرف کئے تھے کہ بچہ خوبصورت ہو، تندرست ہو، اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہوں اور بال ریشم کی طرح ملائم ہوں. آخر بچہ حرکت کرنے لگا تھا. جب وہ ہلتا تھا، پیٹ میں ادھر ادھر دوڑتا تھا تو اس کی روح میں مسرت رقص کرنے لگتی تھی. آنے والے بچے کا حسین تصور اس کی آنکھوں میں چمک اٹھتا تھا.

وہ اپنے اندر ہونے والے باریک سے باریک تبدیلی کو بڑے غور سے دیکھتی رہی تھی. چار ماہ سے اس کا انگ انگ کھل رہا تھا. شاید یہ نئی زندگی کا خیر مقدم تھا. زندگی کا مسلم اصول ہے کہ ایک جاندار اپنے جیسے دوسرے جاندار کو جنم دے. ساوتری زندگی کے اس اصول کو اپنے خون سے سینچ رہی تھی.

"دیکھو جی، چھاتیوں میں دودھ بھر رہا ہے. ہم بچے کو ایک سال تک دودھ پلائیں گے. صرف دودھ اس سے بچے کی صحت خوب بنتی ہے. عمر بھر کوئی روگ نہیں لگتا!"

لیکن اسے کیا معلوم کہ روگ لگنے کی نوبت ہی نہ آئے گی. موت کا مردہ ہاتھ بچے کو اس کی کوکھ ہی میں آ دبوچے گا. وہ عورت تھی. اسے زندگی کو جنم دینا تھا. موت کے خیال کو اس نے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا تھا. لیکن وہ ایک ناقابل فراموش حقیقت بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی. زندگی کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا. اس کے کلیجے میں بے رحمی سے گھونسا دے مارا. وہ زندگی — خوابیدہ زندگی کو جنم نہ دے سکی. کیا یہ چوٹ معمولی چوٹ تھی؟

ساوتری ایک دم بے ہوش سی ہو گئی تھی. شاید اس نے سن لیا تھا کہ بچے میں جان

نہیں ہے بچہ مردہ پیدا ہوا ہے۔ دائی، دائی کے ساتھ زچہ کی خدمت کرنے والی عورت، ہمسائی اور محلے کی دیگر عورتیں آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ زیادہ محنت سے تو بچے کو ضعف نہیں پہنچا۔ بہتری کوشش کی، کہ اس کی سانس چلنے لگے۔ دائی نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ کر پھیپھڑوں میں ہوا بھری۔ لیکن وہ اس طرح سر سر باہر نکل گئی جس طرح ایک بانس کی نالی میں سے نکل رہی ہو۔ اور بھی جتن کئے گئے۔ سانس نہ چلنی تھی نہ چلی۔ ڈاکٹر نے آکر فیصلہ دیا کہ بچہ مردہ ہے۔ ساتھ بلدیو کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پرماتما نے پہلوٹھی کا لڑکا دیا تھا، وہ بھی نہ رہنے پایا۔ اس کی مرضی!"

بلدیو پرماتما اور اس کی مرضی کا قائل نہ تھا۔ اس نے ساری عمر جدوجہد میں گزاری تھی۔ ہم وطنوں کی غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے کے لئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ وہ دنیا کے عام چلن سے ہٹ کر نئے انداز میں سوچنے کا عادی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جرأت آمیز ڈھنگ سے مسکرا کر کہا۔ "کوئی بات نہیں میرا بچہ شہید ہے۔ اس نے احتجاج کیا ہے۔ غلام فضا میں سانس لینے سے!"

ڈاکٹر تو مسکرا دیا۔ لیکن عورتوں نے بلدیو کی طرف یوں دیکھا جیسے اس نے بہت ہی نامعقول بات کہی ہو، جیسے وہ ایک غیر متوازن دماغ کے فرد کو، ایک سنکی آدمی کو دیکھ رہی ہوں اس فضا میں ڈاکٹر کی بے لوث مسکراہٹ بھی نفرت آمیز معلوم ہوتی تھی۔

اب جب کہ سب لوگ چلے گئے۔ کمرے میں صرف پتی پتنی رہ گئے۔ اس کا ہاتھ ساوتری کے سینہ پہ پڑا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا ماں کی روح بچے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ ڈاکٹر کی مسکراہٹ اور عورتوں کی نگاہوں کو نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک ماں کے ـــ اپنی پتنی کے جذبات کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے الفاظ میں کس قدر کھوکھلا پن تھا۔ وہ ساوتری کی تسلی کے لئے انہیں دہرا نہیں سکتا۔ جس عورت نے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ صرف کر کے ایک دوسرے جسم کو تعمیر کیا ہے۔ جس نے اس جسم کو خوبصورت بنانے کی حتی الوسع کوشش کی، جو اس کے بال تک دیکھنے کو ترس گئی۔ اور جو اسے آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہے ـــ رو رہی ہے۔ اس کے آگے دنیا کی تمام فلاسفی ہیچ ہے۔ عقل و خرد بے سود ہے۔ بلدیو اس کے روبرو کس طرح یہ الفاظ کہہ سکتا ہے؟ وہ اسے شہید نہیں، زندہ دیکھنا چاہتی تھی، اس کا کوئی نیا اور خوبصورت نام رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ کسی بھی نام کا روادار نہیں ہوا۔ پھر بلدیو کو کیا حق ہے کہ وہ اسے شہید کہے۔ کیا وہ اتنا بزدل تھا کہ دنیا کو دیکھنے سے پہلے

ہی اس کی جدوجہد سے گھبرا کے خودکشی کر لینا پسند کرتا ؟
ساوتری کی سسکیاں فضا کو غم سے معمور کر رہی تھیں۔ بلدیو بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس کے
غم کی ماہیت پر غور کر رہا تھا۔ ساوتری کچھ کھلونے خرید لائی تھی وہ کارڈ بورڈ کے ننھے کے قریب
کارنس پر رکھے تھے۔ اس نے اون کے موزے اور سویٹر بھی بن لیا تھا۔ وہ کتنی دقت سے لائی تھی اون
خرید کر۔ اور پھر پڑوسن کو کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے گاؤں سے بچے کے لئے لکڑی کا پنگورا منوا دے۔ چند روز
میں وہ پنگورا بن کر آ جائے گا۔ کون لیٹے گا ان پنگورے میں ؟ ساوتری کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ شاید
وہ بھی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی، وہ اس کے غم کی نوعیت کو سمجھ گیا اور اس کی تشفی کے لئے بولا۔

" ساوتری شکر کرو، تمہاری جان بچ گئی۔ تم راضی رہو۔ بچوں کا کیا ہے ؟ "

ساوتری کی سسکیاں قدرے کم ہوئیں، اور اس نے پیار بھری نگاہوں سے بلدیو کی طرف
دیکھا۔ اس کا پتی اس کے سرہانے بیٹھا تھا اور وہ خود سلامت تھی۔ پھر بچوں کا کیا تھا

" اور تم تو خود کہا کرتی تھیں کہ مجھے ابھی بچہ نہیں چاہئے "

" نہ ہوتا تو یہ تکلیف تو نہ سہنی پڑتی "

" دکھ سکھ تو جسم کے ساتھ لگا ہے۔ سمجھ لو بیمار ہوئی ہو۔ دس بیس دن میں اچھی ہو جاؤ گی "

ساوتری خاموش ہو گئی۔ بلدیو نے اس کے آنسو پونچھ دیے۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ بلدیو سرہانے
سے اٹھ کر پھر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ وہ اس کی قمیص کے بٹن سے کھیلتے ہوئے بولی۔

" آنکھیں تو بڑی بڑی تھیں "

" ہاں بہت بڑی تھیں "

" ناک کیسی تھی ؟ "

" تم نے نہیں دیکھی "

" میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ بال بھی نہیں "

ساوتری کی آنکھیں گہری ہو گئیں اور اس پر رقت طاری ہونے لگی۔

" جانے بھی دو ساوتری۔ بہت غم نہیں کیا کرتے۔ مٹی تو تھی، کیا کرنا تھا انہیں دیکھ کر "

" ہاں مٹی ہی تھی۔ جب ہمارے پاس نہ رہا "، ساوتری نے بات دہرائی، وہ کچھ دیر خاموش

رہی اور آنسو پی کر بولی "انہوں نے اسے پیٹا بھی تھا"

"پگلی اسے کوئی کیوں پیٹتا؟"

"پیٹا تو تھا دائی نے۔ میں سن رہی تھی"

"وہ تو پھیپھڑے ٹھکور رہی تھی، کہ زندہ ہو تو سانس آ جائے"

"اس کے اندر ہوا بھی بھری تھی؟"

"ہاں بھری تھی"

"اسے آگ پر بھی رکھا تھا؟"

"اسے نہیں رکھا۔ اس کے ساتھ جو اول ہوتی ہے — خون کی گٹھلی اسے رکھا تھا تاکہ خون حرکت میں آئے اور وہ سانس لینے لگے" جلدیو نے وضاحت کی "تم اس طرح بے حس پڑی تھیں، جیسے کچھ ہوش ہی نہ ہو۔ لیکن تمہیں معلوم سب کچھ ہے"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ تم ڈاکٹر کو بھی لائے تھے۔ اس نے بھی کہہ دیا، بچہ مردہ ہے"

سیڑھیوں میں پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ دونوں چپ ہو گئے۔

"طبیعت کیسی ہے؟" ہمسائی نے اندر آکر پوچھا۔

"ٹھیک ہے" ساوتری نے جواب دیا۔

"اچھا کسی قسم کا غم نہ کرنا۔ شکر کرو تمہاری جان بچ رہی"

"آپ لوگوں کو بھی تمام رات تکلیف اٹھانی پڑی"

"لو، اور سنو۔ اسے ہماری تکلیف کی پڑی ہے"

"ماتا جی، ماتا جی!" نیچے سے بچے نے آواز دی۔

"آئی بیٹا!" ہمسائی نے جواب دیا "ایک منٹ سانس نہیں لینے دیتا"

"ماتا جی!" وہ پھر چلایا

"میں اسے چپ کرا کر اس کے پتا جی کے حوالے کر آؤں۔ پھر تمہارے لئے کھانے کو لاتی ہوں" وہ چلی گئی۔

"اسے اب پھینک آئیں گے؟" ساوتری نے دریافت کیا۔

"ہاں، راوی میں پھینک آئیں گے" یلدیو بولا۔
"ماتاجی، ماتاجی!" بچے نے لگاتار پکارنا شروع کیا۔ ساوتری دھڑکتے ہوئے دل سے سن رہی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور آنکھوں میں بیتابی جھلک اٹھی، جیسے بچہ اسے پکار رہا ہو اور وہ بھاگ کر اسے گود میں لینا چاہتی ہو۔
"ماتاجی!" آواز پھر آئی۔
"آئی بیٹا" ہمسائی نے سیڑھیوں پر سے جواب دیا۔
"ہائے کیسی سردی پڑ رہی ہے، اسے پانی ٹھنڈا نہیں لگے گا؟"
ساوتری کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اکالی گربچن سنگھ

نوکری

شاید آج ڈاکٹر نے اُسے رات بھر اچھی طرح آرام کرنے کی تلقین کی تھی، اُسے نیند لانے والی گولی
دوا بھی دی تھی۔ پھر ہزاری انتظار کر رہا تھا۔ کب اچھی طرح رات ہو جائے۔ صحن میں ایک ٹوٹی پھوٹی
چارپائی پر لیٹا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ مسلسل کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اپنی بیٹی سے بولا "مایا بیٹی
...... لاؤ میرا کوٹ لا دو...... مجھے جانا ہی ہوگا" "کہاں جاؤ گے دادا...... ؟" دادا اس وقت کہاں
جائینگے وہ کچھ خیال نہ کر سکی۔ ہزاری نے جواب دیا "ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا بیٹی" "کیوں ؟ نوکری کا معاملہ
ہے گھر بیٹھا نہیں جاتا" "لیکن ڈاکٹر نے تو......" "میں جانتا ہوں بیٹی......" وہ درمیان میں ٹوک کر
بولا "ڈاکٹر کا کام بیٹا ہدایت دینا ہے، اس پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ ڈاکٹر ہماری نوکری کے معاملہ میں
جواب دہ نہیں" ہزاری نے اتنا تو کہدیا لیکن گہرے خیالوں میں کھو گیا...... لیکن...... میں کام پر
جاؤنگا کیونکر...... جسم تھک کر چور ہو چکا ہے...... کمزوری سے ہلا تک نہیں جاتا...... کیا پھر ڈیوٹی
پر رات بھر جاگ بھی سکوں گا یا نہیں...... گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر کراہتا ہوا وہ اٹھا "اچھا لاؤ میری
چادر ہی لا دو...... میں نہیں سمجھتا آج رات کیسے کٹیگی" "تو اتنی چنتا کیوں کرتے ہو دادا۔ ایسی بھی کیا
نوکری جو سکھ تو سکھ دُکھ میں بھی بیٹھ کر نہ بھوگنے دے" "مالک کا کام ہے بیٹی انکی مرضی پر چلنا پڑتا ہے انکے
ہر اشارے پر جی حضوری کرنی پڑتی ہے...... لیکن میں تو ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں...... ! ہزاری
سوچ رہا تھا ابھی کام پر جانے کے لئے کافی وقت ہے۔ "اچھا میری بیٹی آج مجھے کچھ چائے بنا کر پلاؤ۔ مجھے
بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے" ہزاری ایک بند اور اندھیری کوٹھری میں ایک چارپائی پر جا کر لیٹ
گیا۔ مایا چولہا پھونکنے لگی۔ چائے کچھ تیز ہو گئی ہزاری پھر کچھ سوچ کر بولا۔ یہ اتنی پتیاں ڈالی ہیں دادا!
اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ تھوڑی اور ڈال دو" "اتنی کڑی چائے تو کبھی نہیں پی دادا" "سنا ہے کہ
کڑی چائے فرحت بخش ہوتی ہے بیٹی......" "غلط دادا۔ کڑی چائے سے تو نیند نہیں آتی" "پھر کیا ہوا
دوا سے مجھے نیند آ ہی جائیگی" بھرمن ہی من ہزاری سوچ رہا تھا۔ کیا دوا کی طاقت کڑی چائے کی تیزی اور
خشکی پر بھی فتح پا سکتی ہے۔ کیا میں رات بھر مزے سے سو سکتا ہوں۔

مایا بہت جلد چائے تیار کر دینا چاہتی تھی۔ گیلی لکڑیاں شاید جو آج ہی وہ کہیں سے اٹھا کر لائی تھی۔ دھواں زیادہ دے رہی تھیں۔ وہ کوٹھری دھوئیں سے بھر گئی۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ دھوئیں کی آغوش میں دھندلی روشنی پھیلا رہا تھا...... ہزاری کھانسنے لگا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نہ جانے میں کیونکر کام پر جا سکوں گا۔ سر چکرا رہا ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے لیٹ جاؤں۔ کچھ دیر کے لئے گہری نیند سو جاؤں۔ پھر وہ نہ جانے اور کیا کچھ سوچ رہا تھا......

مایا نے کہا: "لو چائے تیار ہو گئی دادا" "چائے میں دودھ تھوڑا ہی ڈالا ہے نا؟" "ہاں" ہزاری کراہتا ہوا اٹھا۔ اپنے پست حوصلوں کو ابھارنے کے لئے اس نے اپنے آپ کو فریب دیا۔ "چائے پینے سے سر ہلکا ہو جائیگا......"

چائے پینے سے پیشتر ہزاری نے مایا سے کہا۔ تم لگاتار تین راتوں سے جاگ رہی ہو۔ جاؤ سو جاؤ میں بھی چائے پی کر لیٹ رہوں گا...... پھر گرم گرم چائے کے گھونٹ نگلتا ہوا ہزاری وچارنے لگا کیسی بھولی ہے یہ لڑکی۔ جب یہ چھوٹی سی تھی۔ تبھی اسکی ماں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لی تھیں آج بھی مجھے وہ کالی اور بھیانک رات یاد ہے، جب میں اپنی بیوی کیلئے اپنے کمینہ مالک سے دوا کی خاطر گڑگڑا کر پیسے مانگ رہا تھا اور وہ مجھے میری تاریخ مقررہ سے پہلے تنخواہ دینے سے انکار کر رہا تھا۔ آج بھی مجھے وہ کالی اور بھیانک راتیں یاد ہیں۔ جب میں اسے کچھ افیون کھلا کر رات کو تنہا اس کوٹھڑی میں چھوڑ جایا کرتا تھا۔ آج وہ دن کچھ دھندلی سی یادیں بن گئی ہیں۔ آج مایا سمجھدار ہو گئی ہے۔ اور کچھ اتنی سیانی ہو گئی ہے کہ میرے سکھ اور دکھ کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ ذکری کو غلامی اور غریبی کو گناہ سمجھتی ہے۔ ہزاری گرم گرم چائے کے گھونٹ نگل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چائے کی گرم پیالیاں اسکی کمزوری دور نہیں کر سکتیں ممکن ہے کہ اسکے ڈھیلے اور سست پڑے جسمانی اعضا رسکے گھوڑوں کو چابک بن کر لمحہ بھر کے لئے پھر کانشئے لیکن ہمیشہ بھڑکی ہوئی چیز اونچائیوں میں اٹھکر تباہی کی غار میں دھنس جایا کرتی ہے پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہزاری سوچ رہا تھا کسی طرح گرم چائے کی پیالیاں چڑھا کر وہ کام پر تو چلا جائیگا۔ لیکن لمحہ بلمحہ بکھرنے والی یہ تاریکی اور اس کا ساتھی یہ جاڑا۔ اس کڑکڑاتی ہوئی سردی میں وہ کام کرنے سے مجبور رہیگا۔ واقعی یہ حقیقت ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ذکری سکھ تو سکھ دکھ بھی بیٹھ کر سہنے نہیں دیتی...... گرم گرم چائے کے گھونٹ کتنے میٹھے اور ذائقہ دار ہیں شہد

کی طرح میٹھے اور انگاروں کی طرح گرم۔

رات کی سُن تاریکی گہری ہوتی جارہی تھی۔ چائے کی پیالیاں کب کی ختم ہوچکی تھیں۔ اب اس کے سوکھے ہوئے بے بس چہرہ پر پسینہ کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ آنکھوں میں جیسے چنگاریاں بھر دی گئیں تھیں۔ کچھ جلن ہو رہی تھی۔ لیکن ہزاری کے سُن بدن کا رواں' رواں تک جیسے جاگ اٹھا۔ نسوں میں ابلتا ہوا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ اٹھا...... دھیرے سے...... اور پھونک کر ...... دیپک بجھا دیا..... ! کچھ دیر تک بے حس و حرکت وہیں دیپک کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا۔ ڈھبری کی جلی ہوئی بتّی کا دھواں اٹھا اور اس کے پھیپھڑوں میں سما گیا۔ اپنے آپ کو بہت روکنے پر بھی وہ کھانس اٹھا۔ اُسے چھینک آئی۔ تب اپنے آپ کو روکنا محال ہوگیا۔ اور کھانستا رہا۔ ڈر تھا کہیں مایا جاگ نہ جائے۔ وہ ہر طرح سے اپنی کھانسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کھانسی نہ دبی "دادا.....' وہ سن کر چونک اٹھا " تو جاگ گئی مایا" "کیا ہوا دادا اتنی کھانسی کیسے ؟" "کچھ نہیں ذرا ڈھبری' دھواں نہ سہار سکا '۔ یہ کلیجہ..... کھانسی چھڑ گئی۔ تو سو جا رانی ....." "میں اٹھکر دیپ جلا دوں.....!" "نہیں تو لیٹی رہ"...... "ڈھبری کیوں بجھا دی دادا ؟" مایا سوچ رہی تھی پہلے تو یہ دیپ جب سے دادا بیمار تھے رات بھر جلتا ہی رہتا تھا۔ یہ ڈھبری تو نہیں بجھتی تھی۔ "میں اٹھکر دیپ جلا دوں دادا ؟" ہزاری اب بھی کھانسے جا رہا تھا۔ کچھ چڑ کر بولا "نہیں نہیں تو لیٹی رہنا۔ میں جلا لونگا" مایا دادا کے یکایک بگڑنے پر چپ ہوگئی۔ سوچنے لگی ممکن ہے انھیں روشنی میں نیند نہ آتی ہوگی۔

ہزاری کچھ نا امید سا ہوکر کھاٹ پر آ رہا۔ کھاٹ کی پائنتے چرچراپن اور تب سے یقین ہوا مایا یہ تو سمجھیگی کہ وہ کھاٹ پر آ لیٹا ہے۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ پھر بھی سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ باہر چارسو کہر کے گود میں سسکتی ہوئی فضا اب خاموش ہو چلی تھی۔ ہزاری کی فکر رات کی سیاہی کی طرح اور بھی گہری ہوتی چلی جارہی تھی۔ کچھ دیر چارپائی پر ادھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے کارخانہ کا بھونپو سنائی دیا..... وقت ہوچکا تھا۔ اکثر وہ اسی بھونپو کی آواز پاکر، دیگر مزدوروں کی طرح کام پر روانہ ہوجایا کرتا تھا۔ اور آج بھی اُسکے ساتھی مزدور لپنے اپنے کاموں پر روانہ ہوچکے ہونگے۔ لیکن اسے تو ڈاکٹر نے...... اُف یہ کتنا دھوکہ اور فریب ہے۔ ایک لاچار انسان ہمیشہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جھوٹی

بات تو اس نے مایا کو سمجھانے کے لئے کہہ دی تھی۔ وہ ڈاکٹر جو خود مل مالکوں کا غلام ہے۔ جو خود نوکری کے بندھن میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ بھلا مزدوروں کی بیماری۔ مجبوری اور لاچاری دیکھ کر بھی کیا انہیں کام پر جانے سے روک سکتا ہے۔ آخر انہیں بھی تو اپنے مالکوں کو خوش رکھنا ہے۔

اب پھر اسے محسوس ہوا گویا مایا سو چکی ہے۔ اس دفعہ وہ سنبھل کر اٹھا۔ پھٹی سی چادر اوڑھی صحن پار کر کے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اسے دروازہ کھلا رہنے کی کوئی پروا نہ تھی۔

ٹھٹھرتا ہوا وہ اس سرد اندھیرے میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن وہ فقط یہی سوچ رہا تھا کہ ایسی کتنی ہی راتوں میں وہ اپنی بھولی لڑکی کو تنہا محو خواب چھوڑ کر چپ چاپ کام پر جا چکا ہے۔ آج کوئی نئی بات نہیں۔ پھر نہ جانے ہزاری کیوں وچار رہا تھا کہ وہ بیچاری جب جاگے گی مجھے چارپائی پر نہ دیکھ کر بہت پریشان ہوگی۔ لیکن اس کے سوا اور کر ہی کیا لیگی کہ دو آہیں لیکر اس دور کے اس ہکشاہی آمریت کو کوس اور دنیا کی بگڑی چالوں پر کچھ وچار کر نفرت سے تھوک کر کچھ اور سوچنے لگ جائے گی۔

اسدن جبکہ آدھی رات کا وقت گزر چکا تھا۔ مایا کی نیند کھل گئی۔ اُس نے دبے لفظوں میں پکارا دادو..... دادو !..... کوئی جواب نہ پا کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ دیپ جلایا..... دیکھا کھاٹ سونی پڑی ہے۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ چراغ بجھو نیو بجھنے کے وقت پر ہی بجھا تھا..... اور.....

اب آدھی رات بیت چکی ہے ! اس نے بھی اپنی رضائی تن سے لپیٹی اور خاموش.......

گلی کی نکڑ پر پان والے کی دکان پر جہاں کچھ عیاش آنکھوں کا ٹھکانا رکھتے ہیں....... اُس طرف چلدی........ اُسے نہ جانے کس نوکری پر نہ پہنچنے کا خوف تھا!

فکر تونسوی

سالنامہ ادب لطیف ۱۹۴۶ء

(افسانوں کی روشنی میں)

افسانوی حصہ میں سب سے پہلے ہمیں کرشن چندر کا "پودے" دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ اس میں کرشن چندر مانوس افسانوی تکنیک کو کئی مقامات پر چیرتا ۔ پھاڑتا ۔ تار تار کرتا چلا گیا ہے، لیکن پھر بھی ہم اسے افسانہ نہ کہنے کے باوجود افسانہ کہیں گے ۔ جدید نظم کی طرح جدید افسانہ میں بھی ہیئتی تجربوں نے سیلابی شکل اختیار کر لی ہے اور ان سیلابی ہیئتوں نے موضوعات کی کئی ایسی پیچیدہ گرہوں کو سلجھانے میں مدد دی ہے، اور اظہار و بیان کے کئی ایسے راستے سجھائے ہیں ۔ جو ان جدید شکلوں کی بدولت کھل سکے ہیں ۔

اس "رپورتاژ" میں ان گنت کردار ہیں، جو اپنی فطرت کے متنوع رجحانوں کے ساتھ ہمیں جلوہ گر ہیں ہر ایک کردار کا اپنا اپنا الگ مقام ہے، اور ان الگ الگ مقامات کو کرشن چندر نے بڑی فطانت سے اپنی نگاہوں کی گرفت میں رکھا ہے ۔ اور اپنے افسانوی رپورتاژ کی مرکزی روح کے لئے استعمال کیا ہے

اس رپورتاژ میں کرشن چندر کی بے ساختگی عروج پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ اسی ہیئتی تجربے کے پردے پر وہ نہایت بیباکی سے کھل کھیلا ہے ۔ اس کی بیان و اظہار کی طلسم کاری تو مسلم ہے ہی پھر کرشن چندر اس میں اپنے تمام افسانوی ہتیاروں سے مسلح ہے ۔ اور رپورتاژ صرف رپورتاژ نہیں رہا، افسانہ بن گیا ہے

اس رپورتاژ میں افسانوی کلائمکس بھی موجود ہے، ایک کردار ہے، جگر حیدر آبادی جسے کرشن چندر نے اپنے افسانوی ہتیاروں کے پینتروں سے ہیرو بنا دیا ہے ۔ ابتدا میں تو وہ اسے ایک تجربہ کار سفاک کی طرح نفرت و کراہیت کے بوجھ تلے دباتا چلا گیا، مسلتا، کچلتا اور تحت الثریٰ میں گراتا چلا گیا ۔ اور عین اس وقت جب اس نے دیکھا اس مظلوم معصوم کردار سے قارئین کو بھی نفرت کے بجائے ہمدردی ہونے لگے گی ۔ تو یکدم اس نے جگر کی زندگی میں ایک دردناک سانحہ شامل کر دیا ۔ اور سانحہ کی اس شمولیت سے اس نے جگر کو غار کی دوسری طرف سے ایسا اچھال دیا ۔ کہ وہ آسمان پر جا کر جگمگانے لگا ۔ اور کھلاڑی کرشن چندر

کا کھیل مکمل ہو گیا۔ بایں ہمہ رپورتاژ کی حیثیت سے "پودے" کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اردو کو ایک نئی صنف سے روشناس کرانے کا اقدام مستحسن ہے۔

راجندر سنگھ بیدی ایک طویل گم شدگی کے بعد ایک نیا افسانہ لیکر آئے ہیں۔ تو ایک انوکھے تجربے میں لپیٹ کر۔ اور یہ تجربہ ہے۔ "ابہام میں افسانہ"۔ یہ ابہام فلسفے کو چھو رہا ہے، اگر فلسفہ گنجلک نہ ہو، تو اس کا وجہ ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔

بیدی اپنے بیشتر افسانوں میں فلسفیاتی رشتوں کو اپنے ہمراہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قاری کی قوت مدرکہ اور اس کی برداشت کو بھی اپنے ساتھ لیکر چلتا رہا ہے، لیکن "ماسوا" میں وہ فلسفیاتی ابہام کی منہ زوری میں پڑھنے والے کے ذہن کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ "ماسوا" —— افسانہ نہیں، ایک تصوریہ ہے، ایک فضا ہے، ایک ماحول ہے، ایک میکانیہ ہے۔ اور بیدی اس فضا کی تخلیق میں بڑا ماہر ہے —— ابہام کی وجہ سے اس کی بہت سی غیر متعلق چیزیں متعلق ہو کر رہ گئیں ہیں۔ سارے کرداروں میں ایک بُعد کے باوجود ایک اجتماعی قربت رکھی گئی ہے۔ چونکہ مرکزی نظریہ میں اتنی گہرائی اور شدت نہیں ہے۔ اس لئے عروجی مقام میں بھی اسی غیر گیرایانہ لپیٹ میں آگیا ہے —— اگرچہ مجموعی تاثر اپنی کم شدتی کے باوجود بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس اچھائی کو اگر ابہام کے لبادے میں لپیٹنے کی بجائے لطیف اشارات کی چلمن میں پیدا کیا جاتا۔ تو کیا ہی اچھا تھا۔

اختر حسین رائے پوری — ہمارے گرد و پیش سے ہٹ کر ایک غیر معروف معاشرت تک جا پہنچا ہے، افسانہ کی ساری فضا الف لیلوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ الف لیلویت، مفروضات سے نہیں؛ حقایق اور مشاہدے سے مرتب ہوئی ہے۔ آج بیسویں صدی کے سائنسی اور دانش ور زمانے میں بھی ہماری دنیا ان غیر العقول رسوم و رواج سے معمور ہے جن کا تصور بھی آج ہمارے لئے ناممکن ہے —— عروجی مقام پر جا کر اس نے مرکزی کردار "گلوں" کی تمام تر فطری اور ذہنی تعمیر کا حق جس شدت سے ادا کر دینے والی — "نہیں!" — یہ ادا کیا ہے۔ وہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ گلوں کی محبت کا تصور اتنا لچک دار نہیں کہ

ایک خارجی حادثہ سے خون کھا کر پہاڑی چٹانوں میں بسی ہوئی یہ حسینہ اپنے سنگین ارادوں میں ڈگمگا جائے۔ وہ تو اپنی آخری ہچکی میں بھی یہی کہے گی "نہیں! نہیں! نہیں! نہیں!!"

ممتاز مفتی کا "احسان علی" بدستور ایک نیم فلسفی، نیم دیوانہ، اور نیم جذباتی سا کردار ہے، اس کردار کی جنسی زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ دکھانے میں مفتی کا ذہنی تسلسل نہایت کامیاب رہا ہے، ہو سکتا ہے، ہمارے معاشرتی زندگی میں ایسے جنسی حادثے اتنی شدید خارجیت سے رونما نہ ہوتے ہوں۔ لیکن جہاں بھی ہونگے (اور مفتی کی افسانوی فضا کا خلوص کہہ رہا ہے کہ ضرور ہوں گے) وہاں کی شعوری اور لاشعوری کشمکش کے سبب، عمل اور نتیجہ کے تینوں مقامات کو مفتی نے خوب نبھایا ہے۔ اپنے بیٹے کی شادی نہ رکوا سکنے کے بعد رنگیلے احسان علی کو ایک نہایت نازک اور انتہائی جذباتی موڑ پر آ جانا پڑتا ہے۔ جہاں سے اسے اپنی جنسی قوتوں کا دھارا موڑنا پڑتا ہے۔ اور اس دھارے کے لئے اب دو ہی راستے تھے۔ یا نماز۔ یا سماج کی مروجہ اخلاقی اقدار سے بغاوت ———

اور احسان علی کو پہلا راستہ زیادہ نزدیک اور سکون بخش معلوم ہوا۔

اس افسانہ میں مفتی کی زبان میں جہاں سلجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں یہ زبان، اپنے بیان سے بھی ہم آہنگ ہو گئی ہے۔

ہاجرہ مسرور نے اپنے افسانہ میں پھر ایک عورت کو پیش کیا ہے۔ اب کے اس کی تیز نگاہ نے ایک جوان کنواری کو جا پکڑا ہے۔ جو دوہرے بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی ہے احتجاج کر رہی ہے۔ ایک معاشی بوجھ اور ایک جنسی دباؤ۔ جنسی دباؤ نے اس کی زندگی کی زہر شکن بہاروں کا گلا گھونٹنے کے بعد ایک منتقمانہ ردِ عمل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یا اسے ایک سمجھوتے کی سپرٹ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اب دُلھن کی بجائے "ماں" بننا چاہتی ہے۔ لیکن سماج کی اخلاقی قدریں کہتی ہیں۔ کہ وہ بغیر شادی کئے ماں نہیں بن سکتی۔ اور اگر اس نے اس طرح ماں بننے کی کوشش کی۔ تو ہم اس پر فحاشیات کا لیبل لگا دیں گے۔

——— نہ ماں نہ دُلھن ——— ؟ وہ کیا کرے! ؟

ہندوستان کی ان گنت جوان کنواریاں اس دوہرے تہرے بوجھ تلے دب کے

چیختی چلاتی رہیں گی۔ کچلی مسلی جاتی رہیں گی۔ لیکن نہ وہ دلھن بن سکیں گی نہ ماں۔ اور اس طرح گھٹ گھٹ کر سماج کی ناک کا تحفظ کرتی رہیں گی ——— ہاجرہ مسرور نے اب جنس کے تخیلی اور ہوائی معاملات سے گذر کر سنجیدہ نسوانی مسائل کی طرف اپنے فن کی باگیں موڑ لی ہیں۔ اور اس طرح اپنے فن کی بجھتی ہوئی شمع کو پھر سے تابندہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

عصمت چغتائی اپنے ناول "ٹیڑھی لکیر" کا ایک باب پیش کر رہی ہیں۔ اس باب میں بذاتِ خود ایک افسانوی فضا موجود ہے ——— اس "معائنہ" میں وہ ہمارے اربابِ تعلیم کے چہروں کے ماسک نوچ نوچ کر پھینک رہی ہیں۔ جس نظام حکومت میں تعلیمی پرزوں کی ذہنی کم مائگی اور خود غرضی کا یہ عالم ہو۔ اس نظام میں ارتقائی تصور معلوم ——— عصمت، زبان بیان اور فن کے مراحل سے گذر کر اپنے صحیح مقام پر پہنچ چکی ہے، بزرگانِ کرام نے عصمت کو، جس عصمت کو معتوب و مردود قرار دے رکھا ہے۔ وہ اُسے "معائنہ" میں ذرا دیکھ لیں۔ کہ اس باب میں کسی بھی مقام پر آپ کی رگِ "تلذذ" پھڑکی۔ ؟

وہرم پرکاش آنند نے تکنیک و ہیئت کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس نے جس ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے لیئے ہیئت کا ایسا ہی تجربہ کامیاب رہ سکتا تھا۔ جگہ جگہ پر ڈرامائی قسم کے رنج۔ ہر کردار کے نفسی تجزیئے اور ان کے ساتھ ساتھ فن کار کی انشائی رفتار کے جمل پینترے، ان سب سے آنند نے اپنے مجموعی تاثر کی عمارت اتنی بلند کی ہے کہ اس کے سبھی پیچ و خم صاف دکھائی دینے لگے ہیں۔ زبان میں انگریزی ساخت کے سے فقرات، بے ساختگی میں ہلکی ہلکی دھاریاں رکاوٹیں ضرور ڈالتی ہیں۔ جن کی طرف مزید توجہ کی ضرورت تھی۔

عزیز احمد کا "دن سپنا اور صدیاں"

اپنی نوعیت کا ایک اچھوتا اور جدید ترین تخیل ہے۔ میاں، بیوی اور عاشق ——— یہ فطری مثلث صدیوں پہلے بھی قائم تھی اور صدیوں بعد آج بھی قائم ہے۔ اس مثلث سے مفر ممکن نہیں ہے ——— اور اسی نظریہ کو مرکز بنا کر عزیز احمد تاریخ کے لا تناہی سلسلے میں کھو کر ہمارے لئے "دن سپنا اور صدیاں" کا اچھوتا خیال نکال لایا۔ اس نے وقت کے مختلف ادوار میں اس مثلثی واقعیت کی چھان بین کی۔ اور دیکھا کہ اگرچہ اس تکون میں محبت، خلوص اور رقابت کا کھیل

ہر دور میں کھیلا گیا۔ لیکن مختلف اندازمیں۔ اور پھر اس کھیل میں کمتر اور بہتر طبقے کی تمیز نہیں راجاؤں، رئیسوں، شہنشاہوں، جاگیرداروں، مزدوروں اور قلم کاروں نے برابر برابر اس بازی گری میں حصہ لیا، وقت کے تغیر کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار، نظریات حسن وعشق، مرد اور عورت کے تعلقاتی تصورات بدلتے چلے گئے، اور تینوں کردار وبتال کے سوال کی روشنی میں متعدد پھر فیاضی بھی کرتے چلے گئے —— اور پھر فیاضی کا یہ تصور تو اضافی ہے، یہ ہر دور کے متغیر محسوسات کی عکاسی تو کرسکتا ہے۔ لیکن مرکز کو ہلانے کی ضرورت ان اضافیات کے بس کا روگ نہیں۔

عزیز احمد نے یہ افسانہ لکھکر اردو ادب کے لئے ایک جدید ترین اور انوکھا راستہ کھول دیا ہے انہیں زبان وبیان پر مکمل عبور حاصل ہے اگر وہ بعض مقامات پر افسانے کی فضا کو ادبی اور فلسفیانہ تشریحوں سے بوجھل نہ بناتے۔ اور افسانویت کو سنبھالے رہتے۔ تو جہاں ان کے یہ تشریحی مقاصد کھپائے جاسکتے تھے۔ وہاں تکنیک میں بھی ناموزونیت پیدا نہ ہوتی۔ بہرنوع ہم عزیز صاحب کو اس تخلیق پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ملک کے لطیف ترین انشاء پرداز احمد ندیم قاسمی نے "طلوع وغروب" کے بعد پھر ایک دھڑکتے کی چیز پیش کی ہے۔ وہ اپنے محبوب ماحول "دیہات" کو پس منظر بنا کر دنیا کے ہر حصے میں گھوم گیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ نے ابکی دیہاتی معاشرت کے سمندر میں پے درپے کنکر پتھر پھینکنے شروع کئے، تو اس کے گاؤں میں ایک انتشار، ایک کھلبلی مچ گئی۔ اس کھلبلی، اس انتشار، اور اس کے زیروبم، اس کے اسباب اور اس کے نتائج ہولناک اور زہرہ گداز نتائج کو قاسمی نے جس چابکدستی، تیز نگاہی اور بلند مزاجی سے پیش کیا ہے۔ وہ اسی کا حصہ تھا۔ نہ جانے ہمارے دیہات کے کتنے ہی دلیروں، اور شمشیرزنوں نے اس کر بنا کی۔ اس اضطراب، اس استبدادیت اور اس آگ وخون کی ہولی میں اپنی جھینٹیں پیش کی ہیں۔ لیکن ان جھینٹوں سے انھیں ملا کیا؟ —— ان کی بیویاں بیٹیوں کے ساتھ سہاگ گئیں، ان کے بستے گھر اجڑ گئے۔ ان کے بوڑھے والدین امن وجنگ کے معانی از بر کرتے کرتے، ترس ترس کر مرگئے۔

احمد ندیم قاسمی نے اس افسانے میں اپنے فن کی پوری ضربیں، پوری قوت سے لگائی ہیں۔ بیسیوں مقامات پر اس نے اس شدید نوعیت کے جذباتی ٹچ دئے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے کبھی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، اور کبھی زار و قطار رو دیتی ہیں —— اس افسانہ میں پٹواری کا کردار طنز نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پٹواری اس روح مستقبل کا سمبل ہے، جو اس قسم کی آمری جنگوں کو اپنے طنزیہ قہقہوں اور ملبتسم شعلوں کی لپیٹ میں لے کر اُفق کی طرف آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ آگے، آگے، اور آگے —— جہاں ہیروشیما پر ایٹم بموں کی بارش نہیں ہوتی، جہاں بنگال اور آسام کی لاکھوں کنواریاں، سڑکوں پر چاول کے دانے کو اپنی عصمت کا مول نہیں سمجھتیں۔ ہیروشیما ... "اس سال نامے کا کامیاب ترین کارنامہ ہے اور ادب و زندگی کے افادی دور کی لافانی اور راسخ یادگار۔

علی عباس حسینی کا افسانہ "برف کی سِل" جنس کے نفسیاتی تسلسل کی ایک تصویر ہے، اور حق یہ ہے کہ اس بزرگ فن کار نے اس تسلسل کی ہر لہر کو نہایت کامیابی سے طے کیا ہے۔ افسانویت، پختہ افسانویت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کردار نگاری، زبان، اسلوب اور دیگر تمام فنی عناصر میں تکمیلیت کی جھلک موجود ہے۔

اسی طرح مہندر ناتھ کا "بنیت" اور بلونت سنگھ کے "لمس" میں بھی اسی قسم کے نفسیاتی اور جنسی مسائل کے پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں مہندر ناتھ کے اس افسانے میں وہ شدتِ بیان اور شوخیٔ اسلوب کم کم ہے۔ جو اس کا خاص رنگ ہے، بلونت سنگھ نے اپنے مرکزی کردار کو نہایت صفائی، نفاست اور ہوشیاری سے پیش کیا ہے۔ کلائمکس میں ہلکا سا ابہام بھی عنصر ہے۔ جو ایسے نفسیاتی مسئلہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

ابراہیم جلیس کے افسانے "لڑائی" کی اساس کارل مارکس کے اس مشہور معاشی فلسفے کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ جسے "تعمیل تردید اور ترکیب" کہا جاتا ہے۔ یہ طبقاتی اور معاشی جنگ محبت میں بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ جس طرح از بھرے سیاسی اور سماجی مسائل میں۔ ایک کالے کے مقابلے میں اینگلو انڈین اور اینگلو انڈین کے مقابلے میں انگریز اور انگریز کے مقابلے میں امریکن ہر نوع بہتر تہذیب، بہتر مرتبہ اور بہتر تصورِ حیات کا مالک ہے۔ اور یہ طبقاتی بانٹ

خالص سرمایہ کے بل پر کی جا رہی ہے۔ سرمایہ ۔۔۔ آج کی اخلاقی قدروں میں ہیجان اور تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ اخلاقی اقدار صرف سرمایہ کی تخلیق ہیں۔ وہ ہوا میں مرتب نہیں کیجا کر اتنے گنجلک اور فلسفیانہ موضوع کو افسانوی سانچے میں ڈھال کر جلیس نے وفاداری کو بشرط استواری نبھایا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا افسانہ، افسانہ نہیں ہے، ایک بیان ہے مسلسل اور متواتر بیان۔ بیان کے اس تسلسل میں اکتاہٹ بھی ہے، اور دلآویزی بھی۔ سپورٹس کے فدائیوں اور ہلکے پھلکے رومان کی چاشنی سے لذت اندوز ہونے والوں کے لئے یہ چیز واقعی دلچسپ ہے، زبان، بیان میں، روانی اور گھلاوٹ ایک بہتے دریا کی طرح ہے۔ جس میں کہیں جھاڑ جھنکاڑ نہیں ہے۔ شفیق نے اس افسانہ میں بھی اپنا رنگ روپ نہیں بدلا۔ شاید وہ بھی وفاداری کا بشرط استواری ہی قائل ہے۔

افسانوں کے بعد ایک اور صنف آتی ہے "طنز" یا انشائے لطیف۔ اور اس کا نمائندہ ہے کنہیا لعل کپور۔ کپور صاحب نے "خارستان" کے پردے میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو کچھ اس سادگی آمیز بے رحمی اور ستم کارانہ بھولپن سے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جو بہت کم ظالموں کا حصہ ہے۔ موجودہ سیاسی چپقلش، تہذیبی تضاد اور نظریاتی بعد کو کپور نے اپنے سبک لہجے میں بیان کر کے ہندوستان کی مجموعی زندگی کی روح پر فن کارانہ تبصرہ کیا ہے۔ ہندو اور مسلمان کے لئے ہنگم اور بے ہنگم کے لفظی مثالی طنز لاجواب ہیں۔ کپور اپنے جدید ترین مزاحیہ فن میں منفرد شعور کا مالک ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ ہندوستان کے موجودہ ادبی دور میں کپور ہی طنز نگاری کے نئے اسلوب کا نمایندہ ہے۔ اس نے بڑے بڑوں کے ہاتھ سے ہتیار چھنکوائے ہیں۔

First
and
Best
MYSORE SANDAL SOAP
Available
Everywhere
GOVT. SOAP FACTORY
BANGALORE

نیا دور

(دو ماہی رسالہ)

9

ایڈیٹر

صمد شاہین

سالانہ چندہ
چھے روپے

فی پرچہ
1/4/-

نیا دور، ۹۲ خلاصی پالیم، بنگلور سٹی

ترتیب

مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
ترقی پسند ادب ...	قاضی عبدالغفار	۱
اپریل فول (مزاحیہ)	رشید احمد صدیقی	۲۲
پرانے نوادر کی دکان میں (مزاحیہ)	ابن انشا	۱۲۱

تبصرے

عنوان	مصنف	صفحہ
عصمت کی ٹیڑھی لکیر	عزیز احمد	۱۴۳
ن۔ م۔ راشد پر	علی جواد زیدی	۱۵۰

کہانیاں

عنوان	مصنف	صفحہ
جہازی	وی۔ ایس۔ پرچٹ	۸
جمالیات	علی عباس حسینی	۴۷
باجی	ممتاز مفتی	۷۶
زندگی کا رس	نٹ ہیمسن	۹۷
بے آسرا	ناہید عالم	۱۰۷
پیغمبر (تمثیلچہ)	جاوید اقبال	۱۱۹

طویل نظمیں

عنوان	شاعر	صفحہ
غار	مخمور جالندھری	۳۸
کشتیاں اور ریت	محمد صفدر	۴۲
حوا کی بیٹی	فکر تونسوی	۹۱
تسنیم کے نام	احمد ندیم قاسمی	۱۴۳

غزلیں

عنوان	شاعر	صفحہ
غزل مسلسل	احمد ندیم قاسمی	۷۳
غزل	کمال احمد صدیقی	۱۲۸
غزل	لطیف انور	۱۲۹
نقرئی دھندلکے	ادا بدایونی	۱۳۳

نظمیں

عنوان	شاعر	صفحہ
بزدل	یوسف ظفر	۶۴
آل	مظہر ح۔ یوسف	۷۴
تجدید	اختر الایمان	۹۵
دو مختصر نظمیں	وامق جونپوری	۹۶
بھولی ہوئی یادیں	علی سردار جعفری	۱۰۲
انگڑائی	عبدالمتین عارف	۱۳۰
دلہن	قتیل شفائی	۱۳۲
دو نظمیں	منیب الرحمٰن	۱۴۰

سارے مضامین نیا دور کے لئے موصول ہوئے ہیں اور پہلی دفعہ شائع ہو رہے ہیں۔

حرفِ آغاز

"نیا دور" کا یہ نمبر ہر طرح سے متوازن اور متنوع ہے۔

مضامین میں تین سنجیدہ مضامین ہیں، دو مزاحیہ۔

مزاحیہ نگاروں میں رشید احمد صدیقی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ رشید صاحب کے مزاح میں فکری عنصر ہوتا ہے اور ان کے لطیف اشارے بھی وسیع و عمیق ہوتے ہیں۔ "اپریل فول" ان کی ایک ریڈیائی تقریر ہے۔ اور ظاہر ہے چندہ منٹ کی مختصر گفتگو میں رشید صاحب کو کھل کر کہنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ پھر بھی اشاروں اشاروں میں وہ ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جنہیں پڑھنے میں ہر بار کچھ نہ کچھ نئے مطالب سامنے آتے ہیں۔ یہی تو رشید صاحب میں خاص خوبی ہے۔ پچھلے چند سالوں سے وہ صرف ریڈیو کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اچھا ہے یا برا۔ لیکن رشید صاحب کو ان کے پرستاروں کی رائے بھی معلوم ہو جائے: وہ "خنداں" سے زیادہ مطمئن نہیں انہیں "مضامینِ رشید" بہت بھاتے ہیں۔ اب جب کہ پطرس بھی ریڈیو سے الگ ہو رہے ہیں تو رشید صاحب کو وہاں سوائے سردار پٹیل کے، جن کی ہستی غنیمت ہے، (اب اس دور میں ہر چیز غنیمت ہے) اور کس چیز سے دلچسپی ہو سکتی ہے!

سٹیفن لی کاک کی طرز پر، ابن انشا کا "نواد کی دکان میں" بہت کامیاب مزاحیہ ہے۔ اس کے ہر ہر پیراگراف پر آپ بے تحاشہ ہنس ہنس پڑیں گے، اور اختتام پہ تو پھڑک ہی اٹھیں گے۔ اسے ضرور پڑھیے۔ مضمون کی جس طرح باقاعدہ تعمیر کی گئی ہے۔ اس سے اس میں افسانے کی سی نزنش آگئی ہے

قاضی عبد الغفار نے ایک چھوٹے سے مضمون میں بڑی خوبی سے ترقی پسند ادب کا ماحصل پیش کر دیا ہے ــــ "ن۔ م۔ راشد پر" حیات اللہ انصاری کی کتاب شائع ہونے کے بعد، اس موضوع سے متعلق بہت سے مضامین نکل رہے ہیں، جن میں اکثر صرف یک طرفہ بحث نظر آتی ہے، بلند دعوے ہوتے ہیں، انہیں باطل ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ان میں جذبہ زیادہ ہے سنجیدگی کم۔ لیکن علی جواد زیدی نے اپنے مختصر مضمون میں میتھو آرنلڈ کے تنقید نگار کا فرض بہ حسن و خوبی انجام دیا ہے۔ ایک طرف حیات کی کتاب کا ماحصل پیش کیا ہے، تو دوسری طرف ن۔ م۔ راشد کا دوسرے پہلوؤں سے بھی، جن کو اس کتاب

میں نظر انداز کر دیا گیا تھا، تعارف کرایا ہے۔

عصمت چغتائی کا تازہ ناول ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ جنس بھی گرم ہے اور ریویو بھی۔ عزیز احمد خود اچھے ناول نگار ہیں۔ ان کا ناول "گریز" جدید اردو ناولوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ذہین نقاد بھی ہیں۔ اس مضمون میں صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے یہ کڑی کڑی باتیں محض کہنے کی خاطر یا بعض نظریوں سے مخالفت کی بنا پر نہیں کہی ہیں۔ بلکہ چیز کو اچھی طرح تول پرکھ کر اس کی خامیاں بتائی ہیں۔ ایک جاننے والے کے سے انداز میں جسے اپنے فیصلے پر اعتماد ہو ــــ مسلسل نشتر زنی کے باوجود ان کے انداز سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ اور ایک ایسے تنقید نگار کے لئے جو خامیوں کو بتا رہا ہو، یہ کوئی کم کامیابی نہیں ــــ علی جواد اور عزیز احمد کے یہ دونوں تبصرے اردو تنقید میں ایک بہت اچھا معیار قائم کرتے ہیں۔ اردو ادب میں آج اس طرح کے تبصروں کی بہت ضرورت ہے، جو پُر مغز اور سنجیدہ ہوں اور جن میں تعمیری تنقید ہو۔

افسانوں کے حصہ میں آپ کو ایک دلکش افسانہ ملے گا۔ "باجی" ممتاز مفتی نے 'باجی' لکھ کر 'آپا' کی یاد تازہ کر دی۔ 'باجی' گویا آپا کا الٹا ہے۔ آپا یہاں بھائی جان بن گئی ہے، تصدق بھائی ــ باجی چھاجو باجی ــ ولاور، اور بدرو ــ اچھا۔ "آپا" کے سارے کردار یہاں موجود ہیں۔ ممتاز مفتی نے انہیں اتنی ہی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ نئے لطف کے ساتھ ــــ ممتاز مفتی کا خاص میدان "تحت الشعور" ہے۔ اس میں چھپی ہوئی ان کہی کیفیتیں اور ان کا عمل کی صورت میں بیرونی اظہار ــــ یہ مفتی کے افسانوں کا تار و پود ہے لیکن اس دفعہ انہوں نے اپنے خاص میدان سے ہٹ کر ایک سوشیل افسانہ لکھا ہے۔ اور وہ بھی ایسا جو بلاشبہ "آپا" سے ٹکر لے سکے۔ رہی اس میں بھی "نفسیات" تو کس چیز میں نفسیات نہیں؟

پریچٹ، انگریزی افسانہ نگاروں میں جن کا میدان صرف مختصر افسانہ ہے ــ سب سے پیش پیش ہیں۔ بہت دنوں سے ہماری خواہش تھی۔ کہ پریچٹ کو پیش کریں۔ اور ہم شبلی بی، کام کے بہت شکر گذار ہیں کہ جب ہم نے 'دی سیلر' کا انتخاب کر کے ان سے اس کا ترجمہ کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے منظور کر لیا۔ شبلی صاحب بہت اچھا ترجمہ کرتے ہیں۔ لفظ بہ لفظ ہونے کے باوجود ان کے ترجمے میں نہ صرف روانی ہے بلکہ اصل کی روح بھی برقرار ہے۔

"تحت الشعور" کے افسانوں میں پریچٹ کے تین افسانے بہت مشہور ہیں۔ 'دی سیلر'، 'مس بیکر'

اور دی سینٹ۔ "دی سیلر" ان سب میں اچھا افسانہ ہے۔ اور اس کا شمار پریمٹ کی بہترین کہانیوں میں ہوتا ہے۔ یہ "نیو رائٹنگ" پیر نگوین نیو رائٹنگ اور آرگوسی میں شائع ہوا۔ اور اب ان کے تازہ مجموعے "It may never happen" میں شامل ہے۔ یورپ کی جدید افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جان لیمین نے اس افسانے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے: "دی سیلر" ایک بہت کامیاب نفسیاتی مطالعہ ہے، انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کو چیرتی ہوئی ایک گہری نظر — یہ سیدھا سادھا جہازی ہر چیز میں ترتیب دیکھتا ہے۔ اور اس ترتیب کے دور بھاگنا چاہتا ہے، لیکن اس میں اس طرح پھنس جاتا ہے اور ترتیب اسے اس درجہ مغلوب کر لیتی ہے کہ اسے بالکل ہوش ہی نہیں رہتا وہ کیا کر رہا ہے اس لئے جب وہ سب کہتا پھرتا ہے کہ وہ ترتیب کے پاس پھٹکتا تک نہیں، وہ ریاکار نہیں ہے ہمیشہ سمندر پر رہنے والا جہازی 'خشکی' پر آکر جیسے کھو جاتا ہے۔ اس کردار سے ہمیں ہمدردی ہونے لگتی ہے، اور اسے معاف کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں!

'نیا دور' اس دفعہ ایک بہت بڑے ادیب کو پیش کر رہا ہے۔ ناروے کا شہرۂ آفاق ادیب — نٹ ہمسن۔ 'Growth of The soil' اور 'Hunger' سی شاندار ناولوں کا مصنف ایک بالکل ہی چھوٹے کیانواس پر بھی کامیاب ہے۔ بظاہر کتنی مختصر اور سیدھی سادھی کہانی ہے مصنف ایسے انداز سے بیان کرتا جا رہا ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، معمولی بات ہے لیکن جب پڑھنے والا آخر تک پہنچتا ہے تو یہ احساس پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے یہ کہ بغاوت کی انتہا ہے، اس عورت نے کس قدر زبردست انتقام لیا ہے!

نئے ادب کی تحریک سے پہلے افسانہ نگاروں کا جو گروہ پیش پیش تھا، اس میں علی عباس حسینی ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اس گروہ کے باقی حضرات کی ادبی زندگی تو ختم ہو چکی۔ لیکن علی عباس حسینی نے اپنے بدلتے ماحول کا اثر لیا اور اس نئے دور کے ادب کا ساتھ دیا۔ نئے افسانہ نگاروں میں بھی حسینی کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے ہر دور میں ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ "جمالیات" کچھ ان کے پچھلے دور کی یاد دلاتا ہے۔ واقعاتی افسانہ ہے۔ اور ہمارے خیال میں پردۂ سیمیں کے لئے بہت موزوں ہے۔

بے آسرا، درد بھری داستان ہے۔ ناہید عالم بالکل نئی نئی آئی ہیں۔ لیکن اچھا لکھتی ہیں۔ "بے آسرا" ان کا بہترین افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں انہوں نے موضوع کو پورے درد اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سارے افسانے میں بے بسی، تڑپ، جلن حلول کر دی ہے۔ اور اسی خلوص کی شدت سے افسانہ بہت اثر انگیز ہو گیا ہے۔

اور آخر میں ایک بالکل نئے انداز کی چیز — جاوید اقبال کا تمثیلچہ "پیغمبر" جاوید اقبال علامہ اقبال مرحوم کے محبوب فرزند ہیں۔ یہ ادبی میدان میں ابھی ابھی آئے ہیں لیکن اپنی ذہانت اور لکھنے کے نئے انداز سے انہوں نے جلد ہی اپنے لئے جگہ بنالی ہے ان کے افسانے اور تمثیلچے 'باطن نگاری' یا 'اظہاریت' .... (Expressionism) میں تجربے ہیں "ایکسپریشنزم" — اس لفظ کو کروچے نے ایک اور ہی معنی میں استعمال کیا تھا۔ آرٹسٹ کے ذہن میں intuition ۔ آرٹسٹ کی نظر جب کسی چیز یا واقعہ کو دیکھتی ہے تو اس کا تاثر ذہن میں قائم ہوتا ہے کبھی یہ تاثر ہلکا ہوتا ہے اور مٹ جاتا ہے۔ کبھی گہرا ہوتا ہے اور ذہن میں ثبت ہو جاتا ہے۔ ایسا تاثر جب فن کار پر بہت گہرا اثر چھوڑے تو احساس، وجدان اور تخیل مل کر ذہن ہی میں اسے ایک خوب صورت شکل دے دیتے ہیں۔ یہ اندرونی اظہار اور تشکیل کروچے کی نظر میں 'اظہاریت' ہے۔ لیکن آج کے ایکسپریشنسٹ جو اپنے آپ کو کروچے کا شاگرد بتاتے ہیں "ایکسپریشنزم" سے ان تصورات کی عکاسی مراد لیتے ہیں جو ذہن و احساس کی کسی خاص کیفیت کے زیر اثر باطن کی آنکھ دیکھتی ہے۔ سمبالزم، ایکسپریشنزم اور سرریلزم وغیرہ انگریزی میں اب یہ نئے رجحانات بن کر آرہے ہیں، بالکل خارجی قسم کی حقیقت نگاری کے خلاف — سرسری طور پر دیکھنے سے تو یہ تصورات کی دنیا حقیقت سے دور ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں حقیقت اور زیادہ گہرائی سے پیش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آج کا انسان، جو تنہائی، اکتاہٹ، دباؤ، گھٹن، محسوس کرتا ہے، یہ احمد علی کے "قید خانہ" سے زیادہ اردو کے کسی افسانے میں اتنی گہرائی کے ساتھ پیش نہیں ہو سکا ہے حالاں کہ افسانہ نگاروں نے اس کی کوشش کی ہے۔ جاوید اقبال چھوٹی چھوٹی تمثیلوں میں ایک خاص خیال کو 'باطن نگاری' کے ذریعہ اچھی طرح پیش کرتے ہیں۔ "پیغمبر" ایک ایسے نوجوان کے ذہنی اضطراب کا خاکہ ہے جو فطرتاً گناہ کی طرف مائل نہیں، بلکہ سماجی پابندیوں اور اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ کردار کے ذہن کی آنکھ، تاریکی، شعاعیں، سایہ، فرشتہ، وغیرہ۔ ان تصورات کو ایک طرح کے دن کے خواب کی صورت میں دیکھتی ہے۔ اور کس نازکی سے جاوید اقبال نے ان کا اظہار کیا ہے!

"ایکسپریشنزم" میں ایک خدشہ یہ ہے کہ دیکھا دیکھی ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کرنے پہ لگ جائے اور اسے آسان سمجھ کر جس طرح کی تصویریں چاہے کھینچ کر رکھ دے۔ اور کسی اعتراض اور تنقید کا جواب تو آسان ہے ہی "ارے یہ تو غیر معمولی کی ذہنی کیفیات ہیں، انہیں باطن کی آنکھ دیکھتی ہے۔ اسے معمولی تنقید کے معیار پر کیسے پرکھا جا سکتا ہے؟" ایسے ہی شعور کی رو کو جب سے عسکری اردو میں لے آئے ہر کوئی اسے استعمال کرنے لگا ہے

اور اس رَو میں جو چاہا بہا دیا ہے۔" اس نے یہ سوچا وہ سوچا" خیالات کی رو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس پر کوئی محاسبہ بھی تو نہیں کہ ایک مدیر روک لیں!

اس دفعہ نظم کے حصے سے ہم بہت مطمئن ہیں، یہاں بھی تنوع نظر آئے گا، مختصر نظمیں، طویل نظمیں، غزلیں، پابند نظمیں، آزاد نظمیں سبھی ہیں اور سب کی سب اچھی۔ یوسف ظفر کی 'بزدل' اختر الایمان کی 'تجدید' وامق کی مختصر نظمیں، احمد ندیم قاسمی کی 'غزل مسلسل' خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ادا بدایونی نے اپنی چھوٹی سی غزل میں کئی کیفیتوں کی تصویر کھینچ دی ہے اور قتیل شفائی کی نظم کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اس ننھی منی سی نظم اور اس کے ننھے منے سے مصرعوں میں ایک افسانہ کہہ گئے ہیں۔ نجیب الرحمٰن کی دو مختصر نظموں میں ماحول کی تلخی بسی ہوئی ہے۔ مخمور کے 'غار' میں خطروں کے منہ میں آگے بڑھنے کا عزم ہے، ندیم قاسمی کی طویل نظم کے پیچھے ایک پاکیزہ جذبہ اور شدید احساس کارفرما ہے۔ محمد صفدر نے اپنی نظم 'کشتیاں اور ریت' میں ٹکنیک کا ایک نیا تجربہ کیا ہے، معلوم نہیں یہ ٹکنیک مقبول ہوگی یا نہیں ویسے نظم تو پڑھنے میں صاف ہے، اور بڑی اثر انگیز ہے۔ لیکن اس نمبر کی سب سے زوردار فکر تونسوی کی "حوا کی بیٹی" ہے، اس نظم میں صرف خیال کی ندرت ہی نہیں بلکہ الفاظ کا چناؤ اور ترتیب اس قدر اچھی ہے کہ اس سے آدم کی تخلیق کے وقت کائنات اور فضا کا نقشہ نہایت کامیابی سے کھینچ گیا ہے۔ اور ان الفاظ کے چناؤ اور ترتیب میں صوتی اثر تو بڑا زبردست ہے۔

ایک کھٹک رہ گئی ہے کہ ہم چند مضامین اس نمبر میں پیش نہ کر سکے۔ "ترقی پسند تحریک" پر آلِ احمد سرور کا مقالہ ہم جلد ہی پیش کریں گے۔ کچھ عرصے پہلے عطا محمد نے ایک سلسلہ "نئے نقاد" شروع کیا تھا۔ "نیا دور" میں "نئے نقاد — (۱) فراق گورکھپوری" شائع ہوا۔ اب انہوں نے ہمیں اس کی دوسری کڑی بھی فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کے "نئے نقاد — (۲)" کلیم الدین احمد ہوں گے۔ لیکن اس دوران میں عبادت بریلوی کا مضمون اسی سلسلہ میں آ گیا ہے۔ انہوں نے ایک اور نئے نقاد پر لکھا ہے ... لیکن ابھی سے ہم کیوں بتائیں کہ یہ مضمون کس نقاد پر ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ عبادت صاحب کا یہ مضمون جامع اور بہت اچھا ہے، اور کچھ طویل بھی۔ اور نقاد وہ جو نئے نقادوں میں سرِ فہرست ہے۔ یہ مضمون بہت دیر سے موصول ہوا ورنہ اس کے لئے ضرور گنجائش نکال لی جاتی — فراق گورکھپوری کا مکالمہ "موت سے پہلے" بھی بہت دیر سے موصول ہوا۔ ایک اور مضمون جس کا آپ سب کو بہت زیادہ انتظار رہا اور جس کے شائع کرنے کا اعلان ہم دو تین نمبروں سے کرتے آ رہے ہیں۔ ممتاز شیریں کا مضمون "۱۹۴۵ء کے اچھے افسانے" اس نمبر میں بھی شائع نہ ہو سکا۔ بات یہ ہوئی کہ ان کا یہ مضمون ۱۹۴۵ء کے افسانوں پر تھا اور اب ۱۹۴۶ء بھی قریب الختم ہے۔ اتنی دیر سے یہ مضمون شائع کرنا کچھ مناسب نہ تھا۔ اب انہوں نے ساتھ ہی ۱۹۴۶ء کے افسانوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اور مضمون نئے سرے سے لکھا ہے۔ ہم اسے نمبر ۱۱ میں ضرور شائع کریں گے۔ اس طرح ہمارے پاس بہت اچھے مضامین کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، صرف مضامین کی یہ فہرست ہی آپ کو "نیا دور" کے آئندہ نمبروں کے لئے بے چین رکھے گی۔ افسانوں کا تو کہنا ہی کیا؟ "نیا دور" میں افسانوں کا انتخاب ہمیشہ سے کڑا رہا ہے

بنگال

وہ سرزمین

جہاں نغمہ نے جنم لیا، جہاں فن کی آبیاری ہوئی، ادب پھولا پھلا، جس کی کوکھ سے ٹیگور، سرت چندر اور نذر الاسلام پیدا ہوئے اور آج بھی جس کا ادب اس قوم کو زندگی بخش ہے

..... آج بنگال پر موت منڈلا رہی ہے، بنگال کی روح زخمی ہے۔

زخمی بنگال — کی خدمت میں — نیا دور کا ہدیہ

نیا دور نمبر ۱۰ـ۱۱

بنگالی افسانہ نمبر ہوگا

اس میں دورِ جدید کے نامور بنگالی افسانہ نگاروں کی بہترین نگارشات کا انتخاب ہے۔ ترجمہ کیلئے ان کے تحریری اجازت نامے حاصل کرلئے گئے اور ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اردو کے نامور ادیبوں نے ہمارے لئے ان کا ترجمہ کیا ہے۔

لکھنے والے بنگالی کے نامور ادیب ہیں	افسانہ	اور ترجمہ کرنے والے اردو کے نامور ادیب
تاراشنکر بنرجی	جلسہ گھر	پریم ناتھ پردیسی
منوج باسو	میری زمین	سہیل عظیم آبادی
مانک بنرجی	سیڑھی	سید احتشام حسین
پربودھ سانیال	سہاگن	احمد ندیم قاسمی
شیلجانند مکرجی	بے گھر	پریم ناتھ پردیسی
اچنت کمار سین گپتا	دھرتی کی پکار	محمد شاہین
پریم نند مترا	چین	شبیر محمد اختر
بودھا دیو بوس	یاس	شبلی بی، کام
سبودھ گھوش	تاڑی کا پیڑ	سہیل عظیم آبادی
نارائن گنگو پادھیائے	گرہمیہ	ممتاز شیریں
آشالتا دیوی	ادا	ابن انشا
سومن چندا	چوہے	؟

— ان کے ساتھ —
"بنگالی افسانوی ادب پر" محمد یونس احمر کا مضمون ہوگا اور ممتاز شیریں ان بنگالی ادیبوں کا "تعارف" کراتے ہوئے شامل شدہ افسانوں کا "جائزہ" پیش کریں گی، اور بنگالی افسانہ پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مضمون کی توقع ہے —
سب کے فوٹو بھی شائع ہوں گے۔

رشید احمد صدیقی

علی عباس حسینی

وی۔ یس۔ پرتچت

شبلی بی، کام۔

قاضی عبدالغفار
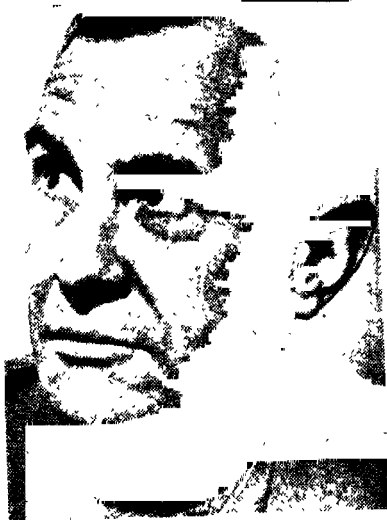
ترقی پسند ادب

قوموں کا ادب عمومی زندگی سے جس قدر زیادہ قوت تخلیق حاصل کرتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کو 'ترقی پسند' کہا جا سکتا ہے۔ ہندستان کا ادب جب تک درباری تھا اکثر عمومی زندگی کا صحیح ترجمان نہ ہو سکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب یا تو تاج و تخت کی مرکزیت سے وابستہ ہوتا تھا یا خواص کے اعلیٰ طبقوں کی محفلوں میں شمع محفل بنتا تھا۔ تہذیب و تمدن کے اس دور انحطاط میں جو ابھی ختم نہیں ہوا ہے شاعری اور ادب کے افکار کا مرکزی نقطہ یا تو اپنے سرپرستوں کی ثنا و صفت تھی، یا چشم و ابرو اور زلف و گیسو کی کوئی لذت بخش داستان جو ایک بہکا ہوا تعیش تھا۔ اس تاریخی حقیقت کو تو ماننا ہی پڑیگا، کہ ۱۹ویں صدی کے خاتمہ اور ۲۰ویں صدی عیسوی کے آغاز سے پہلے ادب اور عمومی زندگی کے درمیان وہ ربط پیدا نہ ہوا تھا، جس کو اب زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات نے پیدا کر دیا ہے۔ اجتماعی زندگی کے شیرازہ پر شخصی یا جماعتی مرکزیت کو جو اقتدارات حاصل تھے ان کے کمزور ہو جانے کے بعد ذہنی تعیش کے تصورات بھی بدلنے شروع ہوئے۔ جب تک کسی سماج میں شخصی اور جماعتی تفوق، قائم رہتا ہے اس کے تمام سماجی اور اخلاقی مسائل بھی اعلیٰ اقتدارات کے مقرر کردہ پیمانوں میں ناپے جایا کرتے ہیں، لیکن اس مرکزیت کا انحطاط اس کے قدیم اقتدارات کو عوام کے تمام طبقات میں تقسیم کرنا شروع کر دیتا ہے، اور اس طرح قومی ادب میں نثر و نظم کی چمن بندی بادشاہوں اور امرا کے پائیں باغوں میں محصور رہنے کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی جھونپڑیوں اور کھیتوں میں منتقل ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ ادب کی عصمت جو بادشاہوں کے شہ نشینوں اور اُمرا کے محلسراؤں میں محفوظ رہا کرتی تھی اب عمومیت کے دامن سے وابستہ ہو کر ملک کے ذہنی ارتقا کی ایک نئی منزل پر پہنچی ہے۔ ادب کے انقلاب کی ایسی کوئی مثال ہندستان

کی قدیم تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جدید سائنس کی ترقی نے مواصلات اور رسل و رسائل کے لاکھوں ذرائع پیدا کر دئے، اور ہندستان کی سرحدوں کو دور دراز ممالک کی سرحدوں سے ملا دیا، ناممکن تھا کہ یہ اتصال ہمارے ادب پر بھی اپنا اثر پیدا نہ کرتا۔ عہد جدید میں علوم کی ترقی نے کمزور اور طاقتور قوموں کی آویزش سے جو نتائج پیدا کئے ان کا قدرتی ردّعمل یہ ہوا کہ عوام کے معاشی اور سماجی مفادات فکر و نظر کے دائرہ میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونے لگے اور اہل نظر نے دیکھ لیا کہ جدید تہذیب و تمدن کا تمام زہریلا مواد دنیا کے معاشی پھوڑے ہی میں بھرا ہوا ہے۔

عہد قدیم میں ادب صرف بالواسطہ اس ذہنیت کا ترجمان ہوتا تھا جو درباروں کے عروج و زوال سے وابستہ ہوتی تھیں لیکن اب وہ براہ راست اس اکثریت کے کوائف کا ترجمان بننے لگا ہے جو اعلیٰ اقتدارات کی مرکزیت کو اپنی عمومیت میں منتقل اور تقسیم کر رہی ہے اس لئے اگر آج ہمارا ادب مزدور اور کسان کی روٹی اور بھوک کے مسئلے کو زیادہ نمایاں کر رہا ہے، تو یہ ایک قدرتی ردّعمل ہے جس پہ حیران ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہندستان میں اشتراکیت ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت سے قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن عمومیت کے سماجی اور معاشی تصورات میں اس کا قدم ناقابل انکار ہے اردو کے جدید ادب نے بھی اگر یہ رجحانات ظاہر کئے ہیں تو وہ عہد جدید کے ذہنی ارتقا کا قدرتی اور منطقی نتیجہ ہیں جن سے منہ پھیر کر گزر جانے کے راستے اب ارباب فہم و فکر کے لئے بند ہوتے جا رہے ہیں۔

ان جدید رجحانات کو قدیم ادب کی مخالفت قرار دینا یا اس تعمیری کوشش کو تخریبی سمجھ لینا محض ایک جذباتی اور اضطراری کیفیت ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں، کہ جدید ادبی تحریک کی بنیاد بلاشبہ وہی قدیم ادب ہے جس نے قدیم اساتذہ کی گودوں میں پرورش پائی تھی مگر اس قدیم عمارت میں وقت کی ضرورتوں اور زمانہ کے تغیرات کا لحاظ کر کے تغیر و تبدل کرنا نئی محرابوں، نئی دیواروں، نئے گنبدوں کا اس میں اضافہ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہم بنیاد سے قطع نظر کر کے کوئی نئی دیوار مستحکم نہیں بنا سکتے اور میں ایسے ترقی پسند ادیبوں کو ترقی پسند نہیں سمجھتا جو نئے ادب

کی بنیاد قدیم ادب کی تحقیر اور تنقیص پر قائم کرتے ہوں لیکن اسی کے ساتھ قدیم ادب
کی مبالغہ آمیز حمایت کرنے والوں کا یہ رجحان بھی قابلِ تحسین نہیں کہ وہ جدید ادب کے
محرکات سے قطع نظر کرکے اس پر قدیم ادب سے دشمنی کا الزام لگاتے ہیں۔ میں مانتا
ہوں کہ جدید ادب میں ایک ذہنی بغاوت کا نمایاں عنصر موجود ہے لیکن وہ بغاوت
قدیم ادب سے نہیں بلکہ قدیم نظم زندگی کے خلاف ہے ۱۹۱۴ء سے آج تک گذشتہ
۳۰ سال میں مغربی تہذیب و تمدن کے خوفناک نتائج سے واقف ہونے کے لئے
ایسے قدامت پرست کتنے ہیں جو اس فتنہ انگیز نظم زندگی کی حمایت کرنے پر اپنی آمادگی
ظاہر کرنے کی جرأت کر سکیں شاید ادھر ادھر بعض گوشوں میں چند ایسے قدامت پرست
بھی ہوں گے جن کا دل مستقبل کے تصور سے خالی اور ماضی کی تمام مایوسیوں پر
قانع ہوگا مگر یہ حالت مرض ہے اور میں تو کسی ایسی عمومی زندگی کا تصور نہیں کرسکتا،
جو افکار کی اس نکبت اور پستی سے صلح کرسکتی ہو۔ گذشتہ صدیوں کے ذہنی فالج کے
اثرات کو زائل کرنے کی کوئی بھی کوشش باوجود اپنی تمام خامیوں کے بلاشبہ مستحسن ہے
اور اس لئے اگر جدید ادب دنیا کے موجودہ انتشار میں کوئی ایسا راستہ تلاش کر رہا ہے تو
اس پر مخالفانہ نکتہ چینی اور تعریض قرینِ انصاف نہیں بلکہ یہ فرض تو خود قدیم ادب کے
حامیوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور جدید ادب کی رہنمائی کریں۔

جدید ادب کے بعض رجحانات کے حسن و قبح کے متعلق بھی میں کچھ اشارے کرنا
چاہتا ہوں۔ یورپ کے اس ذہنی انقلاب نے جو آگ فولاد اور خون کی خوفناک آویزشوں
سے پیدا ہوا ہے اگر ایک طرف جدید ادب کو قوتِ حیات بخشی تو دوسری طرف اس میں افراط و
تفریط کے بعض قابلِ اصلاح نقائص بھی پیدا کر دیئے بعض گوشوں میں ادب ایک سستی
تجارتی جنس بنایا جا رہا ہے سیاست اور جنگ کے پروپیگنڈے کی ضرورتوں نے ادب
کی اس نئی قوت کو خریدنا شروع کر دیا ہے یہ خرید و فروخت ہماری ذہنی اور وجدانی زندگی
کا ایک بہت بڑا اخلاقی عقیدہ بنتا جا رہا ہے میں اہلِ قلم کے کاروباری اور معاشی
مفادات سے قطع نظر نہیں کرسکتا اور میں ادیب اور اہلِ قلم کا یہ ناقابلِ انکار حق سمجھتا

ہوں کہ جب وہ اجتماعی زندگی کی خدمت کریں تو اس کا معقول معاوضہ بھی پائیں، روٹی کا سوال ان کیلئے بھی اتنا ہی اہم ہے، جتنا ملت کے کسی اور طبقے کے لئے۔ لیکن قومی ادب بازار سیاست میں مولی اور گاجر کی طرح فروخت نہیں کیا جا سکتا اور نہ کوئی قومی ادب آنکھ بند کرکے بالا دست مفادات کا چاکر اور نیاز مند بن سکتا ہے، وہ محض راہ گیر نہیں ہے بلکہ اس کو قومی زندگی کا رہنما ہونا چاہیئے وہ اگر اپنی عزت نفس کے ساتھ اپنے پیام کو بھی بھول جائے تو پھر وہ چاہے آسمان کا تارا بن جائے مگر عمومی ادب تو نہیں بن سکتا! اسی لئے ادیب کی معاشی ضروریات اور ادب کی تجارتی قیمت کے درمیان ایک ایسے توازن کی ضرورت ہے جو دونوں کو اپنے صحیح مقام پر قائم رکھ سکے۔

جدید ادب میں جدت طرازی کا رجحان بھی میرے خیال میں بعض اوقات افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے ضروری نہیں کہ ہر نئی چیز صرف اس لئے قابل قدر یا بیش قیمت ہو کہ وہ نئی ہے شعر کو قافیہ اور ردیف سے آزاد کرکے اس کے مطالب کو جامع اور الفاظ کو مختصر کرنے کی کوشش بری نہیں، لیکن بری بات یہ ہے کہ بعض نئے ادیب محض اس لئے بلینک ورس لکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک نیا اسلوب نگارش ہے اور محض نیا ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کی نظر کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے لیکن اس ذوق ناتمام بلکہ بدذوقی کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ادب ایک مسخرہ پن بنا جا رہا ہے۔ عرف عام میں "ادب لطیف" کی نہایت نازک اصطلاح بے معنی مسخرگی کا ایک افسوسناک مظاہرہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس مسخرگی کی ہزارہا مثالیں ہر روز نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ بعض اوقات وہ اچھے اچھے اور معیاری رسائل میں بھی جگہ پاتی ہیں۔

جنسیات اور عریاں نگاری کے مسئلے پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جا رہا ہے میں اس مختصر انتشار میں کچھ اور اضافہ نہیں کرنا چاہتا، مگر صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جنسیات کے مسائل سے بحث کرنا اور سماج کے ان مفاسد کو عریاں پیش کرنا ایک ترقی پسند ادیب کا حق اور فرض ہے لیکن محض جنسیات ہی کو جدید ادب کا اوڑھنا بچھونا بنا لینا ایسی افراط و تفریط ہے جس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے بعض نام نہاد ترقی پسند ادیب یا تو ادنیٰ جنسی جذبات کی سوداگری کر رہے ہیں یا خود اپنی نفسیات کے گندے رجحانات سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہیں

یہ ایک مجرمانہ لغزش ہے جس کی وجہ سے قدرتی چشمے کا شفاف پانی گندہ ہو رہا ہے ہمارے مذہبی اور قومی لیڈروں نے مبنی مسائل اور سماجی مسائل کی مذمت کرنے اور ایسی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں مجرمانہ غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کو معاف نہیں کیا جا سکتا اور بلاشبہ یہ کام ترقی پسند ادیبوں کا ہے۔ وہ اصلاحی اخلاقیات اور تصنعات کو ٹھکراتے ہوئے بڑھیں اور سماج کے ان ناسوروں اور زخموں کو سماج کے سامنے عریاں پیش کر دیں۔ البتہ احتیاط کی ضرورت صرف اس امر میں ہے کہ اس قسم کی عریاں نگاری میں ادیب کی نیت نیک ہو اور وہ کم سے کم عریانی کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے پر قادر ہو۔

اردو نظم و نثر کو آسان اور عام فہم بنانے کا مسئلہ بھی اپنے اندر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے سیاسی تفریق کے رجحانات نے ہمارے ادب میں بھی ضرورت سے زیادہ مداخلت کر لی ہے میرا مدعا یہ ہے کہ آرٹ کو کسی قسم کی سیاست کا حکم بردار نہ ہونا چاہیئے ایسا آرٹ لوہار کا ہتھوڑا اور درزی کی قینچی بن کر رہ جاتا ہے۔ دراصل ترقی پسند ادب کے ہر شعبہ کا معیار قائم کرنے کے لئے با اثر ادارہ کی ضرورت ہے۔ جو ترقی پسند ادیبوں کے کام کی نگرانی کر سکے اور عریاں نگاری اور اصلاح زبان کے مسائل کا ایک درجۂ اعتدال مقرر کر سکے۔ اس وقت جدید ادب کا ارتقا غیر منظم ہے۔ وہ یوں کہ زمانہ کا تقاضا ہے اس لئے ہر روز بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ لیکن اس ترقی اور پھیلاؤ کے ساتھ ہی ساتھ تنظیم کی ضرورت بھی ہے۔ بغیر اس کے اندیشہ یہ ہے کہ خودرو سبزہ زار ایک گھنے جنگل کی صورت اختیار کر یگا جس میں بہت سے سانپ بچھو پرورش پا سکیں گے۔

اردو، ہندی کا مناقشہ بھی جو ہمارے جسد قومی کا ایک ناسور بن گیا ہے، بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر اردو زبان کی آسان اور عام فہم بنانے کے رجحانات سے مدد لی جائے۔ قدیم دور کے دو شاعر۔ ایک فقیر شاعر امیر خسرو اور ایک عوامی شاعر جو درباری شاعر نہ تھا، یعنی نظیر اکبرآبادی۔ اردو و ہندی کا ایک خوش گوار سنگم پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کر چکے ہیں آج اگر ہمارے ادیب اور شاعر ملک کی قومی زبان کے مسئلہ کو حل کرنے میں نظیر اکبرآبادی کے ادبی اجتہادات سے مدد لیں اور اپنے آرٹ کو مذہب اور سیاست کی اصطلاحوں

سے بلند تر لے جائیں تو یہ مشکل کام اتنا مشکل نہ ہوگا۔

زبان کی ترقی کا ایک پہلو اور بھی ترقی پسند ادیبوں کی توجہ کا مستحق ہے، وہ فلم اور ریڈیو کے ادبی رجحانات کا مسئلہ ہے۔ ریڈیو کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے اس لئے کہ وہ ایک سرکاری محکمہ ہے اور اس کی پالیسی کو عوام کے مفادات سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ کوئی قومی ادارہ ہوتا تو وہ مجبور کیا جا سکتا کہ قومی زبان کی ترقی اور اصلاح کا کوئی معین مسلک اختیار کرلے۔ لیکن یہ کیا غضب ہے کہ فلم کے کاروبار میں بھی اردو ادب کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہے۔ اردو ادب اور نظم و نثر کو جس قدر نقصان فلم کمپنیوں کے نفع گیر سرمایہ داروں سے پہنچا ہے، اتنا تو شاید فرقہ پرستوں کے مناقشوں سے بھی نہیں پہنچا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر روز ان فلموں کی نظموں، مکالموں اور افسانوں میں زبان کا معیار گرتا جا رہا ہے شاعری اور موسیقی کو تو ان فلموں نے برباد ہی کر ڈالا اس طرح کا کاروبار دراصل زبان اور آرٹ کی عصمت فروشی ہے جس کے اجارہ دار ہمارے ملک کے جاہل سیٹھ اور ساہوکار بنے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند ادیب اگر ڈرامہ اور فلم کا کوئی اچھا معیار قائم بھی کرنا چاہیں تو اس لئے نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس کوئی تھیٹر نہیں ہے لہٰذا ایک قومی تھیٹر کی ضرورت ہے جس کی شاخیں ہر بڑے شہر میں بہترین نمونے پیش کر سکیں اور جس کے اسٹیج پر ترقی پسند ادب کے اصلی تصورات کی صحیح ترجمانی کی جا سکے۔ اس قسم کی ایک تحریک بمبئی میں شروع ہو چکی ہے لیکن اس کی ضرورت زبان اور ادب سے ایسے مرکزوں پر زیادہ ہے۔ جیسا کہ لکھنؤ ہے۔ اگر ہمارے نوجوان طلبا اس جانب توجہ کریں تو نہ صرف ترقی پسند ادب کی یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی بلکہ وہ اس زہر کا تریاق بھی ہوگا، جو آرٹ اور ادب کے خرمن میں فلم کمپنیاں چلا رہی ہیں — صرف ایک بات اور عرض کر دوں ——

ولی سے لے کر میر کے زمانہ تک شاعری کے ہر دور میں شعرا جو کچھ لکھتے تھے، وہ اس زمانہ کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی حالات کا ایک عکس ہوا کرتا تھا ماضی قریب میں محمد حسین آزاد سے غالب و حالی۔ سرسید، نذیر احمد اور شبلی تک ہم ادب کے بہت نمایاں تغیرات کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن عہد حاضر اور ان اساتذہ کے درمیان ہم ایک بڑا فرق یہ دیکھتے ہیں

کہ قدیم اساتذہ ملک کے سماجی، اصلاحی اور کبھی کبھی بالواسطہ سیاسی مسائل سے جس قدر کم متاثر ہوتے تھے، اب اسی قدر زیادہ لکھنے والوں کی بہت بڑی اکثریت معاشی مسائل پر متوجہ ہے اور ان کے متعلق ان کی تحریریں روز بروز زیادہ پُر زور اور بے باک ہوتی جاتی ہیں۔ افسانہ نگاری بھی شرر اور سرشار کے دور سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا قوت ہے جس نے ادب کا راستہ اس قدر بدل دیا ہے اور زندگی کے وہ عناصر کیا ہیں جنہوں نے ایک نیا ادب پیدا کیا ہے —— نہ صرف پیدا کیا بلکہ اس کو عوام میں مقبول بھی بنا دیا اس انقلاب کی تاریخی تغیرات کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ایک ایسے زاویۂ نظر سے ہمارے ملک کے ادبیات کی تاریخ لکھی جائے جو ہر دور کے سیاسی اور سماجی اور اخلاقی پس منظر کو نمایاں کر دے اور اس ماحول اور ان عناصر کی نشان دہی کرے جن کے اثر سے اہل قلم کے نظریے اور زاویے بدلتے ہیں تب ہی ہم صحیح طور پر معلوم کر سکتے ہیں کہ ادب نے اپنے قدیم سے اپنے جدید تک یہ لمبا سفر طے کرنے میں فطرت انسانی کے کن تقاضوں کی تعمیل کی ہے۔

مغربی اقوام کے موجودہ انتشار نے ہم جیسے تماشائیوں کو بھی بہت سی نئی باتیں سکھا دی ہیں، ہماری نظروں کے بہت سے پردے اٹھا دئے ہیں، بہت سے مستور حقیقتوں کو ہمارے سامنے عریاں کر دیا ہے۔ ادب کی فطرت مجبور ہے کہ ان انکشافات کی مٹھاس اور تلخی کو اپنے اندر جذب کر لے —— یہ عمل جاری ہے اور آرٹ اور ادب کی ان قدیم روایات کی وجہ سے جو لکھنؤ کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں۔ یہ کام لکھنؤ کا ہے کہ اس کے ادیبوں کی جماعتیں اپنی جماعتی قوتوں کو زیادہ بیدار کر کے ادب کے جدید رجحانات کو جہاں وہ ناقص ہوں، درست کرے، اور جہاں وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں وہاں ان کی اعانت کریں جو لوگ صرف اعتراض کرنے کے لئے اردو ادب کے جدید رجحانات کو ہدفِ تعریض بناتے ہیں ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں، وہ چلاتے چلاتے خود تھک جائیں گے۔ لیکن نئے ادب کا قافلہ اپنی فطری صلاحیتوں کے روز بروز بڑھتا ہی چلا جائیگا ایسے معترضین کے متعلق یا تو شاعر کی زبان سے صرف اتنا کہہ دیجئے کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ، جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

یا ارتقا کے اس فطری عمل کے متعلق فیلسوف اقبال کے الفاظ میں صرف یہ کہتے ہوئے گزر جائیے کہ "گراں ہے شب پرستوں پہ سحر کی آسمانی"

(اردو سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھا گیا)

ڈی ایس پرچیٹ ترجمہ:۔ شبلی بی کام

جہازی

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ گھٹنے اٹھا اٹھا کر، اور ہاتھ اونچا کئے موسلا دھار بارش میں سڑک کو عبور کر رہا تھا۔ جیسے کسی شراب خانے کے ٹھہرے وار پردوں میں سے گزر رہا ہو۔ میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ مجھے ضرور آواز دیگا۔ یوسٹن روڈ کا یہ حصہ عام طور پر ایسے لوگوں کا اڈا ہے جن کو چائے پینی ہوتی ہے، یا جو یوسٹن یا کسی قریب کی بستی میں کام پر جانے کے لئے زادِ راہ کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔

"معاف کرنا دوست!" اس نے تشویش انگیز لہجے میں کہا۔ "کیا یہ سامنے وائٹ چیپل ہے؟" اس نے دور بارش کی وجہ سے سڑک پر رکے ہوئے ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے جسم پر کوٹ نہیں تھا۔ اس نے اپنی پھٹی پرانی بے رنگ سی ٹوپی کو گدی پر سرکا رکھا تھا۔ اس کے بُوٹ پالش کی طرح کالے کالے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر لٹک رہی تھی اور اس پر بارش کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ اپنے جوتوں کو پچکا پچکا کر ان میں سے پانی نکال رہا تھا۔ اور اپنی بیمار آنکھوں سے میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دو فٹ گہرے پانی میں ڈوبتا ہوا آدمی مدد کے لئے پکار رہا ہو، اور اس کے ساتھ ہی حیران ہو کر یہ بھی سوچتا ہو کہ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟

"یہ تو پنکراس کا گرجا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اُف توبہ!" اس نے اپنے جبڑے کو یوں تھام لیا جیسے دانتوں میں شدید درد ہو رہا ہو۔ "میرا تو بُرا حال ہے۔" اور یہ کہتے ہی وہ سڑک کی بتیوں کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"دیکھو۔ ذرا ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "تم وائٹ چیپل میں کس جگہ جانا چاہتے ہو؟ تم آ کہاں سے رہے ہو؟"

"سترے کی بندرگاہ سے۔" اُس نے جواب دیا "میں نے تو سنا تھا کہ وائٹ چیپل سترے کی بندرگاہ سے کہیں قریب ہی ہے۔ لیکن شاید کسی نے دھوکا دیا۔ میں تو صبح دس بجے سے اس سڑک پر مارا مارا پھر رہا ہوں"

"ایکشن!" اس نے گزرتی ہوئی ایک بس کا ایک بورڈ اونچی آواز سے پڑھا۔ جیسے اُسے دن بھر کے مصائب یاد آرہے ہیں۔ "میں وہاں بھی ہو آیا ہوں!" اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ بس نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اُس کا تردّد آلود منہ ڈھلک کر کھل گیا۔ وہ بری طرح بھیگ رہا تھا۔ اُس کے کپڑے شرابور ہو کر سنسنیا رہے تھے۔ اُن سے نمی کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ چربی دار موٹا تازہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب اُس کی چربی ہوا نکلتے ہوئے ٹھکنے کی طرح ناہموار سی ہوگئی تھی۔ اُسے میری باتوں سے قدرے سکون محسوس ہو رہا تھا۔

ہاں وہ ایک جہازی تھا۔ بھولا بھٹکا، بُری طرح بھولا بھٹکا۔ قابلِ رحم حد تک بھولا بھٹکا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس روز رستہ بھولنے کی وجہ سے اس نے کم و بیش بیس میل کا چکر لگایا ہوگا۔ اور اتنی دیر تک بھٹکتے رہنے سے تو ایک اچھا بھلا آدمی بھی پاگل ہو جاتا ہے۔

"دیکھو تم بھیگ رہے ہو" میں نے کہا۔ "آؤ کچھ پی لو"۔

شراب خانہ نزدیک ہی تھا۔ لیکن اس نے فوراً نگاہیں پھیر لیں۔

"میں تو شراب کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا"۔ اس نے کہا "یہ بری ترغیب ہے"۔ میرا خیال ہے کہ اسی ایک فقرے نے مجھے یقین دلا دیا کہ جہازی بالکل میری طرح ہے میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں انتہا درجے کا محتاط اور پارسا ہوں۔ اس لئے جہازی کے غلیظ انگیز، مسرت افزا، درد آفریں، ہیجان خیز اور جانے پہچانے ہوئے الفاظ فوراً میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔ میں اسے نشے میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ہم بہت جلد قہوہ خانے میں پہنچ گئے۔ اور تلخ ہندستانی چائے کے گھونٹ بھرنے لگے۔

"ابھی ابھی جہاز سے اُترے ہو!" میں نے سوال کیا۔

اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں جادوگر ہوں۔ جو اس کی روح کے اندر جھانک

سکتا ہے۔

—" خدا کا شکر ہے میں نے تم کو آوازدے کر روک لیا " اس نے کہا: " میں تو سارا دن لوگوں کو آوازیں دے دے کر روکتا رہا۔ لیکن انہوں نے میری پریشانی میں اضافہ کیا۔ تم بڑے اچھے نکلے "۔ اور یہ کہتے وقت اس نے اپنے کاغذات نکال کر مجھے دکھائے۔ ان میں اس کی برطرفی کا حکم نامہ بھی تھا، پنشن کا فارم بھی تھا۔ اور چند سرکاری خطوط بھی تھے۔ فائل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کا نام البرٹ ایڈورڈ ٹامسن تھا۔ وہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوا، اور کھانا پکانے کا کام کرتا رہا۔ دو سال ہوئے طویل بیماری کی وجہ سے اسے جواب دے دیا گیا تھا۔ تو گویا وہ ابھی ابھی جہاز سے نہیں اترا تھا —!!

جب میں نے اس کی بیماری کا حال پوچھا تو وہ مشتبہ آواز میں کہنے لگا " اب تو میرے زخم اچھے ہو چکے ہیں۔ لیکن چودہ برس تک میں ناسور میں مبتلا رہا۔ میرا جسم پک کر پھوڑا ہو گیا تھا۔"

اب وہ بیکار تھا۔ اس لئے ہر وقت متفکر رہتا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ سردیوں کا موسم آپہنچا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سڑکوں پر مزدوری کی تھی۔ سرکس میں کام کیا تھا۔ اور وہ ایک اطالوی ہوٹل میں خدمت گار بھی رہا تھا۔ لیکن اسے سب سے زیادہ تشویش وائٹ چیپل کی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ دو سال سے برابر مارا مارا پھر رہا ہے۔ اور ایک کام چھوڑ کر دوسرا محض اس لئے اختیار کرتا ہے۔ کہ شاید اسے وائٹ چیپل کا پتہ مل جائے۔

" اب کیا ارادہ ہے؟ " میں نے پوچھا۔

" کچھ نہیں کہہ سکتا " اس نے جواب دیا۔

" زمانہ بڑا نازک ہے " میں نے کہا۔

" میں اپنے لئے رستہ نکال لونگا، جس طرح آپ کے ساتھ نکال لیا ہے "۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل میز پر بیٹھے رہے۔ وہ قہوہ خانے میں لوگوں کو اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ ان کی موجودگی میں پریشان نظر آرہا تھا۔ اور وہ بھی اسے دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کے چہرے کا جائزہ لیا تو یوں

محسوس ہوا جیسے اس چھینا جھپٹی کے زمانے میں ہمارے سوا کوئی انسان بھی قابلِ اعتبار اور شریف نہیں ہے۔ دو گھنٹے کے اندر اندر میں نے اُسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ اب میں اُس کا ساتھی نہیں تھا۔ بلکہ "جناب" بن چکا تھا۔ "ساتھی" کے لفظ سے مزاج اور بدنظمی کا اظہار ہوتا تھا۔ کیوں کہ "ساتھی" تو ہر وہ خونخوار اور دھوکے باز بھی ہو سکتا ہے جس سے اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ لیکن "جناب" کے لفظ سے (کم سے کم ٹامسن کے نزدیک جو بحری تربیت گاہ کا فارغ التحصیل تھا) ملائکہ کی حکومت ظاہر ہوتی تھی، اور اس میں سکون تھا، راحت تھی، اور گویا تنخواہ کا دن تھا۔

میں اُن دنوں گاؤں میں اکیلا رہتا تھا۔ میری خبر گیری کرنے والا بھی کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے البرٹ ٹامسن کو کچھ روپیہ دیا۔ اور اسے اپنے ہمراہ وائٹ چیپل لے گیا وہاں میں نے اُسے گاؤں کا تفصیل سے پتہ دیا۔ تاکہ وہ میرے بعد آرام سے پہنچ جائے۔

میں ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ جو پہاڑی کی پیشانی پر واقع تھا۔ وہاں زمین کی سطح بہت بلند اور پتھریلی تھی۔ سڑکیں وہاں آکر تنگ ڈنڈیاں بن جاتی تھیں اور یہ ڈنڈیاں جنگلوں میں جاکر گم ہو جاتی تھیں۔ جھونپڑے بھی تعداد میں بہت تھوڑے تھے۔ شاہ بلوط کے جنگل عُریاں اور گھنیائے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے بوڑھے آدمی کھڑے ہیں۔ اُن کے سائے میں لارش کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ جن میں گلہری کی طرح باقاعدہ تیتر برسات کے ایام میں سہ پہر کے کھلونوں کی مانند پھدکتے پھرتے تھے۔ رات کو کھیتوں کا رکھوالا کتا پستول کی طرح اچانک چھوٹ کر بھونک پڑتا تھا۔ یا درختوں کے پتے سمندری لہروں کی طرح سرسراتے رہتے تھے۔ اور بعض اوقات ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی بھی سنائی دے جاتی تھی۔ لیکن اس کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"خدایا" ٹامسن وہاں پہنچ کر چلا اٹھا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ یہاں کبھی نہ پہنچ سکوں گا" اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے ٹوپی گدی پر اوڑھ رکھی تھی، ہوا اس کے چہرے کی ہوائیاں اُڑا رہی تھیں۔ وہ پہاڑیوں پر یوں کودتا آیا جیسے میخوں پر چل رہا ہے۔ وہ پھر

رستہ بھول گیا تھا۔ وہ غلط گاڑی پر سوار ہو گیا۔ اور لائن بھی غلط تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے شہروں میں ہوتا ہے جدھر لوگ جا رہے ہوں، اُدھر ہی پڑنا چاہئے۔ حالاں کہ گاؤں کے لوگ بہت جلد بکھر جاتے ہیں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ لوگوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ہے۔ اور کوسوں تک دُور دُور کے جھونپڑوں میں میرا بنگلہ تلاش کرتا رہا ہے۔

"پھر میں شاملات میں آ پہنچا۔" اس نے کہا۔ "مجھے یہ زمین پسند نہ تھی۔ میں اس کے کنارے کنارے چلتا رہا۔"

میں نے اُسے آرام کرنے کو کہا۔ اور اُسے گھر لے آیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی رام کہانی نئے سرے سے سناتا رہا۔ پھر اُس نے جرابیں اور بُوٹ اتارے۔ اور اپنے پاؤں کے آبلوں کو دیکھ کر یُوں بڑبڑانے لگا۔ جیسے وہ آبلے نہیں۔ دو یتیم ہیں۔ اس نے یہ بھی سنایا کہ گاڑی میں ایک عورت تھی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا۔ "میں نے بچے کو بہلانے کے لئے اپنا بڑا چاقو نکال لیا۔ عورت نے فوراً ڈر کے مارے پولیس بُلالی۔"

کھانا کھانے کے بعد جب ٹامسن آرام کرنے لگا۔ تو میں سہ پہر کی سیر کے لئے باہر نکلا۔ مجھے دیہاتی زندگی میں صرف اس کی یکسانی پسند ہے۔ اسے دیکھ کر انسان کی سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی کس طرح ایک عادت سی بن گئی ہے۔ اور لوگ کس طرح ایک طویل جنگ کی طرح، اس کے عادی بن چکے ہیں! جب میں باہر نکلا۔ تو بوندا باندی تھم چکی تھی۔ سہ پہر کا موسم قدرے گرم اور خوش گوار تھا گھاس پر جانوروں کے بول و براز کی چراند چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑی سے اُترتے وقت میں اپنے قریب ترین ہمسائے کے بنگلے سے گزرا۔ اس کی موٹر کی خشک "ٹانگ کے بکین نیفے کی طرح اُبھری ہوئی سرخ چوٹی مجھے اپنے باغ کی بلندیوں سے نظر آیا کرتی تھی۔ بنگلے کو تعمیر ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اُسے ایک پُرزے فروش نے بنوایا تھا۔ اور اب اس کی لکڑی سکڑ سکڑ کر چیخ رہی تھی۔ باغ میں بے پناہ گھاس اُگی ہوئی تھی۔ دو تین لارش کے پودے جن پر خرگوش منہ مارتے رہتے تھے، بے جان گھاس کی سطح سے اُبھرے ہوئے تھے۔ اور قریب ہی گلاب کے پھولوں کا ایک پودہ بھی تھا۔ جس میں ایک کرم خوردہ منجمد پھول لگا ہوا تھا۔ بنگلے کی تاریخ چور دروازے کے پاس ٹین کے ایک غسل خانے کو دیکھ کر معلوم ہو سکتی تھی۔ یہ غسل خانہ جن، بیر، اور وہسکی کی بوتلوں سے

آ نا پڑا تھا۔ جو ہفتہ وار جلسوں کے موقع پر مزارعین خالی کر کے پھینک دیتے تھے۔ لوگ یہ جگہ مستقل کہہ کر حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس کا مالک مہینے دو مہینے کے بعد بدل جاتا تھا۔ آج کل اس میں ایک عورت رہتی تھی، جس کو میں نے شاذ ہی دیکھا تھا۔ وہ کسی کرنیل کی بیٹی تھی۔ لیکن بیان کیا جاتا تھا کہ بنگلے کے مالکانہ حقوق آج کل نارتھمپٹن کے کسی نوٹ فروش کے پاس ہیں۔

جب میں بنگلے کے قریب سے گزرا تو گراموفون کی آواز آ رہی تھی۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا کرنیل کی بیٹی یا تو گراموفون بجا رہی ہوتی، یا باغ میں کھدائی کر رہی ہوتی۔ اُس کی عمر پچیس تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ سر کافی بڑا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی عورت ہے۔ اُس کے شانوں پر بھوری بھوری زلفیں لہرا رہی ہوتیں۔ اُس نے ہاتھ میں اپنے قد کے برابر ہی ایک بیلچہ تھام رکھا ہوتا۔ اُس کی "باغبانی" زیادہ وقت نہ لیتی تھی۔ وہ عام طور پر ٹین کے ٹکڑے دبانے کے لئے ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا کرتی تھی۔ لیکن وہ اپنے کام میں اس درجہ کھو جاتی کہ اُسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ اُس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گرتے، اور اس کی پیشانی پسینہ میں ڈوب جاتی تھی۔ وہ اپنے منہ میں ہر وقت سگریٹ دبائے رہتی۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ اس زور اور تسلسل کے ساتھ کھانستی کہ اس کی گہری نیلی آنکھوں والے گلابی چہرے کی رنگت بدل کر لال بھبوکا ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ اپنی کمر سیدھی کرتی، اس کے چہرے کی رنگت عود کر آتی، اور وہ پکار اٹھتی "اُف توبہ! کیا مصیبت ہے!" اور ہر لفظ کے بعد اُس کی ہلال نما دا ہنی بھوں قدرے اوپر کو اٹھتی اور آنکھ کے پپوٹے میں پھڑپھڑاہٹ سی پیدا ہو جاتی کرنیل کی بیٹی کے پپوٹوں کی یہ پھڑپھڑاہٹ ـــــ اس کی آنکھ کی یہ واضح جھپک ـــــ دیکھنے والے کو فوراً نظر آ سکتی تھی۔ اور وہ سوچنے لگتا، کہ آخر اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ پھڑپھڑاہٹ پانی سے ابھرتی ہوئی مچھلی کی طرح دلکش اور چونکا دینے والی ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی کھوج لگاتا تو اسے معلوم ہوتا کہ کرنیل کی بیٹی بظاہر بچے کی طرح معصوم نظر آتی تھی۔ لیکن دراصل وہ پرلے درجے کی چھٹی ہوئی اور بلانوش تھی۔ بوڑھے بوڑھے آدمی شراب خانے میں لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے اٹھتے، ان کے چہرے غصہ کے مارے لال ہو جاتے اور وہ کہتے کاش کوئی کرنیل کی بیٹی کا پاجامہ اتار پھینکے اور مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دے۔ میں چوں کہ کرنیل کی بیٹی کا ہمسایہ تھا۔ اس لیے

مجھے بھی اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔

لیکن میں کرنیل کی بیٹی کا واقف نہیں تھا۔ کھیتوں کے اس پار کھڑی ہو کر وہ رو
جاتی، گالیاں بکتی، آنکھیں جھپکاتی اور اپنی دُبلی پتلی ٹانگوں کے سہارے غائب ہو جاتی تھی۔ اس
کی ٹانگیں کچھ ایسی اچھی نہ تھیں۔ لیکن اتفاق سے اگر سڑک پر ہماری ملاقات ہو جاتی تو وہ گھبرا جاتی
اُس کے اعصاب جواب دے جاتے۔ اور دراصل یہ بھی اُس کا ایک داؤ تھا۔

"ابھی تنہا ہو؟" وہ پوچھتی۔

"ہاں۔ اور تم؟"

"میں بھی۔ لیکن تم جنسی مسئلہ کو کس طرح حل کرتے ہو؟"

"میرا کوئی جنسی مسئلہ نہیں ہے"

"ہائے توبہ۔ کاش ہماری ملاقات آج سے پہلے ہو چکی ہوتی!"

جب میرے دوست آتے تو وہ بھی میرے مکان کے اندر آجاتی، کیوں کہ اُس کا بیان
تھا کہ جب تم اکیلے ہوتے ہو تو میری ہمت نہیں پڑتی۔ وہ میرے دوستوں کے سامنے کہتی، کہ میں
شام کو چھ بجے ہی کواڑ بند کر کے قفل لگا دیتی ہوں۔ اس کے بعد پوٹوں کی وہی پھڑ پھڑاہٹ۔
میرے دوست ہنس پڑتے تھے۔ وہ کہتی کہ میں زنا بالجبر کی قائل نہیں ہوں۔ میرے دوستوں کی
بیویاں یہ سنتے ہی سکتے میں آجاتی تھیں، جیسے اُن پر بجلی گر پڑی ہو۔ اور بعض اپنے شوہروں کے
کے بازوؤں کو مضبوطی سے تھام لیتی تھیں۔ اگر اتفاق سے وہ ایسے وقت میں آجاتی جب میں اکیلا
ہوتا، تو دروازے میں قدِ آدم کھڑے ہو کر مجھے دور ہی سے مجرمانہ نگاہوں سے گھورتی رہتی تھی۔

جب میں سیر سے واپس آیا تو گراموفون بند ہو چکا تھا۔ کرنیل کی بیٹی اپنے بنگلے کے
دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے آستین چڑھا رکھی تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں فرش دھونے والا
برش تھا۔ اور قریب ہی پانی کی ایک بالٹی پڑی تھی۔

"ہلو" اس نے بے ہودہ سے انداز میں کہا۔

"ہلو" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب بحری فوج تمہارے پاس اُتری ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایسے ہو"

"میرا خیال تھا کہ تم خود ہی قیاس کر لوگی"۔ میں نے جواب دیا۔

"آج میں نے تمہارے جہازی کو شالات میں آنسو بہاتے دیکھا۔ تم نے اس کا دل توڑ دیا ہے"۔ اچانک اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔

"اُف توبہ!" اس نے کہا۔ "ہر روز کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے"۔ جب میں اپنے بنگلے کے دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اگر ٹامسن کچھ اور نہیں کر سکتا، تو کم سے کم دھواں ضرور پیدا کر سکتا ہے، باورچی خانے کی چھوٹی سی چمنی میں سے دھوئیں کے سرمئی بادل نکل رہے تھے۔ میں قریب جا کر کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹامسن نہ صرف آستینیں چڑھائے بلکہ پاجامہ بھی اُڑسے بیٹھا ہے، اور چولھے میں بیلچے کے ذریعہ سے کوئلے ڈال رہا ہے۔ آگ کا چہرے ناچ ناچ کر پیلا ہو رہا تھا۔ بوائلر میں پانی دھڑک دھڑک کر سسکیاں لے رہا تھا۔ اور مکان کے تمام نل جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔

"کوئلہ ڈال رہا ہوں"، ٹامسن نے مجھے دیکھ کر کہا۔

میں اپنی بیٹھک میں چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے غلطی سے کسی اور مکان میں گھس آیا ہوں۔ فرش کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا تھا۔ اور عرشۂ جہاز کی طرح اُس پر نیا رنگ پھیر دیا گیا تھا، اور وہ اتنا چمک رہا تھا، کہ اُس میں آگ کے شعلوں کا عکس ناچتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکیاں بھی چمک اٹھی تھیں۔ اور دھات کو پالش کرنے کے باعث سارا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ دروازے کا دستہ، چابی ڈالنے کا سوراخ۔ انگیٹھی کی سلاخیں، اور کھڑکی کی چٹخنی، غرض ہر شئی دمک رہی تھی، اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ میرے کمرے میں دھات کی بنی ہوئی چیزیں بھی موجود ہیں۔ کمرے میں ہر طرف زندگی دوڑ رہی تھی!

"شام کا کھانا آپ کس وقت کھائیں گے؟" ٹامسن نے ایک طرف سے نمودار ہو کر دریافت کیا۔ اُس نے موزے پہن رکھے تھے۔ جب میں نے وقت بتایا تو اس کی پلکوں کے کمزور سایوں میں اس کی موٹی موٹی گول آنکھیں چونک اُٹھیں۔ اور وہ پُرجوش نظر آنے لگا۔

اس کے بعد میری زندگی میں انقلاب آگیا۔ ٹامسن سے پہلے ہر چیز بے ترتیب اور بکھری ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے کا سامان دیکھ کر اکتا جاتا تھا۔ لیکن اُس نے میرے کاغذات

اور کپڑوں کو سنبھال کر اپنی اپنی جگہ رکھا۔ اس نے میری زندگی میں بحری فوج والی باقاعدگی
اور سرگرمی پیدا کی۔ وہ اپنے پاؤں میں ہمیشہ جرابیں پہنے رہتا تھا۔ شاید اسے ان "یتیموں" پ
رحم آگیا تھا اور وہ ان سے اپنے گزشتہ سلوک پر نادم تھا ـــــ! وہ کالر نہیں پہنتا تھا
اور کھانا اس تیزی سے کھلاتا تھا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سارے مکان میں زلزلہ اور بھونچال
برپا کر دینا چاہتا ہے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ طشتریوں پر اس کے انگوٹھوں کے نشان
جاتے تھے۔ لیکن وہ باقاعدہ ضرور تھا۔ اس نے "نظام" اور "ترتیب" کو اپنا نصب العین بنا لیا
تھا۔ "سب کچھ تیار ہے جنابِ عالی" وہ ادھر طشتریوں کو میز پر جماتے ہوئے اور ادھر کلاک
کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہتا۔ شاید وہ اندر ہی اندر گھل رہا تھا، جل رہا تھا، لیکن اوقات
کا پابند ضرور تھا۔

مسرت کا راز یہ ہے کہ ساز گار یکسانی تلاش کی جائے۔ میری خانگی زندگی محض اس لئے
اُواس تھی کہ میں تخیل پرست تھا۔ ٹامسن نے اس اکتا دینے والی تخیل پرستی کا خاتمہ کر دیا ـــــ!

"دوپہر کے کھانے کے متعلق کیا حکم ہے سرکار"

"تکے بھون لوں؟" اس نے پوچھا۔ اور آخر یہی قرار پا گیا، لیکن تھوڑی دیر
کے بعد وہ پھر واپس آیا

"پڈنگ کیا ہو؟" اور اس سوال نے دونوں کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ یا کم از
کم میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ٹامسن نے اپنا مشورہ دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔

"چتکبری مرغی پکالوں؟" اور وہ پکالی گئی۔ یہ چیزیں ہم نے تین دن کھائیں۔
اور چوتھے روز کھانے کے پروگرام میں ردّو بدل کر دیا گیا۔ لیکن پانچویں روز ہم پھر وہی کھانے
لگے۔ آخر ٹامسن کے دماغ نے ایک نئی جھانک لگائی۔

"قیمہ، تکے اور مرغی پکالوں؟" اس نے پوچھا۔ اور اس کے بعد یہ چیزیں ہمارے
دسترخوان کا مستقل جزو بن گئیں۔ ایک آدھ دفعہ جلاٹین اور دودھ کی سفید ٹب (جیلی)
اُڑائی گئی۔ لیکن چتکبری مرغی پھر آموجود ہوئی ـــــ!

"میں ہمیشہ اپنے لئے رستہ بنا لیتا ہوں۔ جس طرح آپ کے ساتھ تل کر بنا لیا ہے" یہ

اس کا ٹیپ کا مصرع تھا۔

سردیاں ٹونٹی کی طرح آہستہ آہستہ بہتی رہیں۔ کہر اور دھند نے شاید ہی کبھی ہماری پہاڑیوں کا پیچھا چھوڑا ہو۔ انگلستان میں سردیوں کا موسم تلی ہوئی مچھلی کی دکان کے نمائشی دریچے کی طرح بے کیف اور بے رنگ ہوتا ہے۔ لیکن ہم بھٹی جھونک رہے تھے۔ چولہے میں کوئلہ ڈال رہے تھے۔ اور ہمارا بیلچہ منوں کے حساب سے کام کرتا تھا۔ ہماری گفت گو پہلے سے زیادہ چٹ پٹی ہو گئی تھی۔ ہم چیزوں کو ادھر ادھر نہیں پھینک دیتے تھے، بلکہ ان کو قرینے سے سجا کر رکھتے تھے۔ سامان کو آراستہ کرنے کے لئے رسیوں کو عجیب و غریب گانٹھیں دی گئیں۔ مُرجھے ہوئے باغ میں نئے پودے اُگائے گئے۔ ڈوریوں پر دھوئے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لئے ڈالے گئے۔ فرش کو چپی سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا۔ باورچی خانے کو دُور کے پرانے بادبانی جہازوں کی طرح آراستہ کیا گیا۔ اب ڈاکیہ باقاعدہ آتا تھا۔ کھانے خوب گرما گرم پکائے جاتے تھے، اور شام کو گانا بھی ہوتا تھا۔

میں خوش تھا لیکن ٹامسن بھی خوش تھا؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا۔ صبح کو ہم دونوں مصروف رہتے۔ لیکن شام کو کوئی ایسا ضروری کام نہ ہوتا۔ صبح کو وہ چولھے کے پاس چارپائی کے سرے سے گھٹنے جوڑے ایک چھوٹی سی تپائی پر بیٹھ جاتا، اور اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتا رہتا۔ (اس کے ذاتی بکھیڑے عجیب و غریب تھے۔ اور وہ اپنے محدود دائرے میں کافی غلیظ رہتا تھا) شام کو بھی وہ اسی کام میں مشغول رہتا لیکن بعض اوقات مجھ سے باتیں بھی کرنے لگتا۔ اس نے مجھے اپنی زندگی کی ساری داستان سنائی، اسے بالعموم ایسے آدمی یاد آتے رہتے جن کا طرزِ عمل اس کے بقول "پسندیدہ" نہ تھا۔ ٹامسن کا اخلاقی جنون یاس انگیز صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسے ہر وقت یہی دُھن سوار رہتی تھی۔ وہ انسانی فطرت سے بڑی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ دیر تک باتیں نہ کرتا تھا۔ "تم جس وقت چاہو باہر سیر کے لئے جا سکتے ہو" میں نے اس سے ایک روز کہا۔ "تم جو چاہو کرو!"

"نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے" اس نے جواب دیا۔

"بے شک باہر جا کر لوگوں سے ملو جلو"

"خدا جانے" اُس نے جواب دیا۔

ہر شخص اپنے کام کو بہتر سمجھتا ہے۔ لیکن ایک روز رات کے وقت مجھے باورچی خانے سے باتیں کرنے کی آواز آئی، تو میری دلچسپی بڑھ گئی۔ شاید کوئی ٹامسن سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد یہ آوازیں اکثر سنائی دینے لگیں۔ وہ کون تھا؟ ممکن ہے گوالا ہو، یا گائیوں کا چوکیدار ہو، جو رات کو لالٹین کی روشنی میں نابدان (بدرو) صاف کرتا تھا۔ اور جس کو جنگ کے زمانے میں مُردوں کے دفنانے کی باتیں کرنے کی بیماری تھی۔ "اگر جنگ نہ ہوتی" یہ آدمی کہا کرتا "تو میں کچھ بھی نہ دیکھ سکتا۔ جنگ نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے"

میں نے کان لگا کر سنا تو سوال و جواب کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ لکڑ ہارا! ڈاکیہ؟ آخر یہ مسلسل باتیں کرنے والا، ٹامسن کا لنگوٹیا، کون ہوسکتا ہے؟ یہ معمّہ حل کرنے کے لئے میں باورچی خانے میں گیا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف ٹامسن چولہے کے پاس بیٹھا تھا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرے کی گھٹی گھٹی فضا میں ایک زرد رنگ کا ہونق سا نظر آرہا تھا۔ جس نے بالوں میں تیل لگا رکھا تھا۔ وہ "وائلڈ ویسٹ میگزین" میں سے ایک کہانی کے الفاظ ہجے کرکے پڑھ رہا تھا۔ میگزین پھٹا پرانا تھا۔ اور اس کی کالک لگی انگلیاں ایک لفظ سے دوسرے لفظ تک حرکت کر رہی تھیں۔

ٹامسن گھر سے باہر کبھی نہ نکلا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کوئلے کے گودام تک جاتا تھا۔ لیکن تازہ انکشاف کے بعد میں نے تہیّہ کر لیا کہ اُسے ضرور باہر بھیجوں گا۔ تاہم میں نے تنخواہ کے دن تک انتظار کیا ——!

"یہ لو اپنا روپیہ" میں نے کہا۔ "آج سہ پہر کو تمھیں چھٹی ہے"

"آپ اسے رکھیئے" اس نے جیسے خوف زدہ ہو کر کہا "آپ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس ہی رہنے دیجئے"

"تمھیں ضرورت پڑے گی" میں نے کہا "ممکن ہے شراب کا پیالہ، یا سگریٹ یا کچھ اور لینا پڑ جائے"

"نہیں۔ مجھ سے خرچ ہو جائے گا" اُس نے کہا "وہ اسے چھین لیں گے"

"کون ؟"

"لوگ" تامسن نے جواب دیا۔ مَیں اسے مجبور نہ کر سکا۔

"اچھا۔ میں اسے امانت کے طور پر رکھ لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ "اگر مجھے کوئی ضرورت پیش آئی تو مانگ لوں گا۔"

"روپیہ بھی ایک نشہ ہے !"

"خیر ! بہرحال" میں نے کہا "سہ پہر کو چھٹی کرو۔ آج پہلی دفعہ سہ پہر کے وقت دھوپ نکلی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم تفریح کے لئے کہاں جاؤ۔ گلی میں جا کر وائیں طرف گھوم جانا۔ اور ......"

"مجھے گلیاں پسند نہیں ہیں" تامسن نے کھڑکی سے مشکوک انداز میں جھانکتے ہوئے کہا "میں آپکے پاس ہی ٹھہروں گا"

"نہیں بھائی کم سے کم دو گھنٹے تفریح ضرور کرو" میں نے کہا "تازہ ہوا سب کو کھانی چاہیئے"

اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اُسے زہر کھانے کو کہا ہے اور جیسے میں زہر ہی پھیلا رہا تھا

"اچھا۔ اگر ایک گھنٹہ تفریح کر لوں تو کیا صحیح ہے؟" اس نے سودا کرنا چاہا

"نہیں۔ شام کا سارا وقت باہر گزارو"

"آدھ گھنٹہ رہنے دیجئے" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر۔ میں تمہیں مجبور کرنا نہیں چاہتا" مَیں نے جواب دیا "یہاں لنڈن میں آزادی ہے تم ایک گھنٹہ سیر کرلو"

گویا نیلام ہو رہا تھا — !

"ٹھیک ٹھیک بتاؤں" اس نے فریب کارانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا "میں

آپ کی خاطر بیس منٹ سیر کر لوں گا۔" اس کا خیال تھا کہ وہ مجھے چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے باورچی خانے میں جاکر اُسے زبردستی باہر نکال دیا۔ میں نے اسے اوورکوٹ اور بوٹ دے دئے تھے۔ اور غالباً انہی چیزوں سے خوش ہو کر اس نے ہتھیار ڈال دئے۔ وہ "بیس منٹ" کے لئے باہر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گلی میں سیدھا جاکر بڑی سڑک پر پہنچے گا اور وہاں سے الٹے پاؤں واپس آجائے گا۔ اگر کوئی چست آدمی ہوتا تو سردیوں میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ بارہ منٹ میں طے ہو سکتا تھا۔

جب ایک گھنٹہ گزر گیا تو میں دل ہی دل میں نہایت خوش ہوا۔ لیکن جب چار گھنٹے گزر گئے اور اندھیرا چھا گیا تو میری حیرت بڑھنے لگی۔ میں باہر نکل کر بنگلے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ تاریکی اور زمین ہم رنگ ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک راہ دیکھنے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا، تو اونچی اونچی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اور میں نے دو رکھیتوں میں ایک لالٹین کو جھولتے ہوئے دیکھا۔ ٹامسن ایک مزدور کے ساتھ آرہا تھا۔ مزدور کا نام فلیس تھا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا مختصر سا آدمی تھا۔ اور جھکی ہوئی جھاڑی کی طرح کھڑا تھا اس نے کندھوں پر ایک مٹی سے لتھڑی ہوئی بوری اٹھا رکھی تھی۔ وہ اندھیرے میں ٹموں ٹموں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے علاقے کے اخلاق کے مطابق مجھے دیکھ کر دانت نکوس لئے۔

" وہ رستہ بھول گیا تھا۔" اس نے ٹامسن کو میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یا الٰہی توبہ" ٹامسن پکارا تھا۔ وہ تھک کر چُور ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور اس پر درد و کرب کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا جسم زخم خوردہ گھوڑے کی طرح پسینے سے شرابور تھا۔ اور اس کے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ اسے رستہ بھول گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو صحیح راہ پر نہ ڈال سکا۔ اسے ہر چیز یکساں نظر آئی تھی۔ وہ سڑک گلی، جنگل اور میدان میں امتیاز نہ کر سکا۔

" جنگل میں نے دیکھا ہے" اور یہ کہتے وقت اس پر دہشت سوار تھی۔

" لیکن وہ شاملات — ! اُس نے مجھے دھوکہ دیا"

" لیکن تم شاملات کے تو نزدیک بھی نہیں گئے" میں نے کہا۔

"تو پھر وہ کیا تھا؟" وہ بولا۔ اس رات وہ اپنے سر کو ہاتھوں میں دبائے آگ کے پاس بیٹھا رہا۔

"مجھ کو دورہ پڑ گیا ہے!" وہ بولا۔

دوسرے دن صبح کو میں نے اپنی کھڑکی کے باہر سگرٹ کا دھواں اڑتے دیکھا۔ اور مجھے کھانسنے کی آواز بھی آئی۔ کرنیل کی بیٹی باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی ٹامسن سے باتیں کر رہی تھی۔

"اچھا رخصت!" میں نے اسے کہتے ہوئے سنا

اس کے بعد وہ میرے دروازے پر آئی۔ اس نے دروازے کو دھکیل کر کھولا اور میرے سامنے سنجیدہ صورت بنائے کھڑی ہو گئی۔ اس کے پپوٹے حسب معمول پھڑپھڑانے لگے۔ اس نے زرد رنگ کی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اور وہ پرندے کی طرح صاف ستھری نظر آتی تھی۔

"تم سوئر ہو" اس نے کہا۔

"کیوں۔ میں نے کیا کیا؟"

"تم شالامات میں عورتوں کی عصمت دری کرتے ہو" اس نے کہا: "تم پرانے دوستوں کو بھلا بیٹھے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"شالامات میں تو بڑی ٹھنڈ ہے" میں نے جواب دیا۔

"مجھے نہیں لگتی" اس نے کہا۔ "میں ہمیشہ پُرامید رہتی ہوں۔ کل رات کو میں اتفاقاً وہاں سے گزر رہی تھی کہ میں نے ناظم کی بیوی کو چیخیں مارتے ہوئے دیکھا۔ میں جا کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی، اور اسے تسلی دی۔ اس نے بتایا کہ ایک مرد میرا پیچھا کرتا رہا ہے۔ "چلاؤ نہیں" میں نے اس سے کہا "یونہی تمہارا وہم ہے"۔ اندھیرا بہت ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سودے کی تھیلی اور چھتری اٹھائی اور اسے گھر پہنچا دیا۔ میں اکثر شام کے وقت اس سے ملنے جاتی ہوں۔ آخر کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ رات دن تنہا کب تک بیٹھی رہوں۔ ہم دونوں بیٹھ کر گپ شپ اڑاتی رہتی ہیں۔ عام طور پر اس کے بیٹے کی جو آج کل چین میں ہے باتیں ہوتی ہیں۔ جب تم بڈھے ہو جاؤ گے تو اسی طرح تنہائی محسوس کرو گے"

ختم

"شاملات میں کیا ہوا ؟"

"میرا خیال ہے میں نے بہت پی لی ہے" کرنیل کی بیٹی نے کہا "لیکن شاید میں صبح سے نشہ میں ہوں، تو ہاں میں کیا کہہ رہی تھی! میری یادداشت جواب دے رہی ہے۔ تو ہاں ابھی پانچ منٹ کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ میں نے کسی کو کتّے کی طرح ہانپتے اور جھاڑیوں میں کودتے سنا۔ بجاری مسز سٹور پھر چلانے لگی۔ "چپکے کھڑی رہو" میں نے کہا۔ اور جب غور سے دیکھا تو دس گز کے فاصلے پر ایک درخت کے پیچھے ایک آدمی نکلا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اور اس کے جواب میں بھیڑ کی طرح ممیانے کی آواز آئی۔ "ام۔ ام۔ ام۔ ام"

"اچھا تو ٹامسن وہاں گیا تھا!" میں نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم تھے" کرنیل کی بیٹی نے کہا۔

"شاملات میں ایک عورت ڈنڈا لئے میرا تعاقب کرتی رہتی ہے" وہ آدمی بولا "میں نے اسے چھوا تک نہیں۔ میں صرف اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا اگر میں اس کے پیچھے پیچھے چلوں گا تو گھر پہنچ جاؤں گا" جب وہ جنگل میں پہنچے تو ٹامسن اندر داخل نہیں ہوتا تھا اور کرنیل کی بیٹی کو اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ یہ غلطی ہوی۔ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلا۔ وہ جنگل میں اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اور اس سے کہنے لگی۔ بیوقوف نہ بنو۔ لیکن وہ شاملات کی طرف دوڑ کر غائب ہو گیا۔

"تم بھی گدھے ہو" کرنیل کی بیٹی نے یہ واقعہ سنانے کے بعد مجھ سے کہا: "تمہارا علاج یہ ہے کہ تمہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے۔"

یہ کہہ کر وہ چلتی بنی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو دروازہ کھلا اور ٹامسن اندر داخل ہوا۔

"معاف کیجئے" اس نے کہا "جناب! وہ نوجوان لڑکی — وہ باورچی خانے میں آئی تھی۔" "میں جانتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

وہ منہ کھولے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی بڑبڑا اٹھا: "میں نے اُسے

چھوا تک نہیں۔ سچ سچ کہتا ہوں۔ میں نے اسے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔
"وہ کب کہتی ہے کہ تم نے اس کے ساتھ کچھ کیا۔ اس نے تو تمہاری امداد کی ہے"
وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ "جی ہاں" اس نے کہا۔
جب وہ کھانا چننے کے لئے دوبارہ کمرہ میں آیا تو میں دیکھ رہا تھا، وہ مجھ سے آنکھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔
"جناب!" آخر اس نے ادب سے کھڑے ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے۔ وہ نوجوان لڑکی ...."
اس کا منہ کبھی کھلتا کبھی بند ہوتا۔ شاید وہ فقرہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"وہ نوجوان لڑکی ـــ وہ اپنے جوڑے کی تلاش میں ہے" آخر اس نے جلدی سے کہہ دیا۔
"تو کیا صحیح ہے؟" میں نے جواب دیا۔
"بہت بری بات ہے جناب" اس نے خالص کلیسائی انداز میں کہا
اس کے بعد وہ کئی روز تک میرے بنگلے میں نہ آئی۔ اور آخر جب آئی تو میں نے باورچی خانہ کے دونوں دروازے میں قفل لگانے کی آواز سنی۔
ایک طرف باقاعدگی۔ دوسری طرف نشہ! ماہسن کی زندگی انہیں دو اچھے اور برے پہلوؤں سے عبارت تھی۔ میں نے اسے باہر جانے کے لئے پھر کبھی "رائے" نہ دی۔ میں نے احکام تیار کئے اور اسے ان کی تعمیل میں باہر جانے پر مجبور کیا۔ میں ماحسن کی بھلائی چاہتا تھا اور میرا خیال ہے کہ ہر شخص ایسے موقع پر اس کی بھلائی ہی چاہتا۔ میری دلی آرزو تھی کہ وہ آزاد اور خوش رہے۔ پہلے تو اس نے دیکھا کہ میں حکم چلانے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے وہ بہانے بنانے لگا۔ "میرے زخم اچھے نہیں ہوئے" اس نے کہا۔ پھر ایک دو دفعہ وہ ننگے پاؤں باہر گھومتا رہا اور کہنے لگا کہ میرے بوٹ کا تلا گھس کر پھٹ گیا ہے۔ لیکن جب میں نے آنکھیں نکال کر بتایا کہ میرے احکام کی تعمیل ہونی چاہئے تو وہ باہر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر متوقع کا ہیبانی نے اس کے ہوش و حواس سلب کر لئے

ہیں ۔ اس کے احساسات اُس جاگیردار سے ملتے جلتے تھے جو ایک لمبے سفر کے بعد کشتی سے اترے۔ جب آپ گہرے پانی پر بنے ہوئے پُل کو کامیابی سے عبور کر لیتے ہیں، تو آپ کو اپنا سر بوجھل سا، چکرایا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ اور آپ بڑبڑانے لگ جاتے ہیں۔ بس یہی ٹامسن کی کیفیت تھی۔

" سڑک پر آوارہ جہازوں کی طرح دو بے فکرے آرہے تھے میں ان سے بچ کر صاف نکل آیا ؛ " ٹامسن نے کہا ۔" ایک شخص مجھ سے پوچھنے لگا۔ تم کہاں کام کرتے ہو؟ میں نے جواب دیا — بس میں نے اتنا ہی جواب دیا کہ ایک شریف آدمی کے پاس — میرا اشارہ آپ کی طرف تھا ؛"

دراصل اس علاقے میں ایک شخص تھا، جس نے ٹامسن سے سگرٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی مانگی۔ اور ساتھ ہی پوچھ لیا کہ تم کام کیا کرتے ہو ؟

"میں نے اس سے کہہ دیا، کہ میں سگرٹ نہیں پیتا ؛" ٹامسن بولا " آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن آپ نہیں جانتے اس کا حشر کیا ہوتا ؟ — بظاہر تو کوئی نقصان نہیں۔ لیکن سبھی کو نشہ کہتے ہیں"

نشہ کیا ہوتا ہے ؟ ٹامسن کے نزدیک ہر چیز نشہ تھی۔ شراب خانے، سنیما، مزروعہ زمین، جوڑوں کے ڈربے۔ تمباکو کے تاجر — ان سب میں ٹامسن کو نشہ محسوس ہوتا تھا۔ اوتھیلو کے جذبۂ رقابت کی طرح، نشہ ہوا میں اڑتا پھرتا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ میں بھی اسی طرح ہوں۔ میں اپنے نفس تک محدود اور نشے سے دور رہتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میں اس سے کچھ مختلف نہیں ہوں۔

مجھے یہ دیکھ کر از حد صدمہ ہوا کہ ایک طرف میں ٹامسن کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں تو دوسری طرف ٹامسن بھی میرا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا کسی کے کردار کا تجزیہ کرے تو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنے نفس تک محدود رہتا ہوں ؟ میں نشے میں مبتلا نہیں ہوتا ؟ ٹامسن کی معلومات یہیں تک محدود تھیں۔ ادھر کرنل کی بیٹی تھی۔ میری اس سے اکثر ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ممکن ہے وہ باری باری نمائشی،

پسندیدہ، خوفناک اور لرزہ خیز ثابت ہوتی۔ لیکن وہ "مجسم نشہ" تھی۔ ٹامسن کیوں کر جان سکتا تھا کہ مجھ پر "نشہ" کا اثر نہیں ہوتا۔ اس کی رائے سن کر میرے دل کے اندر ہیجان پیدا ہوگیا۔ مجھے کرنیل کی بیٹی پہلے سے بھی زیادہ نمایاں نظر آنے لگی ــ اور آخر مجھے معلوم ہوگیا کہ ٹامسن کی عادتوں میں کتنا فریب تھا۔ اور "نشے" کے اعتبار سے اس کے قول وفعل میں کتنا تضاد تھا۔ ٹامسن اس معاملہ میں اتنا کمزور واقع ہوا تھا کہ وہ ہر نشئی کے پھندے میں پھنس جاتا تھا۔ وہ راہ جاتے لوگوں کو روک لیتا اور ان سے "نشے" کی باتیں کرتا رہتا۔ وہ ڈاکیہ سے ساری باتیں کہہ دیتا۔ حتیٰ کہ دکانداروں کو بھی میرے اور اس کے تمام معاملوں کی خبر پہنچ گئی۔ وہ وہ بےفکروں کو دوڑ کر جا لیتا، وہ سائیکل سواروں کو ٹھہرا لیتا، وہ سڑک کوٹنے والوں اور کھدائی کرنے والوں کی محفل میں جا بیٹھتا۔ اور ان کو شراب کی برائیوں پر لیکچر پلاتا رہتا۔ پھر ان کو بتاتا کہ حبشیوں کے سامنے کس طرح محتاط رہنا چاہیئے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکتا تو ان سے کہتا کہ میں اپنے نفس تک محدود رہتا ہوں، شراب نہیں پیتا۔ عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اور سینے کی جیب پر ہاتھ مار کر کہتا۔ کہ میں اپنا روپیہ یہاں محفوظ رکھتا ہوں۔ الغرض اُن کے ساتھ اس کا طرز عمل وہی ہوتا جو یوسٹن روڈ پر اس نے میرے ساتھ اختیار کیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ کرنیل کی بیٹی نے بتایا۔ وہ سارے علاقے کی خبریں آ کر مجھے سنا دیا کرتی تھی۔

"وہ بڑا اچھا آدمی ہے" کرنیل کی بیٹی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ "تم خود پسند ہو، نصیحت فروش ہو۔ اپنی طبیعت کو قابو میں رکھو۔ لیکن اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں کہ تم شریف آدمی ہو۔ لیکن تم اُن ہی لوگوں کی طرح ہو، جن کو میں اپنا دوست کہتی ہوں"

"اچھا جی،" میں نے پُرامید ہو کر کہا "نصیحت فروشی کی تم ماہر تو نہیں؟"

مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ٹامسن اتنی دیر سے گھر کیوں لوٹتا ہے۔ میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ وہ رستہ بھول جاتا ہے۔ اور کسی حد تک یہ صحیح بھی تھا۔ لیکن اس کے رستہ بھولنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ ان کے گھروں، زینوں اور صحن کے دروازوں تک جا پہنچتا تھا۔ اور رستے میں ان سے کہتا کہ انسان کو آپس میں بے تکلف نہیں ہونا چاہیئے۔ "میں تو کسی سے بولتا بھی نہیں" اس کا بیان غلط تھا۔ لیکن وہ جھوٹ

بھی نہیں بول رہا تھا۔ وہ خود فریبی میں مبتلا تھا۔

"وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں رہتا ہے" میں نے ایک صبح کرنل کی بیٹی سے کہا

میں نے ٹامسن کو حسب معمول تکّے لینے کے لئے بازار بھیج دیا اور خود کرنیل کی بیٹی کے بنگلے میں جا بیٹھا۔ میں باتیں کرتا رہا۔ اور وہ گراموفون کے ریکارڈ چھانٹتی رہی۔ جو ریکارڈ اسے پسند نہ آتا وہ اُسے زمین پر دے پٹختی

"میں مانتی ہوں کہ تم دلچسپ آدمی ہو" اس نے کہا "لیکن تم اس طرح گزارا نہیں کرسکتے۔ یا کرسکتے ہو؟ "

"تمہاری عمر کیا ہے؟" "پچیس سال؟" میں نے پوچھا۔

اُس کے چہرے سے آزردگی اور بیزاری کی کیفیت فوراً دور ہوگئی۔ وہ میرے سوال پر چونک اُٹھی۔

"توبہ۔ توبہ" اس نے پرخلوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا "پاگل نہ بنو" پھر اُس نے تیوری چڑھائی "یا چالاکی تمہارا پیشہ ہے؟"

"سنو" اُس نے کہا "میں پچیس برس کی عمر میں بے پناہ خوبصورت تھی۔ اب میری عمر ۲۹ سال ہے۔ لیکن شکل وصورت اب بھی بُری نہیں"

"میرے نزدیک تو تمہاری عمر ۲۷ برس سے زیادہ نہیں" میں نے وثوق سے کہا

وہ چل کر میرے پاس آئی۔ میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ آکر میرے نزدیک کھڑی ہوگئی۔ آج تک وہ میرے اتنے قریب نہ آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی آنکھیں گہری نیلی ہیں۔ لیکن اب میں نے دیکھا کہ ان کا رنگ سبزی مائل بھورا ہے اور ان میں شہوت کی دھندلی سی نمی ہے۔ اس کے باوجود وہ بے رونق آنکھیں تھیں۔ گھڑی کے ڈائل کی طرح، یا ابرآلود دن کو تلی کی آنکھوں کی طرح! اور اس کا بدن جو مجھے تر و تازہ نظر آیا کرتا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ اپنی اصلی حالت میں دیکھا۔ اُس پر سرخ رنگ کے مہاسے اور داغ پڑے ہوئے تھے جس طرح شرابیوں کے جسم پر بالعموم ہوتے ہیں۔ اور اس کا بدن پھولا ہوا تھا جس طرح ادھیڑ عمر میں ہوتا ہے! میں سمجھ گیا کہ وہ اسی لئے ہمیشہ دروازے میں کھڑے ہوکر مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی،

وہ تاڑ گئی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھ کا پپوٹا پھڑکنے لگا۔

"اپنے آپ پر قابو رکھو" وہ بولی "میں یہاں ستانے آئی تھی۔ لیکن تم نے یہاں کے بھی چسکے کاٹنے شروع کر دیئے"

"میں تو صرف صبح کو آتا ہوں"

وہ ہنس پڑی، اس کے بعد وہ کتابوں کی الماری تک گئی اور وہسکی کی بوتل نکال کر شیشے میں انڈیلنے لگی۔

"صبح سویرے آکر تم نے بس یہی کام کیا ہے" وہ بولی "میں خالی پیٹ ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ پینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دس دن سے ایک چھوا نہیں آج صبح کی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا۔ اس بوڑھے کا تھا"

"تمہارے باپ کا؟"

میں نے ہمیشہ کرنیل کا تصور باندھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اسے کھانسی آگئی۔ اور وہ اتنا کھانسی کہ اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"بھئی کمال ہے۔ واقعی کمال ہے۔ عورتوں کا نقاد معلوم ہوتا ہے۔ ارے بابا نہیں یہ خط میرے شوہر کا تھا۔ لیکن لعنت بھیجو۔ وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ البتہ اگر دس سال تک کسی کے ساتھ زندگی بسر کی جائے اور وہ کرایہ بھی ادا کرے تو وہ شوہر ہی ہوتا ہے۔ اسے شوہر ہی کہنا چاہئے دس سال کی مدت کافی طویل ہوتی ہے۔ اس کے خاندان کا خیال تھا کہ اب اُسے شادی کر لینی چاہئے۔ اس کی اپنی بھی یہی مرضی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک متمول امریکن لڑکی کا انتخاب کر لیا۔ اور مجھے یہاں بھیج دیا۔ تاکہ دیہات کی کھلی فضا میں میرا غم غلط ہو سکے۔ تمہارے 'جہازی' کی طرح اب میں خیرات پر گزارہ کرتی ہوں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اگر تمہاری یہی مرضی ہے۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم جو جی میں آئے کرو۔ وہ چھ مہینے کے اندر اندر اس کُتیا سے اکتا جائے گا۔ میں اسے چھوڑ کر چلی آئی۔ میں اس کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، اب وہ مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ وہ اپنی معشوقہ کو ہمراہ لے کر یہاں آنا چاہتا ہے کیوں کہ

اُس نے میری بڑی تعریف سنی ہے اور دیہاتی زندگی اسے بہت پسند ہے۔"
میں اسے کوئی بات کہہ کر مشتعل کرنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا: "ویسے وہ بڑا اچھا ہے۔ وہ گیس کے چولہوں کا بیوپار کرتا ہے۔ تم بھی اسے پسند کروگے۔ لیکن لعنت ہے اس کمبخت عورت پر۔" اس نے اپنی نرم آواز کو کرخت لہجے سے بدلتے ہوئے کہا: "اُس نے میرے شوہر کو خوشامدی اور امارت پرست بنا دیا ہے۔ میں تو اس کی داشتہ ہوں"
"تم اتنے پریشان کیوں ہو،" کرنیل کی بیٹی نے کہا۔ "میں رو تو نہیں پڑوں گی"
"دس سال تک میں کتابیں پڑھتی رہی،" وہ بولی "میں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی۔ میں نے تعلیم حاصل کی۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" کے بجائے مجھے یہ کہنا آگیا "مزاج تو اچھے ہیں،" میں نے اس کی خاطر ناک کٹا لی، اور اسے یہ بھی کہتے پھرنے کی اجازت دے دی کہ میرا باپ بھی فوج میں ہے۔ لیکن لوگ کتنے بے وقوف تھے، ان کا خیال تھا کہ اس کا باپ کرنیل بن چکا ہوگا۔ ان کی جانے بلا کہ سارجنٹ میجر کے بھی بچے ہوتے ہیں۔ میرے اُس بوڑھے نے بھی (خدا اُس کا بھلا کرے) لوگوں کی بات پر یقین کر لیا۔ میں تو اس کے نزدیک احمق سی داشتہ تھی۔"
"میں اسے نہیں جانتا،" میں نے کہا، "لیکن وہ مجھے اچھا نہیں لگتا"
"بس یہی تو تمہاری غلطی ہے،" اُس نے بے دھڑک کہہ دیا۔ "تم بزدل ہو، کمزور ہو۔ اور بس۔ تم کیا جانو کہ اگر بیوی کو گھر کی لونڈی کہا جائے۔ تو یہ کتنی شرمناک بات ہے میں نے تو خیر گزارا کر لیا، لیکن وہ نہ کر سکا"
اس نے قدرے توقف کیا۔ اس کی آنکھ کا پپوٹا پھڑ پھڑانے لگا۔
"میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، کہ یہ معاملہ اتنا تکلیف دہ ہو جائے گا"
اُس نے کہا۔
"مجھے بڑا افسوس ہے،" میں نے جواب دیا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خوشامد اور امارت پرستی کو بُرا نہیں سمجھتا۔ یہ اعلیٰ کردار کی نشانی ہے۔ اسے اختیار کرنا بُرا ہے لیکن اس سے بچنا اور بھی بُرا ہے۔ ہم اپنے زمانہ کی بیماریوں سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے ہیں؟"
"ہاں یہ تو ٹھیک ہے" اس نے جواب دیا۔

دوسروں کے مصائب پر اعتبار نہیں آتا۔ اگر وہ دکھائی نہ دیں تو ان کو جھوٹ قرار دیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ ابتدائی صورت میں ہوں تو ان کو بکواس پر محمول کیا جاتا ہے۔

میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کا بوسہ لینے کے لئے بڑھا۔

"تم بڑے جذباتی ہو" وہ بولی۔ چناں چہ میں نے بوسہ نہ لیا۔

ہمیں بنگلے کے قریب سے کسی کے گزرنے کی آواز آئی۔ کرنیل کی بیٹی نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ٹامسن دکھائی دیا۔ اس کی عرق آلود پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے، اور وہ بنگلے کی طرف ہچکچاہٹ کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ڈھیر لگا ہوا تھا ——— "بہتر یہ ہے کہ اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ تم کہاں تھے" وہ بولی۔

اس نے اپنے لبوں کو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھایا۔ لیکن میں باہر نکل آیا۔ جب میں باہر نکلا تو ہوا کے تر و تازہ جھونکوں سے مجھے فرحت ہوئی میں اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ ٹامسن اندر آیا۔ وہ بہت سی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ حسب دستور رستے سے بھٹک گیا تھا۔ وہ لوگوں سے مل کر آیا تھا۔ وہ کھیتوں کی سیر کرتا رہا تھا۔ اس نے درختوں کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے سڑکیں دیکھی تھیں لیکن میں نے شاید ہی کوئی بات سنی ہو۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ "برٹش لیجین"[1] کی باتیں کر رہا ہے ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ آج رات برٹش لیجین کا ایک اجلاس ہونے والا ہے جس میں اسے شرکت کرنی چاہئیے۔ دوسرے لوگوں کے مسائل کتنے سادہ ہوتے ہیں! تاہم میں نے ٹامسن کو کہتے سنا: "نہیں! میں برٹش لیجین میں نہیں جاؤں گا۔ یہ بھی نشہ ہوتا ہے!"

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس سے محبت کا اظہار کرنا چاہئیے تھا اور اس کا بوسہ لینا چاہئیے تھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ میں خود پسند ہوں!

"اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو" میں نے ٹامسن سے کہا "تم اجلاس میں شامل ہو کر خوش ہو گے" لیکن اس سے محبت کا اظہار کرنا اس وقت کتنا نفرت انگیز، کتنا احمقانہ اور کتنا نمائشی فعل ہوتا۔ میں سوچنے لگا۔

"میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں" ٹامسن نے کہا۔

---

[1] جنگ عظیم کے پنشن یافتہ سپاہیوں کی قومی انجمن جو ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی۔

"تم ہمیشہ میرے پاس نہیں رہ سکتے" میں نے جواب دیا "ممکن ہے کہ ایک مہینہ تک یا اس سے بھی پہلے میں یہاں سے چلا جاؤں، پھر تمہیں بھی جانا ہوگا"

"ہاں میں جانتا ہوں" اس نے کہا "آپ نے مجھے بتایا تھا۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ میں بھی صاف صاف کہوں گا۔ میں برٹش لیجین کے اجلاس میں نہیں جا رہا"

اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ اور میں ایک کتاب پڑھنے لگا۔

"ہم اپنی روحانی اور مادّی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکے ہیں" میں نے ایک فقرہ پڑھا۔

تو آج رات میں کرنیل کی بیٹی سے ضرور کہہ دوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں تہیّہ کر لیا۔ مجھے دوبارہ بے وقوف نہ بننا چاہیے۔ میں ایک گھنٹہ کے لئے باہر نکلا۔ جب واپس آیا۔ تو ٹامسن نشے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اگر میں لیجین کے اجلاس میں جاؤں۔ تو واپس کیسے آؤں گا؟ بہتر ہے کہ نہ جاؤں۔ وہ لیجین کی ظاہری قوت دیکھ رہا تھا۔ (کرنیل کی بیٹی بھی نمونہ ہے میں نے سوچا) ٹامسن چار بجے تک اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ پانچ بجے اس نے اپنی امانت کا روپیہ مجھ سے مانگا (ہم سب ہی نمونے ہیں وہ سوچ رہا تھا) لیکن بہت جلدی اس نے روپیہ واپس کر دیا اور ساتھ ہی لکھنے لگا کہ میری پنشن کے کاغذات بھی اپنے پاس رکھو۔ ساڑھے چھ بجے مجھے محسوس ہوا کہ اس کے یہ معنی ہیں ٹامسن کو شکست ہو گئی۔ اور لیجین اور اس کی تمام شیطانی قوتوں کو فتح ہوی۔ (لیکن خود پسند ہوتا کیا ہے میں نے اپنے دل سے سوال کیا) وہ باہر رات کی تاریکی کو گھور رہا تھا۔ لیکن عین جب میں نے خیال کیا کہ اسے شکست ہوی ہے۔ وہ فتح یاب ہو گیا باورچی خانے سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی دبی شناسا آواز سنائی دی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ لیجین کو شکست ہوی۔

میں ٹامسن سے مایوس ہو گیا۔ کیوں کہ اس میں اس سے زیادہ قابلیت ہی نہ تھی میں نے کوٹ اور ٹوپی پہنی اور باہر نکلا۔ مجھے ستاروں کا جھرمٹ دیکھ کر بہت حیرت ہوی، یہ ستارے کلاک کے ہندسوں کی طرح واضح اور روشن تھے۔ میں نے اپنی گھڑی نکالی اور اس کے محدود وقت کا مقابلہ اوپر کے وسیع وقت سے کیا۔ اس کے بعد آگے بڑھا جنگل

کے اخیر میں اُنسی اُبسی سی بدبو آ رہی تھی۔ شاید کوئی کبوتر یا خرگوش مرا پڑا تھا۔
جنگل سے نکل کر میں پکی سڑک پر پہنچا۔ لیکن سڑک پر تیز تیز قدم اٹھانے سے میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ رستہ بہت طویل تھا، اس لئے میں کھیتوں کے بیچوں بیچ ہو لیا۔
پھر مجھے بنگلہ نظر آیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرا خون چلتے چلتے رک گیا ہے۔ اور میرے اعضا بھاری ہو رہے ہیں۔ سڑک پر پہنچنے سے پہلے مجھے محسوس بھی نہ ہوا کہ بنگلے میں اندھیرا ہے، کرنیل کی بیٹی، سارجنٹ کی بیٹی، آج بچوں کی طرح سویرے ہی سو گئی تھی۔ جب میں نے ٹھہر کر سنا تو معلوم ہوا، کہ کھیتوں کے پار سے کچھ آدمیوں کے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ دس بج چکے تھے، لوگ شراب خانے سے جھومتے جھامتے نکل رہے تھے۔ عام طور پر انگلستان کے دیہات میں رات کو دس بجے لوگوں کی ٹولیاں گاتی ہوئی آتی ہیں۔ اور گلیوں کے پاس آ کر بکھر جاتی ہیں۔
میں نے گھر پہنچ کر چراغ جلایا۔ آگ بجھنے کے قریب تھی۔ میں تھک چکا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر خوش تھا کہ میں اپنے مکان میں، اپنی جانی پہچانی ہوئی چیزوں کے درمیان آ پہنچا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اپنی کھال کے اندر دوبارہ سمٹ آیا ہوں۔ باورچی خانے میں روشنی نہیں تھی، ٹامسن سو گیا تھا۔ اس کی ذہنی کش مکش کا تصور کر کے میں حقارت سے مسکرا دیا۔
میں نے ایک کتاب اٹھائی۔ اور اسے پڑھنے لگا۔ میرے کانوں میں گانے بجانے اور شور مچانے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ اس علاقے کی شراب کافی ترش اور خام ہوتی ہے۔ لیکن لوگوں کو گانے بجانے پر ضرور مجبور کر دیتی ہے۔
گانے کی آوازیں نزدیک سے نزدیک تر آتی گئیں۔ میں نے کتاب ایک طرف رکھ دی گلی میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میں سنتا رہا۔ بحث جھونپڑے کے قریب پہنچ گئی۔ دروازہ چرچرا کر کھلا۔ اور اب بحث میرے صحن میں ہو رہی تھی۔ یکایک — بلاشبہ — کچھ لوگ میرے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کسی آواز کو پہچان نہ سکا۔ زور زور سے گانے کی آواز قدموں کی ڈگمگاہٹ، اور اس کے بعد — یکبث سے دروازہ کھلا۔ اور اس کے پٹ زور کے ساتھ دیوار کے ساتھ ٹکرائے۔ کرنیل کی بیٹی اور ٹامسن گرتے پڑتے، نشے میں چور، ایک دوسرے کی

کمر میں بازو حمائل کئے ، اندر داخل ہوئے اور دھم سے فرش پر گر پڑے۔

ٹامسن خوف زدہ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ جہازی" کرنیل کی بیٹی نے اس کے ساتھ چمٹتے ہوئے کہا۔

"وہ تنہا تھا" کرنیل کی بیٹی نے لڑکھڑائی ہوئی زبان سے مجھے کہا۔ "ہم گراموفون بجاتے رہے۔ گاؤ !"

ٹامسن ابھی تک خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اس کی طرف مت دیکھو"! گاؤ" کرنیل کی بیٹی نے کہا۔ پھر اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور وہ دونوں ٹوٹی پھوٹی، بنی ہوئی گڑیوں کی طرح صوفے پر دھم سے گر پڑے۔

ٹامسن کی آنکھوں میں جیسے ساری دنیا کی محبت سمٹ آئی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور میں نے آج تک اسے اس طرح مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹ کھولے اور بلند آواز سے گانے لگا ـــ

"تم نے ہر درزی کو لوٹ لیا ہے
تم نے ہر ملاح کی کھال اتار دی ہے
لیکن اب تم شاہراہ جنت پر
سیر کرنے کیلئے کبھی نہ جاؤ گے"

"گاتے جاؤ۔ اتنا کافی نہیں ہے" کرنیل کی بیٹی نے کہا۔ اور خود گانے لگی ـــ

"آگے قدم۔ آگے قدم"

اس نے اپنے بازو ٹامسن کی گردن میں حمائل کر دئے۔ اور اس کا بوسہ لے لیا۔ وہ بھونچکا ہو کر اسے خوف زدہ نگاہوں سے گھورنے لگا۔ اور کچھ دیر تک اس کے لہنگے کو دیکھنے کے بعد اس کے بٹن کھول دئے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کرنیل کی بیٹی کی رانوں کی طرف اشارا کیا۔ انہیں دیکھ کر اس کا نشہ بڑی حد تک ہرن ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو کھینچ لئے اور کمرے سے نکل بھاگا۔ وہ دوبارہ واپس نہ آیا۔ کرنیل کی بیٹی میری طرف دیکھ کر کھسیانے پن سے ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں

میں حرارت اور چمک تھی۔ اس نے اپنے لہنگے سے پتّے نوچ کر پھینک دیئے۔

"وہ کہاں گیا ہے۔ کہاں گیا ہے؟" کرنل کی بیٹی نے بار بار پوچھا

"اپنے کمرے میں جاکر سوگیا ہے" میں نے جواب دیا۔

اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کا گلا گھٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں اچھل کر باہر نکلنے لگیں۔ وہ اس طرح دیکھ رہی تھی۔ جیسے جانور کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس نے اپنی چھاتی ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔

"کاش!" اس نے کھانستے کھانستے میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے جنون انگیز پیرائے میں کہا۔ "کاش! تم اپنا خونی چہرہ دیکھ سکتے"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹامسن کو پکارنے لگی۔ "ٹامسن۔ ٹامسن" لیکن جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ گانے لگی ؎

"دریا کے کنارے۔ دریا کے کنارے۔ ارے ہاں ہاں۔ دریا کے کنارے"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"میں ٹامسن کو ملنا چاہتی ہوں" اس نے جواب دیا۔ "یہاں وہی ایک مرد ہے"

اس کے بعد وہ پھر آوازیں دینے لگیں۔ وہ اس کے کمرے تک گئی۔ لیکن اس میں قفل لگا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بے تحاشا بھاگتی اور ٹامسن کو پکارتی رہی۔ پھر وہ باہر نکل کر پگڈنڈی پر کھڑی ہوگئی اور وہاں سے ٹامسن کو آوازیں دیتی اپنے بنگلے میں جا گھسی۔

دوسرے دن صبح ٹامسن حسبِ معمول نمودار ہوا۔ وہ میرے لئے ناشتہ لایا۔ اس نے "احکام" مانگے۔ قیمہ ٹھیک رہے گا؟ اور چتکبری مرغی کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس کی حالت کچھ ایسی خراب نہ ہوئی تھی۔ وہ حسبِ دستور یوں کام کر رہا تھا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی خوف، کوئی مجرمانہ کیفیت نہ تھی۔ اس نے معذرت بھی نہ چاہی۔ دوپہر کا کھانا، چائے کا وقت، اور اس کے بعد دن ختم ہوگیا میں نے بھی اپنا کام ختم کیا اور باورچی خانے میں گیا۔

"ہاں۔ ذرا رات کا قصہ تو سناؤ" میں نے کہا۔

ٹامسن آلو چھیل رہا تھا۔ وہ آلو ہمیشہ بالٹی میں رکھ کر چھیلا کرتا تھا۔ جیسے وہ جہاز کے سارے عملے کو کھانا کھلائے گا۔ اس نے اپنا چاقو نیچے رکھ دیا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پریشان نظر آتا تھا۔

"بڑا خوفناک معاملہ تھا" اس نے یوں کہا۔ جیسے اخبار میں کوئی وحشت انگیز خبر پڑھ کر آیا ہے۔

"بے حد خوفناک۔ جناب عالی! اس کی طرح ایک نوجوان لڑکی ہو۔ ذرا خیال کیجئے ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو اور وہ میرے پاس یہاں آئے۔ کاش اسے کوئی تعلیم دے۔ وہ میرے پاس آئی۔ اور کہنے لگی۔ میں گانا چاہتی ہوں۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے مجھے اچانک آ دبوچا تھا"

"لیکن یہ مناسب نہ تھا۔" ٹامسن نے کہا۔ "آپ جس پہلو سے بھی غور کریں یہ مناسب نہ تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے"

"میں نہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ صاف صاف بتا دو"

"اور جب تک آپ باہر نہ گئے۔ وہ انتظار دیکھتی رہی"۔ ٹامسن نے کہا۔ "یہ اچھی بات نہ ہوی۔ وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہتی ہے۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں میرا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ میرے نزدیک وہ ڈائن ہے"

میں اس کے بنگلے میں گیا۔ اب میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ اپنے باغ میں کھدائی کر رہی تھی۔ اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں بیلچہ تھا اور وہ پسینے سے تر بتر تھی۔ پتوں اور گلے سڑے پودوں نے کیاریوں کی زمین کو پتھریلا بنا دیا تھا۔ میں اسے کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ دیر گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر بولی: "میں باغ کی صفائی کر رہی ہوں۔ وہ کتیا سو موار کو آ رہی ہے"

وہ شرما رہی تھی اور اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں آگے چل دیا اور جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو وہ اپنے مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اسے آخری

مرتبہ اسی روز دیکھا تھا جب میں واپس آیا تو وہ اپنا بیلچہ کیاری ہی میں دھنسا ہوا چھوڑ گئی تھی۔ وہ اسی رات لندن چلی گئی۔ اور دوبارہ واپس نہ آئی ۔!

" خدا کا شکر ہے " ٹامسن نے کہا۔

اس کے بعد ٹامسن کی زندگی بالکل بدل گئی۔ اور میری بھی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ شاید یہ تغیر اس لئے آیا کہ خزدی کے غلیظ ایام گزر چکے تھے۔ موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ اور سال کروٹیں بدل بدل کر آگے بڑھ رہا تھا۔

میں بھی جلد ہی رخصت ہونے والا تھا۔ ٹامسن نے اب " نینٹی " کا ذکر کبھی نہ کیا تھا۔ وہ روزانہ سیر کے لئے باہر جاتا تھا۔ ڈاکیہ اس کا دوست تھا۔ وہ دونو شراب خانے جایا کرتے تھے۔ وہ اپنی تنخواہ باقاعدہ لے لیا کرتا تھا میخانے میں مزدور اکٹھے بیٹھ کر ایسی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے جو ٹامسن کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ ان کو اپنی گرہ سے شراب پلایا کرتا تھا۔ وہ ایک ہی بار پی کر گانے لگ جاتا تھا۔ مزدور اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ ان کو اور زیادہ شراب پلانے لگا۔ ڈاکیہ ان سب کو ٹامسن کی طرف سے دعوت دیتا۔ اور سارے پیسے اس سے وصول کر لیتا۔ وہ ہر رات اس کی جیبیں خالی کرا لیتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ جیبیں خالی کرانے کے بعد بھی اسے پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ میرے پاس اس کی شکایتیں لایا کرتے تھے۔

ٹامسن شاملات کو عبور کر کے اب اکیلا واپس آجاتا تھا۔ اس پر باری باری وحشت، ہوش، غم اور شک وشبہ کی کیفیتیں طاری ہو جاتی تھیں۔ اور اگلے دن وہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ لوگ دس دس میل تک " جہازی " کو جان گئے۔ وہ مشہور ہو گیا ہمارا آخری ہفتہ آ پہنچا۔ وہ پر سکون نظر آتا تھا۔

" اب کیا ارادہ ہے ؟ " میں نے پوچھا۔ " آپ ہی کے پاس رہوں گا "

" تم میرے پاس نہیں رہ سکتے۔ میں سمندر پار جا رہا ہوں "

" آپ بے شک مجھے تنخواہ نہ دیجئے۔ " اس نے کہا۔ " میں آپکے پاس ہی رہونگا "

میں اسے یقین نہ دلا سکا۔ کہ وہ میرے پاس نہیں رہ سکتا۔ وہ مایوس نظر

آنے لگا۔

— "مجھے یہاں سے باہر نکال لیجئے" آخر اس نے عاجزی سے کہا: "اسٹیشن تک میرا ساتھ دیجئے۔" — وہ خود بخود نہ جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اسے خطرہ تھا کہ سب لوگ اس کا پیچھا کریں گے۔ اس نے سب کو اپنی روانگی کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے ان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نے اس کی پنشن اور آخری دو ہفتوں کی تنخواہ محفوظ رکھ چھوڑی ہے اور وہ اپنے جھونپڑوں اور خندقوں سے بلبلاتے ہوئے باہر نکلیں گے اور اس کا دامن پکڑ لیں گے

ان حالات کے پیش نظر میں نے اس کا سامان باندھا۔ اور ایک ٹیکسی منگائی۔ ہم نے ان کھیتوں اور گلیوں میں کتنی آہستہ روی سے زندگی بسر کی تھی۔ اور اب موٹر ان کو کتنی تیزی سے پار کر رہی تھی ہم موٹر پر پہاڑی سے اترنے لگے۔ ہوا کے جھونکے مو کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ جب ہم بنگلے کے قریب سے گزرے تو دھوپ اس کے ویران دریچوں میں کھیل رہی تھی۔ میں نے باغ کی کیاری میں بیلچہ دھنسا ہوا دیکھا۔ موٹر اڑتی ہوئی گزر گئی۔ تامسن اس کے اندر چھپ کر بیٹھا تھا۔ تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ سکے لیکن میں آگے جھک کر ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ تاکہ اس پر آخری نگاہ ڈالوں اور بھول جاؤں۔

ہم شہر میں پہنچ گئے۔ جب بازاروں میں ٹیکسی آہستہ آہستہ چلنے لگی لوگ دکانوں کے دروازوں میں سے جھانکنے لگے۔ اور شراب خانے سے ایک برتن فرو نے سر ہلا کر اشارہ کیا۔

"وہ دیکھو ملاح!" آوازوں نے کہا۔

پولیس کے سپاہی، مچھلی فروش، سکول کے لڑکے اور درجنوں آدمی اسے رو ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں شاہی انداز میں موٹر پر سوار ہوں! آخر پر ایک موٹی سی عورت پلیٹ فارم کی سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی آئی اور کمر سیدھی کر کے پکار اٹھی۔

"ارے ملاح کا بچہ!" وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اور اس نے سامنے کے دو منزلہ مکان کی ایک کھڑکی میں بیٹھی ہوئی سہیلی کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ یہ ان کی فتح تھی

لیکن ٹامسن نے ان کی مطلق پرواہ کی۔ اور موٹر کے اندر چھپ کر بیٹھ رہا۔

"خدا کا شکر ہے، آپ میرے پاس ہیں" اس نے کہا۔ "یہ لوگ تو کھال اتار لیتے ہیں"

"کاش میں وائٹ چیپل میں پہنچ جاؤں" اس نے یوں کہا جیسے وہ سنگاپور کا نام لے رہا ہو۔ "تو مجھے کوئی اندیشہ نہ رہے گا" اس نے یہ فقرہ کئی دفعہ دہرایا، اور سرسبز کھیتوں کی عارضی دہشت سے اس نے منہ موڑ لیا۔

"آپ فکر نہ کیجئے" اس نے کہا "آپ میرا فکر نہ کیجئے"۔ جیسے جیسے لندن نزدیک آرہا تھا اس کی خوش امیدی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور میری خوش امیدی مایوسی سے بدل رہی تھی۔ جب ہم لندن پہنچ گئے۔ تو اس نے چلا چلا کر کہا "میں اپنا رستہ بنا لوں گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ میں آپ کو اپنا پتہ لکھوں گا"

ہم سڑک کی پٹڑی کے پشت بان پر کھڑے تھے۔ میں نے اسے پھیکے رنگ کی بارش میں رکے ہوئے، بڑبڑاتے ہوئے، منفید ٹریفک میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے آگا دیکھا نہ پیچھا، وہ گاڑیوں، موٹروں اور راہگیروں کے ہجوم میں گھس گیا۔ کرایہ کی موٹروں نے اسے بچانے کے لئے بریکیں لگا دیں۔ وہ وائٹ چیپل تک پیدل جانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے محفوظ ترین جگہ ہے۔!

مخمور جالندھری

غار

مرے راستے میں ہے کیوں غار حائل
تھکا ماندہ اک راہرو ہوں، مرے پاؤں چھلنی، مرا سینہ گھائل
نہ کوئی سہارا، فلک کا ہے ڈوبا ہوا ہر ستارا
نہ زہرہ شمائل کسی ہمسفر کی ہیں باہیں کمر میں حمائل
تصور کسی کا نہیں شمع منزل
اندھیرا ۔۔۔ گھنیرا، گھنیرا ہے ڈالے ہوئے چار سُو اپنا ڈیرا
تقاضائے منزل نہیں ہے کروں میں کہیں بھی بسیرا
تقاضائے منزل ہے چلتا رہوں میں
گروں گرتا پڑتا پھسلتا رہوں میں
میں بڑھتا ہی جاتا ۔۔۔ مگر راہ میں کیوں ہوا غار حائل
بھیانک، مہیب اور کانٹوں بھری جھاڑیوں میں نہاں ہے
کہ جیسے مرے حوصلے، ولولے کا یہ غار امتحاں ہے
یہ غار ۔۔۔ آگے بڑھنے کی دعوت کہاں ہے ۔۔۔؟

(۲)

ٹھہر جاؤں، سوچوں ۔۔ کہ جاؤں نہ جاؤں

چھلانگ اس چھپے اور ڈھکے غار میں کیوں لگاؤں
مَیں اندھا نہیں ہوں، جنونی نہیں ہوں جو بے سوچے سمجھے یونہی کود جاؤں
مگر غار — پُرہول، منہ پھاڑے، تاریک، گہرا
کہیں اپنے اندر چھپائے نہ ہو ایک عالم رسیلا، سنہرا
اُبھرنے لگا ہے، اُبھرتا رہا ہے تجسّس
ہر اِک حسن مستور ہر رازِ سربستہ نے اس کو گہرائیوں سے اُبھارا
سرطور بھڑکا دیا تھا تجسس نے پنہاں حقیقت کا عریاں شرارا
تجسس نے سر کی ہمالہ کی چوٹی
اِسی نے نئے اک جہاں کا کولمبس کو منظر دکھایا
تجسس نے انساں کو آہنی بازوؤں پہ بٹھا کر بلند آسماں میں اُڑایا

(۳)

یہ غار اس کے اندر ہے کیا، کون جانے — ؟
تذبذب کی دیوار جو پھاند جائے، نہ ڈھونڈے قیاسات کے جو بہانے
جو بے خوف ایثار کی جی میں ٹھانے
وہی دیکھ سکتا ہے اس غار کی اندرونی بہاریں
یہ ممکن ہے — چاروں طرف اس میں پڑتی ہوں کیف و مسرت کی رنگیں پھواریں
یہ ممکن ہے — اسیں لگی ہوں ہر اک سمت جلووں کی تاباں، فروزاں قطاریں

مہکتے ہوں پھول اور فضا میں بسے ہوں ترانے
ٹپکتے ہوں ہر شاخ سے رس بھرے تازہ پھل اور برستے ہوں مے بار گانے
کسی کو میسر مگر آئیں گی اس کی ساری مہکتی بہاریں
تذبذب کی دیوار جو پھاند جائے نہ ڈھونڈے قیاسات کے جو بہانے

(۴)

تذبذب کی دیوار بھی جو گرا دوں، دلائل کے بھی جو گڑھے پھاند جاؤں
ضروری نہیں ہے کہ آئیں میسر مجھے رنگ و بو کی مہکتی بہاریں
ضروری نہیں ہے — نگاہوں میں پیدا ہوں جلوؤں کی تاباں، فروزاں قطاریں
دوبارہ نہ ہاتھ آئے گی زندگانی
کبھی لوٹ کر بھی ہے آئی جوانی
میں کیوں اپنے لمحاتِ نایاب کی نعمتوں سے یونہی ہاتھ اٹھا لوں
میں کیوں زیست — اک تجربے، اک تجسس کی خاطر گنوا دوں
میں کیوں سانپ کے منہ میں انگلی دبا دوں
یہ مانا کہ ہوتی ہے ہر شخص کو زندگی سے محبت
بجا ہے بڑی تلخ ہے یہ حقیقت!
مگر ایک نقطے پہ رُک جانے سے کیا ہوا ہے کبھی کوئی سرشارِ منزل
یہ ممکن ہے — میرا یہی تجربہ اور یہ میرا تجسس

بنے دوسروں کے لئے ایک شمع ضیا بارِ منزل
میں اس غار کے کھول جاؤں گا اسرار تو توقع اس سے نہ کھائے گا کوئی نیا آنیوالا مسافر
یہ غار اس کے رستے میں ہوگا نہ حائل

(۵)

تقاضائے منزل ہے بڑھتا رہوں میں
یونہی رفتہ رفتہ سبھی سیڑھیاں ارتقا کی متانت سے چڑھتا رہوں میں
کبھی چاند اڈے ہوے بادلوں کی سیہ پوش یورش سے ڈرتا نہیں ہے
بلند اور سرکش چٹانوں کی ہٹ دھرمیوں سے کبھی تیز دریا ٹھہرتا نہیں ہے
جب اٹھتی ہے آندھی۔ گزرتی ہے قدموں میں پیڑوں کی لاشیں بچھاتی
ہوی سرسراتی
دھڑکتی ہے کیوں آج میری ہی چھاتی
یہ غار ایک رخنہ ۔ جو کانٹوں بھری جھاڑیوں میں نہاں ہے
یقیناً کوئی مے کدہ ہے، بہاروں سے لبریز اک گلستاں ہے
گل و غنچہ دیکھو نقاب ان کے کانٹے، مہ و مہر دیکھو سحاب ان کے پردے
میں ان جھاڑیوں کو ہٹاؤں
نڈر ہو کے اس غار میں کود جاؤں۔

محمد صفدر

کشتیاں اور ریت

(۱)

یہاں سینکڑوں سال سے کہکشاں کے
ستاروں کی مانند موجوں
پہ بکھری ہوئی کشتیاں، پال کھولے،
گزرتی رہی ہیں۔
جہاں دھان کی کھیتوں کے کنارے
مدھر مست دریا بہے جا رہا ہے
کبھی اس کی تاریک چادر پہ چلتے ہوئے،
کسی ناؤ کے چپوؤں پر
دھنک کھیلتی ہے؛
کبھی چاندنی ناچتی ہے
درختوں کے گھیرے
میں کھوئے ہوئے گاؤں تک اس کی مدھم ترنگوں
کی آواز جاتی نہیں ہے
مگر سینکڑوں سال سے کشتی بانوں
کا گیت اس فضا کی گھنی خامشی میں
چھلکتا رہا۔

گونجتا ہی رہا.
گونجتا ہی رہے گا

(۲)

ستاروں کی شمعیں
خموشی کے سائے لئے شام آئی
سیہ پانیوں پر
ہوا کی جگائی ہوئی سلوٹیں کانپتی ہیں
ابھی دھان کے سرسراتے ہوئے کھیت کہرے میں کھو جائیں گے.
کناروں پہ جنگل میں دبکے ہوئے گاؤں سو جائیں گے
ہر اک چیز سو جائے گی
مگر کشتی بانوں کا گیت اس گھنی خامشی میں
گگن کے تلے گونجتا ہی رہے گا.

(۳)

سرکتے دھارے،
مچلتے دھارے کے اس کنارے
بسے ہوئے شہر کی پرانی
عمارتوں کی قدیم آنکھوں
نے سینکڑوں سال کشتیوں کو گزرتے دیکھا ہے
اور ان کے کانوں نے سینکڑوں سال سے سنی ہیں
یہی صدائیں، بلند تانیں.

یہ کشتی بانوں کا گیت اسٹیمروں کے تاریک شور میں بھی
چھلک رہا ہے۔
امنڈ رہا ہے

(۴)

گرجتے دھارے کو چیرتی کشتیوں کے کڑیل چلانے والوں
کے بازوؤں میں وہی تھکن سے بھرا سکوں ہے،
جو تیز دریا کی مست گمبھیر چال میں ہے
سیاہ جسموں کے گرم امنڈتے ہوئے لہو میں
وہی جھنک ہے جو تند موجوں کے وحشیانہ ترنّم میں ہے

یہ ناؤ والے
انہیں سمندر کے شہسواروں کے پوت ہیں
جن کو، صدیاں گزریں، کہ تمرالپتی کی گودیوں سے
سفید پالوں کی راج ہنس ایسی کشتیوں پر
نکل کے نیلے اُفق کو چھونے چلے گئے تھے۔
انہیں کے نغموں کی گونج سے سینکڑوں برس کی
خموشیاں تھرتھرا رہی ہیں
انہیں کے جے کاروں سے ابھی تک
سیہ گھنے جنگلوں میں کھوئے
تباہ کمبوج کے شکستہ کھنڈر لرزتے ہیں۔

(۵)

سطحِ دریا پہ ہیں موجوں کے نقوش ؟
نہیں دریا نہیں۔ یہ سلسلۂ موج نہیں۔
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر

عرق آلودہ جبینوں پہ شفق کی بارش۔
اور کہسار میں بل کھاتی ہوئی راہ گذر
یہاں پانی نہیں اور راہ گذر ——
ابتدا ؟ انتہا ؟ اک موجِ خیالات کا گم گشتہ راگ۔

ریت اڑتی ہے کبھی۔ تیز ہوا چلتی ہے۔
خارزاروں میں ہوا۔ خشک درختوں میں ہوا
سُونے معبد میں ہوا
موت کے راگ دھندلکے میں بکھر جاتے ہیں
دور سے ماؤں کے نوحے کی صدا آتی ہے
یہاں پانی نہیں یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر

خُشک بادل کبھی کہساروں میں
خُشک چہرے ہوئے گردوں نگراں
خشک بادل ہی گرجتے تو ہیں۔ برسیں گے کبھی ؟
گونج کی لرزشیں بے آب چٹانوں میں رواں
گونج کی لرزشیں ہیں، پانی کی آواز نہیں
یہاں پانی نہیں، یہ سلسلۂ موج نہیں۔

ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر

کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا ؟
کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا ؟
اے خدا۔ اے مرے اجداد کے رب
اے مرے اجداد کے رب

(۹)

تنے ہوئے، چرچراتے رسّے
لرزتے اعصاب
تند سانسیں
جھکے ہوئے جسم، کانپتے تھرتھراتے بازو۔

یہی خموشی، یہی مشقت۔
سدا خموشی۔ سدا مشقت۔
سدا سہاگن زمیں کے بیٹوں کی آج تک ہے یہی کہانی
یہی ہے قسمت

یہی رہے گی، سدا رہے گی
نہیں۔ دہکتا لہو شفق ہے
جو شام کے نیلے آسمانوں پہ کھل رہی ہے
یہی پسینے کے سرد قطرے سجل ستارے ہیں
صبح کی مانگ کے ستارے

علی عباس حسینی

جمالیات

پھٹی گدڑی میں لعل بے بہا کا ملنا اور ہندستانی دیہات میں حسن بے محابا کا پایا جانا محال تو نہیں، مگر تعجب خیز ضرور ہے۔ اسی لئے جب دیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا تو بوکھلا سا گیا۔ یونانی ناک نقشہ، اسپینی آنکھیں، مصری کس بل، آرمینی رنگ روپ، حرکت میں ایک کوندا سا لپکتا تھا۔ ہر قدم پر ایک بجلی سی چمکتی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ نظارہ کرنے والے دیدہ و دل فرش راہ بنائیں ـــــ اسے شاعری نہ سمجھئے۔ میں نے اتنا مکمل حسن اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔

اسی لئے میں نے اپنے میزبان محسن نواب سے بڑی بے ساختگی سے پوچھا "کیا اس گاؤں میں قاف کی پریاں بھی آتی ہیں" ہم دونوں کچے دیہی راستے سے ہٹ کر ایک درخت کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ بڑے دن کی چھٹیاں تھیں۔ محسن نواب نے چڑیوں کا شکار کھیلنے مجھے اپنے گاؤں پر مدعو کیا تھا۔ صدرانہ سے جھیل زیادہ دور نہ تھی۔ ہم لوگ چند آدمیوں کو ساتھ لے کر اندھیرے منہ وہاں پہنچ گئے تھے۔ سینچ پر ودرشیلوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ ہم نے بیس ایمس فیر کئے۔ جو چڑیاں زخمی ہو کر جھاڑیوں میں چھپ رہیں یا مر کر پانی میں ڈوب گئیں ان کا شمار نہیں، لیکن تین مٹی چھریوں کے نیچے پہنچ کر حلال ہوئیں۔ شکار کی کامیابی سے ہم بہت خوش تھے۔ سردی، پالا، یخ پانی، ہم پر کسی چیز کا اثر نہ تھا۔ کامیابی کی گرمی سب پر غالب تھی۔ اسی لئے ہم نے اتنی ہی چڑیوں پر، جو کئی خاندانوں کی دعوت کے لئے کافی تھیں، اکتفا نہ کی۔ ہم انہیں ملازموں کے ہاتھ گھر بھیج کر آگے بڑھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری زد سے بچی ہوئی چڑیاں منگی پور کے نالے میں گری ہوں گی۔ یہ نالہ ایک چھوٹے سے جنگل میں، جو جھیل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا، بہتا تھا۔ ہمارا خیال صحیح ثابت ہوا۔ گھنے درختوں کے نیچے، ایک جگہ جہاں پانی کا چاندا سا بن گیا تھا، بقیتہ السیف بطیں پڑی تھیں ـــــ پر کھجاتی ہوئی، غوطے لگاتی ہوئی، ایک دوسرے کو چھیڑتی، ٹھٹھول کرتی ہوئی، ایک دوسرے کی گردن میں گردنیں پھنساتی ہوئی پچھلے سانحے کو فراموش کئے ہوئے، مستقبل کے خطرات

سے غافل، حال کے مزوں میں مگن! — ہم درختوں کی آڑ لیتے ہوئے، بلی کی چال چل کر چاندے تک دونوں کونوں پر بیٹھ گئے۔ جسمانی حیثیت سے جدا جدا، جذباتی حیثیت سے متحد و متفق۔ ہم نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا، اور ایک ساتھ دو فیر کئے۔ اور جب گھائل چڑیاں پھنکر بلند ہوئیں، تو ہم نے پھر دو فیر کئے۔ ان چار فیروں نے قتل عام کا سا منظر پیش کر دیا۔ نالے کے اندر، نالے کے باہر، چڑیاں ہی چڑیاں پھڑک رہی تھیں۔ ہم بندوقیں پھینک کر چاقو نکال کر جھک پڑے۔ بسم اللہ واللہ اکبر! بسم اللہ واللہ اکبر! — نہ ہمیں اس کی پروا تھی کہ آستینیں خون سے بھرتی ہیں، نہ اس کی فکر کہ دامن پر لہو کے دھبے آتے ہیں۔ ہم بالکل حیوان تھے، خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے، ایک دوسرے کو آواز دیتے ہوئے "لینا! پکڑنا! اسے جانے نہ دینا، دیکھنا وہ جھاڑی میں چھپ رہی ہے، وہ پانی میں غوطہ لگایا چاہتی ہے، ارے وہ دم توڑ رہی ہے۔ ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ، کہیں ٹھنڈی نہ ہو جائے!" غرض ایک طرف پھڑکتی، دم توڑتی چڑیوں کی قیں قیں تھیں، دوسری جانب ہماری خوشی کی قلقاریاں تھیں۔ دو تین نہ ملنے پر بھی اکیس چڑیاں ہاتھ آئیں۔ اور ہم بن ٹھنے جھومتے ہوئے گھر چلے — گاؤں تقریباً تین میل تھا، ہم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا، ہماری نیکریں بھیگی تھیں، ہمارے جوتوں میں کیچڑ بھری تھی۔ ہمارے کپڑے خون سے لت پت تھے، مگر ہم سرخوش تھے، مسرور تھے، مخمور تھے — دن کے تقریباً نو بج گئے تھے؛ ٹھٹھری ہوئی دھوپ بھی گرما گئی تھی، اوس سے بھیگے ہوئے کھیتوں سے ایک ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا، ایکھ کی کلغیوں سے موتی غائب ہو رہے تھے۔ مجھے بے ساختہ غالب کا مصرعہ یاد آ گیا۔ ع

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم! میں نے اس سے الگ ہو کر ایک تناور درخت کے سائے بندوق کھڑا کر دی۔ جھولا اتار کر رکھ دیا اور سگریٹ جلایا۔ محسن نے بھی بغیر قیل و قال میری تقلید کی۔ ہم ہی سگرٹ کا مزہ لے رہے تھے کہ غالب کے شعر کا دوسرا مصرعہ انسانی صورت میں نمودار ہوا۔ یعنی دیوی کے حسن بے عدیل کے آفتاب نے اپنی ضیا پاشی سے میری آنکھیں خیرہ کر دیں —

محسن نواب میری حیرت اور میرے اضطراب پر مسکرایا۔ پھر شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولا "ہاں، اور کالا دیو بھی" میں نے شہاب ثاقب کا نظروں سے تعاقب کرتے ہوئے کہا: مذاق کرتے ہو! وہ بولا "سچ کہتا ہوں۔ عجیب جوڑ ہے۔ ایک آبنوس مجسم، کوئلے کا تودہ! دوسرا روئی کی طرح سفید، بالائی کی طرح نرم۔ ایک فولاد، دوسرا موم! ایک سنگِ موسیٰ کا تپتا ہوا پہاڑ، دوسرا شیر و شکر کی

خشک نہر! ایک پہر کی کالی رات........

میں نے بات کاٹ کر کہا "ماشاء اللہ طبیعت موزوں ہے!"

وہ بولا "موضوع ہی ایسا ہے کہ بیان حقیقت شاعری معلوم ہو" میرے چہرے پر عدم یقین کے آثار دیکھ کر اک دفعہ بھڑک اٹھا "آؤ میرے ساتھ، اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے، جب تو مانوگے!"

وہ اپنی بندوق اور جھولا لے کر اس طرف چل پڑا جدھر ابھی دیوی گئی تھی۔ میں بھی لدا پھندا ساتھ ہولیا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا دیوی کے نقش قدم چمک رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا، رستہ خوشبوؤں سے بسا ہوا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا ذرہ ذرہ گنگنا رہا ہے۔ ہم نے مٹر اور چنے کے کئی کھیت طے کئے۔ ان کی ٹہنیاں اپنی گودوں میں اپنے ثمر لئے کھڑی تھیں۔ ہم گیہوں اور جو کے کئی کھیتوں سے گزرے۔ ان کی سبز پتیاں مخمل کی نرمی کو شرماتی تھیں۔ ہم نے کئی تاج ہ[illegible] کے کھیت پار کئے۔ وہ بڑی حیرت سے پاگل سے معلوم ہوئے اور ہمیں دور ایک ارہر کے کھیت کے پاس دیوی دکھائی دی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ننگے بدقطع شخص کو چلم بھر کر دی۔ اس نے چلم سے لگے ہوئے نرل کو بائیں ہاتھ سے اٹھایا اور وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اسے پینے لگا — اور دیوی اس کے سامنے اس طرح کھڑی تھی جیسے پاندنی راجہ کے سامنے، پجارن دیوتا کے روبرو!

محسن نواب نے رقیبانہ لب ولہجہ میں آواز دی "نہی!"

اس نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ جلدی سے نرل دیوی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وہ کھڑا ہو کر بولا "پا جی سرکار!" وہ دیکھتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ لنگوٹ میں دوگز کی اونچی اور میلی دھوتی تھی۔ بقیہ جسم چمکتے ہوئے سیاہ بالوں سے ڈھکا تھا۔ دو انگل چوڑی پیشانی۔ دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ نیچے کا جبڑا کچھ آگے کو بڑھا ہوا، موٹے موٹے ہونٹ، فربہ گردن، بازو اور کندھے ابھرے ہوئے، سینہ چوڑا، پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا، پتلی کمر، گداز رانیں، مضبوط پنڈلیاں، اور دھول میں اٹے ہوئے بڑے بڑے پاؤں۔ جب وہ بالکل ہی قریب آ گیا تو میں نے دو باتیں اور دیکھیں۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ کی چار انگلیاں غائب تھیں۔ اس کی بڑی سی ہتھیلی میں اکیلا انگوٹھا بالکل سوکھے ہوئے کچھوے کی طرح گھناؤنا معلوم ہوتا تھا!

اس نے جھک کر سلام کیا۔" حکم، ہجور! "

محسن نواب مسکرا کر بولا " اے میاں ٹلمی یہ بابو جی جو میرے ساتھ ہیں، یہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ تمہارے گاؤں میں آئے ہیں، تمہارے مہمان ہیں۔"

محسن نواب رُکا۔ میں کچھ عجیب سی ندامت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کیوں اس ظالم سے دیوی کے بارے میں سوال کیا۔ بھڑ کے چھتے میں ڈھیلا مار دیا۔ اب اللہ جانے یہ کیا کہہ دے۔ اس کو تو عجیب باتیں کرنے کی عادت ہی سی تھی۔ اس کو تو دوسروں کو ستانے اور چھیڑنے میں مزہ بھی آتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا " جسم بھر میں چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ میرا بس نہ چلتا تھا۔ بھاگ جاؤں، چیخ اٹھوں " جی یہ مجھے بنا رہا ہے، اسکی ساری باتیں واہی ہوتی ہیں "۔ ٹلمی بھی گھبرایا ہوا تھا ۔۔ دیوی کھیت کے کنارے، دو پڑھے لکھے شہر کے نوجوان۔ پھر ان میں سے ایک خود زمیندار۔ نہ جانے کیا فرمائش کرنے والے تھے۔ کیا حکم صادر ہونے والا تھا۔ اس نے کہا " پھر ہجور جو حکم ہو "۔ لیکن آواز چیخ رہی تھی کہ کچھ ایسے بھی حکم ہو سکتے ہیں، جن کے بجا لانے میں تامل ہے

محسن نواب بندوق لئے ہوئے کھیت کے میڈ پر بیٹھ گیا۔ میری طرف شرارت سے دیکھ کر بولا " یہ تمہاری دیوی کو پری کہتے ہیں۔ پوچھتے ہیں قاف سے یہاں اسے کون لایا ؟ "

ٹلمی دانت نکال کر مسکرا دیا۔" جھوٹ نہیں کہتے سرکار، وہ سچ مچ کی نیلم پری ہے، اور میں ہوں اس کا دیو۔ میں ہی لایا ہجور! "

میں نے محسوس کیا کہ ٹلمی کا لب و لہجہ بھی اور انداز گفتگو بھی دفعتاً بدل گیا۔ وہ دیہاتی کسان کی جگہ ایک شہروں میں گھومتے ہوئے تھیٹر والوں کی طرح بات چیت کرنے لگا۔

میں نے پوچھا " تم نے تھیٹر میں کام کیا ہے ؟ "

وہ بولا " جی ہاں بمبئی تھیٹر میں۔ وہیں دیوی بھی تھیں! "

محسن بولا " تو یہی تو پوچھنا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ یہاں کیسے آئی۔ کیا تم نے اپنی صورت کبھی آئینے میں نہیں دیکھی ؟ "

ٹلمی بڑے زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسا " دیکھی کیوں نہیں سرکار مجھکو کھد اچنبھا ہے۔ اور ہجور ایک بات اور سن لیجئے۔ وہ روج سویرے اٹھ کر نہا دھو کر پوجا کرتی ہے۔ جانتے ہیں ہجور کا ہیکی

پوجا کرتی ہے ؟" وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح ہمارے استعجاب کو پوری طرح اُبھار کر رکا۔

محسن نواب نے جھک کر کھیت میں سے گیہوں کی ایک پتی توڑی اور اس کا ایک کونا دانت کے نیچے دبا لیا۔ پھر وہ بولا۔ "ارے کرتی ہوگی شیوجی کی پوجا، اور کس کی !"

مُلہی کے چہرے پر اس خوشی کے آثار جھلک اٹھے جو پہیلی بجھانے والے کے چہرے پر بوجھنے والوں کی ناکامیابی پر کھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بڑے فخر سے بولا "جی نہیں حضور۔ نہ شیوجی کی، نہ رام لچھمن کی، نہ کرشن جی کی اور نہ کسی اوتار کی !"

وہ ایک ہوشیار ماہی گیر کی طرح ہماری عقلوں کو اپنی شست میں پھنسا کر اب ان سے کھیل رہا تھا۔ محسن نواب پھر کچھ کہنے جا رہا تھا، میں نے اس کا زانو دبا کر اسے روکا اور ہم دونوں نے ایک ساتھ سر ہلا کر اپنی شکست مان لی۔

مُلہی نے ہم دونوں کے چہرے پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی۔ پھر ڈرامائی انداز سے اپنا ٹھونٹھ ہاتھ ہماری طرف بڑھا کر بولا "اس ہاتھ کی !"

محسن نواب بیساختہ بول اٹھا "اماں کیوں بے وقوف بناتے ہو میاں مُلہی !"

تو اس پر خ ہو گیا، مُلہی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے کہا "حضور کو یقین نہیں آتا۔ میں اُسی سے پچھوائے دیتا ہوں" وہ ادھر مڑا جدھر دیوی کھیت میں کھرپی لئے نکائی کر رہی تھی "دیوی !" اس نے گرجدار آواز میں کہا۔ چاند کی طرح چمکتا چہرہ ہماری طرف ہو گیا۔ "یہاں آؤ" آواز میں حکومت بھی تھی اور چمکار بھی۔ بالکل اسی طرح کی جیسے سدھائے ہوئے جانور کے لئے سرکس والے یا معمول کے لئے مسمرائز کرنے والا استعمال کرتا ہے — دیوی نے وہیں سے ہم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال، کھرپی لئے متانت سے باہر آئی۔ اس نے کھرپی مینڈ پر رکھ دی، دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑ کر صاف کئے۔ اور آہستہ آہستہ ہماری طرف چلی مجھے میں محسوس ہوا، ایک شمع فروزاں میری طرف چلی آ رہی ہے میرا دل اچھلنے لگا۔ میرا دم سینے میں اٹکنے لگا۔ جیسے میں اپنی بساط سے زیادہ تیز دوڑا ہوں جیسے میرے پہلو پر اچانک کسی نے گھونسہ مار دیا ہے۔ جیسے میرے حلق میں کچھ پھنس گیا ہے میں نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں پر نظر کی گنگ کا منہ کھلا ہوا اس کے آگے کے دانت باہر نکل آئے تھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں مٹھی کی صورت میں بند ہو گئی تھیں۔ محسن نواب ایسے تنے جا رہے تھے جیسے ان کی جان جا رہی ہو

کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچلی ہوئی پتی تھوک دی تھی۔ دوسری تازی پتی دانتوں کے نیچے دبالی تھی۔

دیوی ہم لوگوں سے کوئی دس قدم فاصلے پر ٹھٹکی۔ ٹھی محسن نواب کی طرف اشارہ کر کے بولا: "یہ ہمارے ٹھاکر ہیں"۔ پھر میری طرف مڑا: "اور یہ ان کے دوست"۔ کیوڑے کے دو پھول ایک دوسرے سے مل گئے۔ دیوی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کیا۔ ہم نے جواب دیا۔ ٹھی بولا "دیوی، ان لوگوں کو کیسے نہیں آتا کہ تم میرے اس ٹھونٹھ ہاتھ کی پوجا کرتی ہو!"

دیوی کا چہرہ شنجرفی ہو گیا۔ محسن نواب نے ہونٹوں سے لٹکی ہوئی پتی کو ایک آنکھ بند کر کے دیکھا۔ پھر اسے بالکل جانوروں کی طرح ایک ہی دفعہ منہ کے اندر کھینچ لیا۔ وہ جگالی کرتا ہوا بولا: "دیوی جی، ہم کٹیرے گاؤں کے زمیندار۔ یعنی اس دیہاتی خاندان کے سب سے بڑے بزرگ۔ سو اب جو تم اس گاؤں میں آئی ہو تو تم کو ہماری بزرگی ماننا ہی پڑے گی......"

اس نے بڑے شیریں لہجہ میں کہا: "تو میں کب اس سے انکار کرتی ہوں"۔

محسن نواب کو یہی آواز سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ اس موسیقیت و ترنم سے بھرپور آواز کو کاٹ کر بولا: "پچوں کی طرح اس بزرگ خاندان کے پاس بیٹھ کر اپنی آپ بیتی سناؤ"۔

محسن نواب کی باتوں پر ٹھی مسکرا دیا۔ مجھے غصہ سا معلوم ہونے لگا۔ اللہ رے زمیندارانہ ذہنیت۔ جیسے گاؤں میں کسی کو کوئی بھی راز، کوئی انفرادی رائے رکھنے کا حق ہی نہیں۔ جیسے سب ان کے زرخرید غلام ہیں، اور یہ سب کے آقا ۔۔ دیوی کے چہرے پر پھر رنگ دوڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلیں۔ وہ بولی: "تو کیا اس گاؤں میں رہنے کے لئے یہ شرط ہے کہ ہم نہ کہنے والی باتیں بھی آپ سے کہہ دیں؟" میں نے محسوس کیا شیریں لہجے میں نوجوان ہندستان کی تلخی آ گئی تھی۔

ٹھی کے خون میں وراثتاً زمیندار کا خوف تھا اس کا سا "بھتیجا" مرد ڈر گیا: "دیوی جی! دیوی جی! یہ گاؤں کے ٹھاکر ہیں۔ ہم رعایا یہ راجا۔ مالک۔ ان داتا۔ ان سے کوئی بات چھپانا کیسا؟"

پمی نے دیو کو دیکھا۔ پہلے تو اس نظر میں حقارت تھی، پھر آہستہ آہستہ اس میں جھنجلاہٹ پیدا ہوئی، وہ بھی ترس میں بدلی، اور اس نے آخری صورت محبت کی اختیار کی۔ اس نے غیرارادی طور پر ٹھی کے سامنے سر جھکا دیا۔

محسن نواب جلی ہوئی تپی تھوک کر پھر تیسری تپی توڑنے کے لئے جھکا۔ میں نے اسے اس میمونی حرکت سے باز رکھنے کے لئے جلدی سے سگریٹ کیس بڑھا دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا پھر ایک سگریٹ نکال کر اسے سگریٹ کیس پر ٹھوکتا ہوا بولا "دیوی میں بہن کے لحاظ سے نہ سہی گزشتے کے لحاظ سے لِلی کا باپ ہوں اور تمہارا ...... خیر! مجھے حکم دینے کا اختیار ہے" دیوی شرمائی آنکھوں سے اسے دیکھ کر اس کے قدم چھونے کے لئے جھکی۔ مجھے محسوس ہوا حضرت یوسف نے جو کچھ خواب میں دیکھا تھا میں جاگتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ چاند زمین پر سر رکھا پاتا ہے! محسن نواب پیچھے ہٹ کر ہاتھ سے روکتے ہوئے بولا "جیتی رہو۔ مگر کہانی! ....."

گلاب کھل گیا۔ وہ مسکرا دی۔ مبالغہ نہیں ہے۔ مجھے ویسی ہی خوشبو محسوس ہوئی مگر نہ جانے کیوں ایک ہی لمحہ بعد یہ مسکراہٹ ایک مرجھائی کلی بن گئی۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بیٹھ کے بیان فرمایئے"۔ وہ بھی زمین پر بیٹھ گئی۔ میں اور محسن نواب گھٹنے سے گھٹنا ملائے ہوئے، پورب رخ، لِلی ہمارے روبرو پچھم رخ، اس سے دو تین گز ہٹ کر دیوی دکن رخ۔

لِلی دفعتاً بول اٹھا "تو کھیا لیک کے ایک کھاٹ نہ اٹھا لاؤں۔ آپ لوگوں کا اس طرح زمین پر بیٹھنا تو کچھ اچھا نہیں لگتا"

محسن نواب بولا "نہیں جی۔ ہم لوگ بڑی دور سے تھکے ماندے چلے آرہے ہیں۔ بس ذرا تم دونوں کی کہانی سن لیں پھر گھر جاکر آرام سے نہائیں گے، دھوئیں گے، آدمی بنیں گے ــــ ہاں دیوی جی تو تم بھی اسی تھیٹر میں تھیں جس میں ہمارا لِلی تھا؟"

اس نے بیشب سرخ لعل پر پھیرا، چھوٹی سی زبان سے سوکھے ہونٹ تر کئے۔ آہستہ سے بولی "جی، میں تو تھیٹر ہی میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی۔ میری ماں بھی ایکٹرس تھیں۔ باپ کا نام مجھے معلوم نہیں۔ تین چار برس کی تھی کہ ماں بھی مر گئیں۔ کمپنی نے مجھکو پالا، پانچ برس کی عمر سے کام کرنے لگی۔ کبھی کسی کی بیٹی بنتی، کبھی کسی کی بہن، کبھی لڑکی کا پارٹ کرتی، کبھی لڑکے کا۔ گانا ناچنا سکھائی گئی۔ دس گیارہ ہی برس کی تھی کہ لوگ میرے گانے اور ناچنے کی تعریفیں کرنے لگے میں سب کی دیکھا دیکھی بننے سنورنے بھی لگی اور اترانے بھی۔ وہاں کی دنیا بڑی گندی ہوتی ہے ایکٹر ایکٹر سے جلتا ہے۔ ایکٹرس ایکٹرس سے حسد کرتی ہے

جو بڑھ گیا ہے اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی نوجوان مجھ سے بازی نہ لے جائے۔ جو بڑھ رہا ہے اسے یہ فکر کہ میں آگے والوں کی کسی طرح ٹانگ پکڑ کر پیچھے کھینچ لوں۔ خیر یہ تو ہر جگہ ہی ہوتا ہے لیکن اس سلسلہ میں جو چھوٹی چھوٹی ذلیل باتیں وہاں ہوتی ہیں ویسی کہیں نہ ہوتی ہوں گی۔ مینجر اور مالک کو خوش کرنے کے لئے ہر ایکٹر دانت نکالے چیز کرتا اور چغلی کھاتا پھر رہا ہے۔ ایکٹریس بڑی تنخواہیں پانے کے لئے مالک کو خوش کر رہی ہیں، مالک کے دوستوں کو بھی ......"

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی جھکی ہوئی غزالی آنکھیں کھیتوں کے پار، دور، نہ جانے کیا کیا دیکھنے لگیں۔ محسن نے سوال کیا "تو اس دنیا میں میاں لہی کب ملے؟"

لہی خود بول اٹھا "بس ہجور، یہ کوئی چودہ برس کی بتیں جب میں بمبئی گیا تھا۔ وہاں ایک مل میں کام کرتا تھا۔ ایک دن دوستوں کے ساتھ تماشا دیکھنے چلا گیا۔ ان کو جو دیکھا تو سارا کام دھام بھول گیا۔ دوسرے ہی دن سے مل نہیں گیا۔ وہیں تھیٹر میں نوکری کر لی۔"

وہ سادگی سے ہنس کر چپ ہو گیا۔ میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ کوّے کی قائیں قائیں میں بھی رس ہوتا ہے، صرف موقع و محل کا رومانی ہونا شرط ہے۔

محسن نے اس فریادی بیان کو اس طرح سنا جیسے یہ کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا۔ اس نے مسکرا کر فقرہ چست کیا "اچھا تو آپ پہلی ہی نظر کے گھائل نکلے!!" اس پر میں بھی مسکرایا اور دیوی بھی مسکرائی۔ وہی بات جس پر ہم نوجوانی میں شرمایا کرتے ہیں، جوان ہو کر کتنی آسانی سے روزمرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ لہی بھی ہنسا۔ اس ہنسی میں اپنی ملکیت، اپنے قبضہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ پھر وہ میری طرف شرارت سے اشارہ کر کے بولا "یہ بھیا جی تو پہلی ہی نجر کے گھائل ہیں" مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں شرم سے ایک چہاردہ سالہ نوجوان کی طرح عرق ہو گیا۔ دیوی اپنی ساڑی کے آنچل کا ایک حصہ منہ میں ٹھونس کر ہنسی ضبط کرنے لگی۔ محسن نواب کے چہرے پر بھی ایک لہر سی پڑی۔ لیکن اس نے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ میری لاج رکھ لی۔ وہ بے پروائی سے بولا "اچھی چیز سب کو اچھی لگتی ہے۔ تم اپنی کہو، کہ دیوی سے پہلے کیسی بنی؟"

لہی نے کہا "میری ان سے کیا بنتی سرکار۔ میں پورا بن مانس اور یہ ٹھیری پری۔ پھر

اس وقت بچہ بھی تھیں۔ یہ تو مجھے دیکھ کر ڈرتی تھیں۔ جیسے میں سچ مچ جانور ہی تھا۔" وہ پھر ہنسا۔

دیوی نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ آنکھیں معافی مانگ رہی تھیں۔

ملہی نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا "مگر مجھکو جو ہجور پہلے ہی دن سے بات کھٹکی، وہ یہ تھی کہ ان سے سارا تھیٹر جلتا تھا۔ اور منیجر کی آنکھیں ان پر بڑی پڑتی تھیں۔ وہ ان کو چلتے پھرتے۔ ہنستے بولتے سدا اس طرح دیکھتا جیسے آنکھوں کے رستے انہیں پی جانا چاہتا ہے۔"

برف کی سل میں پگھلنے اور پھسلنے کے پہلے والی حرکت ہوئی، دیوی نے ایک جھرجھری سی لی۔۔ محسن نواب نے پہلو بدل کر کہا "اسے چھوڑو فضول کی باتوں کو۔ اصل واقعہ بیان کرو۔"

دیوی پلٹ پڑی "یہ غریب کیا کہیں گے، میں سناتی ہوں۔ منیجر صاحب مجھے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے تھے لیکن ان کی اپنی بیوی گھر پر تھی اور تھیٹر کی سب سے بڑی ایکٹرس بھی ان کی معشوقہ تھی۔ کچھ دنوں تو میں اپنی کم سنی کی وجہ سے بچی اور کچھ دنوں بعد ان دونوں کی رقابت نے بچایا۔ جب وہ وار کرنا چاہتے ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی آڑے آجاتا۔ ایک مہر دلنشیں کے دعوے کی دھمکی دیتی، دوسری تھیٹر چھوڑ دینے کی۔ بس ان کی ساری شان خاک میں مل جاتی۔"

ملہی ہنسا "ارے حضور کچھ پوچھئے نہیں کہ منی بائی کی ماں تھی۔ اگر نگیبی نہیں مار سکتیں تو دیوی کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ ایک دن جب وہ آپے سے باہر ہو رہی تھیں اور منیجر سے لڑ رہی تھیں کہ تم دیوی کو نکالو نہیں تو اس کا خون کر دوں گی۔ میں نے بائی جی سے الگ لے جا کر کہا "سنا بائی جی آپ نے۔ اگر منیجر اس لونڈیا کو چاہتے ہیں ......" نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں نے اس ہانڈی سے کوئی چیول اٹھالیا ہے جو ٹونے ٹوٹکے کے خیال سے کسی چوراہے پر رکھی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں دیوی کے حسن وجمال نے تقدس، نزہت و پاکیزگی کا ایک موہوم سا محل جو ذہن میں کھڑا کیا تھا وہ دفعتاً مسمار ہو گیا ــــ میں نے جھک کر مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا لیا اور اسے چٹکیوں میں مسل کر پھینک دیا۔ ملہی کہے جا رہا تھا "تو میں بھی اس پر آہنک ہوں۔"

وہ میری بات سن کر بہت ہنسیں۔ بولیں "تو کالے دیو اپنی نیلم پری کو اڑا لے جاؤ۔" میں بولا "میں اپنی شکل برابر شیشے میں دیکھتا ہوں۔ میں اس کے قابل نہیں۔ وہ کسی بڑے راجہ کی رانی ہوگی۔ پر جب تک اس کا بیاہتی نہ آجائے میں کسی ایسے ویسے کو ہاتھ لگانے دوں گا۔" بس اسی دن سے سارے تھیٹر میں ڈگڈگی بج گئی۔ کہ دیو پری پر آسکت ہے..... اور یہ دیوی جی مجھ سے اور بھی دور دور رہنے لگیں۔"

دیوی نے پھر معافی مانگنے والے انداز سے ملہی کو دیکھا، اور محسن نواب سے کہا "میں ان کے پاس اس لیے نہ پھٹکتی تھی۔ کہ میں ان کو مصیبت میں نہ پھنسانا چاہتی تھی۔ تھیٹر بھر ان کا دشمن تھا۔ جو منیجر کی نظروں سے گرا وہ سب کی آنکھوں کا کانٹا بنا۔ یہ بیچارے کبھی کبھی دیو کا پارٹ کرتے تھے نہیں تو ان کا کام تھا بڑے بڑے پردوں کا ہٹانا، سینری کا لگانا۔ ان کو وہ دوسرے ہی دن نکال دیتے......"

ملہی اکڑ کر بولا "مجھے کون نکال سکتا تھا دیوی؟ میں نے اسی دن جب منیجر نے پہلی بار پردے کے پیچھے تم سے بہکی بہکی باتیں کی تھیں، اور تم سسکتی ہوئی بھاگی تھیں اس کی گردن پکڑ کر اس سے کہہ دیا تھا۔ "اگر تم نے پھر دیوی کو چھیڑا تو تمہاری موٹی گردن کدو کی طرح توڑ کر پھینک دوں گا" وہ کہنے لگا میں تجھ کو نکال دوں گا۔ تو میں نے کہہ دیا تھا "بچہ جی، ایسا سوچنا بھی مت۔ نہیں تو تم کو مار کے یہاں سے جاؤں گا۔"

دیوی نے پھر اس تودہ سیاہ پر دو کرنیں پھینکیں۔ "جب ہی اس نے تم پر ایکٹروں سے جھوٹی چوری کا الزام لگوا کر کئی دن تھانے میں بند رکھوایا۔"

ملہی مسکرا کر بولا "میں سب کچھ سمجھتا تھا۔ اور میں نے بوڑھے سیٹھ اور پولیس والوں کو بھی اچھی طرح یہ بات سمجھا دی جب ہی تو میں چار ہی دن میں حوالات سے چھوٹ نکلا۔"

دیوی نے کہا "تم نہیں جانتے تمہارے چھوٹنے کی وجہ منی بائی تھی۔ جس دن تم نے سیٹھ سے سچی بات بتائی وہ لال انگارہ چہرہ کئے تھیٹر آئے۔ منیجر پر غصہ ہونے لگے انہوں نے جست تنی بات گڑھ لی۔ وہ میرے پتا جی بیٹھے اور منی بائی نے گواہی دی کہ سچ کہتے ہیں۔ سیٹھ تو بڑبڑاتے گھر چلے گئے، پر منی بائی نے کچھ سوچ کر انہیں سمجھایا کہ مقدمہ اٹھا ہی لینا اچھا ہے وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ تھیٹر میں منیجر کا کوئی روکنے والا نہ رہ جائے۔"

ٹھی کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دھواں سا نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی کس
لی "اچھا ہوا دیوی کہ مجھے ان باتوں کی کھبر نہ تھی نہیں تو میں سچ مچ اس پاجی کی گردن مروڑ دیتا" ـــ
یک ایسا سکوت چھا گیا جس میں طرح طرح کے جذبات ستار کے تار کی طرح بجتے سنائی دیتے تھے۔

اس مترنم سکوت کو محسن نواب کے "پھر" نے توڑا۔ وہ کہانی سننے والے بچے کی طرح انجام تک
پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ دیوی ہماری طرف [illegible] آنے کے چھ مہینے بعد تک بڑے
رام سے گزری۔ میں نے گانے اور ایکٹنگ میں [illegible] کی کہ منی بائی کو یہ ڈر لگنے لگا کہ میں اس کی جگہ
سے چھین لوں گی۔ اس نے منیجر کو پھر بھڑکایا۔ دونوں [illegible] جانے کیا طے کیا ......"

ٹھی دانت نکال کر بولا "میں جانتا ہوں دیوی [illegible] دونوں نے طے کیا، تمہیں دوسرے تھیٹر
الوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ سب ہی کو نئی کھوب صورت [illegible] ایکٹرسوں کی جرورت ہوتی ہے۔ وہ تین
ن منیجر نئے تھیٹر کے مالک سے ملا۔ پھر ان کا [illegible] ہمارے ہاں آیا۔ ایک دن مجھ سے
یک آدمی نے بتا دیا۔ کاگج (کاغذ) لکھا جا رہا تھا [illegible] بنا تھا۔ اس کو تمہاری طرف سے
ستخط کرنے کا حق تھا۔ اس نے تین سو روپیہ ماہوار تمہاری تنکھا طے کی اور ایک ہجار روپیہ اپنے
نجرانہ ......"

مجھے محسوس ہوا ایک عالی شان محل میں ایک زرد رو سسکتی ہوئی جاپانی گڑیا کو دلہن بنایا
رہا ہے۔ حریر و اطلس پہنایا جا رہا ہے۔ سونے اور جواہرات سے لادا جا رہا ہے اور اس کے باہری حصہ میں
بوڑھے بیٹھے کابین نامہ تیار کر رہے ہیں، مہر پر بحث ہے، پاندان کا خرچ طے کر رہے ہیں ـــ میں باطنی
نکھوں سے ازدواجی زندگی کے بازار کا مول بھاؤ دیکھتا رہا۔ کان سنتے رہے "..... میں دوڑا ہوا مالک
کے پاس گیا۔ اس سے ساری باتیں کہہ دیں۔ وہ بہت کھسیانا ہوا۔ منیجر کو بلا کے کہا۔ ایسا معاملہ ہوگا تو میں تم کو
ں نکال دوں گا۔ اب منی اور وہ دونوں پریشان ہو گئے۔ پھر منیجر نے کچھ سوچ کے منی بائی سے کہا۔ تم سیٹھ
ہ جا کے ملو۔ وہ کبھی جب سیٹھ جوان تھا اس کی چہیتی رہ چکی تھی۔ وہ وہاں گئی تو میں اپنی ہے دی کو بھی
اس کے پیچھے ہو لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا منیجر کیا چال چلا ہے۔ اس دن دیوی کے سر میں درد تھا۔ اس
نہیں کوئی دوا دے دی تھی۔ یہ سو گئیں جب میں منی بائی کے پیچھے ہو لیا تو منیجر نے کھوب شراب پی
ن کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ تو کہئے بھگوان کو بچانا منجور تھا کہ میں نے جب منی بائی کو سیٹھ

کے ساتھ دیکھ لیا تو میں جلد ہی پلٹ آیا۔ میرا دل کھُد دھڑک رہا تھا۔ میں جیسے ہی ان کے کمرے کے
پاس پہنچا میرا دل آپ ہی آپ چاہنے لگا۔ میں ان کی کھیریت پوچھتا چلوں۔ میرے پکارنے پر انہوں نے
کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اور جور سے پکارا۔ سب ایکٹرسوں نے اپنا اپنا دروازہ کھول کے پوچھا کیا بات
ہے ایک نے ہنس کے کہا ابھی ابھی مینجر اندر گیا ہے۔ بس مجھ پر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے دروازے پر
پورے جور سے لات ماری۔ سٹکنی ٹوٹ گئی، دروازہ بھڑ سے کھل گیا۔ میں نے دیکھا مینجر اپنے آدھے
کپڑے اتار چکا ہے۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ اور ایک طمانچہ مار کر اسے کمرے سے ڈھکیل دیا"
وہ دیوی کی طرف مڑ گیا "تم اسی طرح بے کھبر سو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے تمہارے کمرے کی صراحی
تم پر انڈیل دی۔ تم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھیں۔ میں نے جی میں کہا، شکر ہے، بال بال بچیں" وہ پھر محسن
نواب کی طرف مڑ پڑا "پر مینجر نسے (نشے) میں تھا اس کے سر پر کھون سوار تھا۔ وہ جمین پر سے گر کر اٹھا
تو گالی بکتا اپنے کمرے میں لپکتا گیا اور وہاں سے بندوک میں کارتوس لگا کر لئے ہوئے پلٹا۔ جیسے مجھے
مار ہی ڈالے گا......" دیوی نے اس کوہِ طور پر بہلانے والا نہیں بلکہ جلانے والا صاعقہ گرایا۔ وہ بات
کاٹ کر بولی "جھوٹ نہ بولو دیو، وہ مجھ کو مارنا چاہتا تھا۔ بار بار کہتا تھا نہ رہے بانس نہ بجے گی بانسری
اس نے نشانہ بھی مجھ ہی پر لگایا" سورج مشرق سے چل کر مغرب میں پہنچا۔ وہ ہم لوگوں کو مخاطب کر کے
بولی "انہوں نے اپنا اپنا ہاتھ نال پر رکھ دیا اس نے لبلبی دبا دی۔ ان کا ہاتھ اڑ گیا۔ ادھر یہ تو
خون سے نہائے ہوئے اس کو ڈھکیلتے ہوئے زمین پر گرے، ادھر وہ بندوق اور ان کے جھٹکے سے لڑکھڑاتا
ہوا کٹھرے پر گرا اور وہاں سے نیچے......" ہم لوگوں نے ذرا تعجب سے اس کا منہ دیکھا۔ وہ بولی "ہم لوگ
ایک بڑی کوٹھی کی تیسری منزل پر رہتے تھے۔ کمروں کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اور اس کے بعد لوہے
کی ریلنگ۔ کوٹھی پرانی تھی۔ ریلنگ ہلتی تھی۔ مینجر خاصا موٹا تازہ آدمی تھا۔ پورے زور سے جو اس پر
گرا تو ریلنگ ٹوٹی اور وہ نیچے گرا اور ٹھنڈا ہو گیا......" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے کانپنے لگی

محسن نواب بے ساختہ بول اٹھا "خس کم جہاں پاک"!

ملہی دیوی کے کانپتے ہوئے جسم کو بڑی محبت سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "ارے اچھا ہی تو ہوا
اس کا اب افسوس ہی کیا ہے؟" دیوی نے پہلی بار تیکھی چتونوں سے ملہی کو دیکھا۔ جس دل میں جذبۂ تشکر
پرستش کی صورت اختیار کر سکتا ہے، اس میں انتقام کی جگہ مشکل سے نکل سکتی ہے۔ دیوی کی یہ نظر آئی

لطیف جذبے کی طرف سے ایک طرح کا احتجاج تھی۔ یا اس احساس تفاوت کا ثمرہ جو دیوی کے ہاں غیر شعوری طور پر موجود تھا۔ وہ جب سے گاؤں میں آئی تھی اور ملہی کی پجارن بنی تھی، آج پہلی بار اسے دو مہذب آدمیوں سے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ پچھلی زندگی کے وہ لمحے جن میں اسے اپنے افسانے کے ایسے ٹکڑے بھی یاد آ رہے ہوں گے، جن میں وہ سچ مچ کی دیوی رہی ہو گی جن میں وہ شمع کی مانند پروانوں سے گھری رہی ہو گی۔ ماضی کا حال سے تقابل جاری ہو گا۔ میں تحلیل نفسی ہی میں الجھا ہوا تھا کہ محسن نواب نے ایک "پھر اور واقعی"۔

ملہی بولا "پولس آئی، مجھے باندھ لے گئی۔ وہیں ہسپتال بھیجا گیا۔ تین مہینے وہاں پڑا رہا۔ گنده بلا، دیوی نے گہنا پاتا بیچ کر پیروی کی۔ میں بے داغ چھوٹا۔ یہ ایک قدر بیمار پڑ گئیں۔ ان کا علاج کرایا۔ پھر یہاں لے کر چلا آیا۔"

محسن نواب کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی ساتھ دیا۔ وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ محسن نواب نے بڑی بے پروائی سے پوچھا "اب تو آنند ہی آنند ہے؟"

دیوی نے ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ ملہی نے کھیسے نکال کے کہا "آپ کی دیا ہے"

ہم لوگ گھر کی طرف مڑے کچھ دور چل کر ناگ پھنی کے پتے پر میری نگاہ گئی۔ کنول کی طرح ڈنٹھل سے ہل گیا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ محسن نواب نے زمیندارانہ ٹھاٹھ سے اور میں نے بڑے احترام سے جواب دیا۔ ایسی ہر چیز جو جان کی بازی لگا کر لے، قابل احترام ہوتی ہے — چند قدم چل کر مجھے خیال آیا۔ میں نے ملہی سے پلٹ کر پوچھا "چڑیوں کا گوشت پسند ہے؟" وہ جھینپ کر ہنسا "جب سے گاؤں آئے دیوی جی کو گوشت نہیں ملا" میں نے دو چڑیاں جھولے سے نکال کر زمین پر رکھ دیں۔ لپکتے بید کی طرح دیوی ان پر جھپٹی، مگر انہیں خون میں تر دیکھ کر جھجکی۔ حرص و رحم دلی کا یہ سنگم ہم نے دیکھنا مناسب نہ سمجھا، ہم چل کھڑے ہوئے۔ لطف رہتے سکوت سے کٹا۔ محسن نواب نے اسے یوں توڑا "ہمارا کالا دیوا بھی چیز اڑا لایا" مجھے اس کی یہ تمردانہ بات پسند نہ آئی اس میں مربیانہ جھلک تھی، اور رقیبانہ رشک بھی۔ جیسے بھی چیز کا استحقاق صرف اسی کو ہے۔ میں نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا "ملہی بھی انسان ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا "مجھے اس میں ذرا شک ہے۔"

نہ جانے کیوں میں جھلاتا جا رہا تھا : "دیوی اس کو ہمارے تمہارے جیسے انسانوں سے بالاتر سمجھتی ہے"
وہ جھٹکے سے گردن ہلا کر موضوع بدل کر بولا " وہ اب تک اسے بڑی بلندی سے دیکھ رہی ہے
اس نے مٹی کے پتلے کو راجہ اندر کے سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے ، لیکن جہاں مشابہت ، اور حقیقت میں زور
کی ٹکر ہوئی اور یہ شیشہ کا محل چور چور ہو جائے گا ......"
میں نے ترش ہو کر کہا " اچھا، آپ تو ہوا میں محل نہ کھڑے کیجئے ! "
وہ ہنسا " نہیں ۔ فی الحال تو مجھے یہ فکر ہے کہ ملی نے اپنا جھونپڑا بھی اس قابل بنایا ہے کہ
نہیں کہ اس میں اس کی دیوی کچھ دنوں ٹک سکے "
میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھ کے پوچھا "کیا اپنے گھر کا کونا دینے کا ارادہ ہے ؟"
وہ یا جی دفعتاً متین بن کر بولا " تم یقین رکھو وہ میری بہو ہے ۔ میں نے جسے ایک بار چھوٹا
کہہ دیا اسے کبھی بھی برابری کا درجہ نہیں دے سکتا "۔۔۔
ہم لوگ گاؤں پہنچ گئے ۔ دیکھا تو " ٹھانے " پر بیسیوں آدمی جمع ہیں ۔ میں گھبرا سا گیا ۔
کوئی فساد ہوا ، کوئی ہنگامہ کھڑا ہو گیا ، کیا بات ہے کہ اس کام کاجی گاؤں میں اتنے آدمیوں کو بیک
وقت فرصت مل گئی ۔ مگر جسے دیکھتا ہوں ، وہ سر گرداں ہے ۔ محسن نواب کو جھک جھک کر سلام کر
رہا ہے ۔ میں اس معاملے کی تہ کو جلدی نہ پہنچا ، مگر وہ اپنے آدمیوں کو خوب پہچانتا تھا ۔ ہنس کر بولا ۔
" میں تمہاری چالیں سب سمجھتا ہوں بسلام روستائی بے غرض نیست ! ، یہ شکار میں حصہ لگانے
کے انداز ہیں ! " وہ میری طرف پلٹ پڑا ۔ انگریزی میں بولا " دیکھتے ہو ان غریبوں کی حالت ۔ نہ
تو اس گاؤں میں قصاب ہیں اور نہ ان کے پاس اتنے پیسے کہ یہ گوشت خرید کر کھائیں "
میں نے کہا " پھر انہیں کو بانٹ دو ۔ محنت سوارت ہو جائے گی "۔
میں اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ محسن نواب چڑیاں بانٹتا رہا ۔ میں نے غسل کیا ، کپڑے بدلے اور
محسن نواب کے ساتھ کھانا کھا کر اسی دن شہر چلا آیا ۔
نیا وکیل نہ تو زیادہ دن اپنے مستقر سے غائب رہ سکتا ہے اور نہ اپنے کام سے غافل ۔ اسے
مقدمے تیار کرنا پڑتے ہیں ۔ اجلاسوں میں بے وجہ بھی حاضر رہنا پڑتا ہے ۔ شام کو کسی ایسے کلب میں جانا پڑتا
ہے ، جہاں ڈپٹی صاحبان منصف صاحبان جاتے ہوں ۔ بڑے وکیلوں کے ہاں بھی حاضری دینا پڑتا ہے کہ

اور موکلوں کے پھنسانے اور خوش کرنے کی متعدد صورتیں بھی نکالنا پڑتی ہیں۔ چناں چہ میں واپس آتے ہی تیلی کے بیل کی طرح اپنے چکر میں جُت گیا۔ ایسے میں نہ دیوی اچھی طرح یاد آسکیں، نہ دیو کا خیال ستا سکا۔ ہاں، کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں دماغ میں کہکشاں جیسی ایک ٹیڑھی میڑھی چمکتی لکیر سی بنتی اور ایسا جان پڑتا جیسے پری اڑتی ہوئی ستارے کو جگمگاتی ہوئی نکل گئی۔ دل میں ایک پر کیف کشمکش سی محسوس ہو کر رہ جاتی اور میں ٹھنڈی سانس بھر کر کوئی قانونی نظیر ڈھونڈنے لگتا! —

ایک دن جب میں کچہری سے واپسی پر سائیکل پر سوار، آہستہ آہستہ تھکا ماندہ چلا آرہا تھا تو دفعتاً ایک موڑ پر مجھے ملہی نظر آیا۔ کرتا دھوتی پہنے۔ مگر کمر میں رسی بندھی ہوئی، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئیں، پولس والے ساتھ ساتھ! میں سائیکل سے کود پڑا۔ میں نے سپاہیوں سے پوچھا "ارے اسے کیوں گرفتار کیا بھائی؟" ایک بولا "اجی تاڑی خانے میں یہ پی کر آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے کئی کے سر توڑ دئے"!

ملہی جھوم کر بولا "ایے کہہ تت۔ توری۔ یا۔ رم دیوایں! دیو! کچ کچا چ چبا ڈا، ڈالیں گے! آں! ام!........"

سپاہی نے رسی پر جھٹکا دیا "چل بے دیو، چل! پری کے پاس چل!" اور وہ دونوں سکّہ کوتوال شہر کے بالوں سے چھپے ہوئے چہرے کا تصور کر کے ہنستے ہوئے چلے گئے۔ اور میں سائیکل پر بیٹھ کر اپنا فرض اور پری کے جذبات و حالات دریافت کرنے کے طریقے سوچتا گھر پہنچا۔

وہاں دیکھتا ہوں تو محسن نواب بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے اسے فوراً دیو کی روداد سنائی، وہ بولا "یہ تو ایک دن ہونے والا ہی تھا!"

میں نے گھبرا کر پوچھا "کیوں؟"

وہ کہنے لگا "تم تو بعض وقت بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ملہی کو آخر کیا حق تھا کہ وہ دیوی جیسی حسینہ و جمیلہ آرٹسٹ سے تنہا فائدہ اٹھائے؟"

میں نے غصہ کو ضبط کر کے سوالیہ انداز میں عرض کیا "میں اب بھی آپ کا مطلب نہ سمجھ سکا"

اس نے میرے تکلف آمیز انداز سوال پر مجھے بغور دیکھا پھر بڑی متانت سے کہا۔ وہ عورت ہے۔ اس حیثیت سے ایک مرد کی بیوی بن سکتی ہے۔ گو اسکی شوہریت کا حق، کوئی جمالیاتی قانون، ملہی کے

سے بد قطع جاہل کو نہیں دلوا سکتا"

میں نے آہستہ سے پوچھا "محبت؟"

اس نے کہا "محبت ابتدا ہی میں اندھی ہوتی ہے۔ وہ کچھ دنوں کے بعد دیکھتی ضرور ہے۔ گورا چٹا رنگ، درست ناک نقشہ، سڈول ہاتھ پاؤں، ہنسی کا انداز، طرز تکلم، نشست و برخاست، وضع قطع، گھر کے اصول، رہنے کی جگہ، وجاہت، مرتبہ اور وقار! ۔ اور وہ آہستہ آہستہ خاموشی سے ماضی کا حال سے مقابلہ کرتی ہے۔ اور پھر اپنے کو اور محبوب کو دو پلڑوں میں رکھ کر بار بار تولتی ہے۔ اگر اس کا پلہ بھاری نکلا، مطمئن ہو جاتی ہے۔ سودا اچھا کیا، واقعی چاہنے کی چیز ملی۔ اگر اپنا پلہ بھاری نکلا، محسوس ہوا، دھوکا کھایا، غلطی کی! ......"

میں نے جل کر کہا "تم تو اس طرح بیان کر رہے ہو جیسے تم نے دیوی کو یہ سب سوچنے میں مدد دی ہے"

وہ آنکھیں چمکا کر بولا "ہاں میں نے یہ نیک کام ضرور کیا۔ دیوی بلی کی بیوی نہ تھی، محبوبہ تھی وہ اس کا معشوق نہ تھا، محسن تھا۔ میں نے اس کے اغوا میں صرف اتنا حصہ لیا کہ بمبئی کے اخباروں کو یہ خبر بھیج دی کہ مشہور ایکٹرس دیوی اب صحرا نہ میں رہتی ہے۔ چوتھے ہی دن سے دیوی کے پاس خطوط آنا شروع ہو گئے خدا کے لئے اسٹیج پر پھر آئیے۔ تھیٹر والے پھر دوڑنے لگے۔ فلم کمپنیوں نے لاکھوں کے کنٹریکٹ کی بات چیت شروع کر دی۔ اسی زمانے میں برسات شروع ہو گئی ......"

میں نے الجھ کر کہا۔ "دیوی کی فرار سے برسات کا کیا تعلق؟"

وہ بولا "سبحان اللہ! ۔ تم شاید سمجھتے ہو گے۔ برسات کے معنی ہیں: رم جھم بدریا برسے! یعنی گانا ہوتا ہو گا۔ جھولے پڑے ہوں گے، پوریاں تلی جاتی ہوں گی، آموں کا ٹپکا لگا ہو گا، کوئل کوکتی ہو گی، کوندے کی لپک سے کوئی ڈر کر اس طرح آغوش میں چھپتا ہو گا کہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہو گا۔

"الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے!" لیکن حضرت ہندستانی دیہات کی برسات۔ بلی کے گھر کی برسات ایسی نہیں ہوتی۔ وہاں چھتیں چھلنی ہوتی ہیں۔ چھپر ٹپکتے رہتے ہیں۔ باہر پانی ہے، صحن میں پانی ہے، دالان میں پانی ہے، اندر پانی ہے، نیچے پانی ہے۔ اوپر پانی ہے! چولھا نہیں جلتا، اُپلے بھیگ گئے ہیں، دھواں گھٹ رہا ہے۔ آنکھوں سے مینہ جاری ہے، کپڑے بھیگے ہیں، بستر بھیگا ہے، پلنگ بھیگا ہے۔ جانور چلا رہے ہیں، اس کونے میں سانپ پھنکاریاں مار رہا ہے۔ اس گوشے میں بچھو رینگ رہا ہے۔ کہیں گھبرا کر

باہر نکلے تو گھٹنوں تک پانی ہے۔ میلا، گندا، بدبودار!" وہ ایک گرمائے ہوئے مقرر کی طرح ذرا دیر اثر بڑھانے کے لئے رکا، پھر جذبات ابھارنے والے انداز میں، سرگوشی کی آواز میں بولا "ذرا اس دنیا میں گھری ہوئی پری کا خیال کرو۔ سچ مچ مٹی کی بوتل میں مقید تھی! ایک طرف تو یہ نجس میلا کھانے والا منڈیلا، دوسری طرف وہ موتی چگنے والا ہنس! ایک طرف ملی کے کچے ٹپکتے گرتے مکان میں اپنے ہاتھوں روتی ٹھونکنا، دوسری جانب بمبئی میں راج بجنے کا خیال۔ جھونپڑوں میں محلوں کے خواب۔ ہر روز ان کی تعبیریں، کبھی تار کی صورت میں، کبھی خط کے لباس میں، کبھی موٹر کے جامے میں۔ نوٹ کے بڑے بڑے گدّے باصرار ٹھنسے جا رہے ہیں، مخمل و حریر پہننے کا لالچ دلایا جا رہا ہے۔ موٹروں پر بٹھا کر تفریح کرائی جا رہی ہے۔ جذبۂ تشکر کہاں تک ساتھ دیتا؟ ایک دن جب میاں ملی گھٹنوں تک کیچڑ میں کھڑے کھیت گوڑ رہے تھے۔ وہ ایک رولس روائس پہ بیٹھی اور بمبئی چلی گئی!"

میں نے گھبرا کر پوچھا "اور ملی؟"

وہ ہنسا "وہ تو مجنوں ہے۔ کئی دن منہ لپیٹے پڑا رہا۔ پھر جو اٹھا تو تاڑی پر مکھی کی طرح گرا۔ تن و توش کے لحاظ سے قدح نوش ہے۔ غم کے خم چڑھا جاتا ہے، اور خوب اول فول بکتا ہے۔ گاؤں والوں کی زندگی دشوار کردی ہے اس نے۔ معلوم ہوتا ہے آج کسی کے ساتھ شہر تک بہک آیا۔ یہاں جاننے بوجھنے لوگ نہ تھے، پولس نے حوالات دکھائی!"

میں نے کہا "اور تم شاید اسے وہیں سڑنے دوگے!"

وہ بولا "ہرگز نہیں۔ میں اس کا باپ ہوں ......"

میں تب بولا "رقیب نہیں کہتے!"

وہ منہ بنا کر بولا "اچھے لڑکے بری باتیں زبان پر نہیں لاتے ....."

مجھ سے خاموش نہ رہا گیا "ہاں، وہ صرف دل میں برے برے خیالات رکھتے ہیں ...."

وہ بولا "تم چاہے جو کچھ کہو، میں ملی کو چھڑا کر کل ہی اپنے ساتھ سمراتہ لے جاؤں گا۔ اور ..."

میں نے بات کاٹ کر کہا "لیکن اس کی دیوی سے اس کو نہیں ملاؤ گے!"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اوں ہونہہ! وہ پھر اسے دیوی بنا کے اپنے گندے ستی کے طاق میں رکھ لے گا، اور دنیا اس پری کے حسن، اس کی موسیقیت، اس کی ایکٹنگ سے محروم ہو جائیگی۔

"یہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے ظلم ہے" میں نے جھلا کر کہا "خدا غارت کرے تمہاری جمالیات کو" وہ بولا "تم بت پرست ہو" اور سیکل پر بیٹھ کر ہنستا ہوا چلا گیا۔

یوسف ظفر

بزدل

مجھے روکا ہے بہاروں کے شرر پاروں نے
اور افسردہ نظاروں نے خزاں کے بل پر
کبھی تاروں نے کبھی کانپتے سیاروں نے
زندگی ایک فسانہ ہے انہیں باتوں کا —
رُکتے رُکتے اسی محور پہ ہوں اب تک کہ جہاں
مجھے افسونِ تحیّر کبھی لے آیا تھا
تیری نظروں نے مجھے روک کے سمجھایا تھا —

تیری نظروں میں الجھ کر مری امیدوں نے
چاندنی راتوں کے سیلاب کو پایاب کیا
تیرہ و تار اندھیروں کو سحر تاب کیا
اپنے قدموں پہ نظر جب بھی نہ تھی اب بھی نہیں
اب نگاہوں کی فسوں میرے تصوّر پہ نہیں
اب کوئی یاس نہیں، آس نہیں، پاس نہیں —

ہر طرف مردہ نشاں قدموں کے فسانہ خواں
ہر طرف ڈوبتے نغموں کے سیہ سائے رواں
وقت کے ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسّم لرزاں —

چلتے چلتے مجھے ہر بار یہ محسوس ہوا،
کہ مجھے کوئی پکارے گا، کوئی بولے گا
میری مایوس نگاہی کی گرہ کھولے گا
لیکن اس رات کے خاموش اندھیرے میں بھلا
کسے آنا تھا یہاں کون یہاں آئے گا

ہر قدم پر مجھے دیوار نظر آتی ہے
ہر قدم سہما ہوا رکتا ہوا بڑھتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ یہ پھیلی ہوئی دیوارِ حیات
توڑ بھی سکتا ہوں میں پار بھی کر سکتا ہوں
ایک ہی نغمہ تو ہے میرے لبوں پر رقصاں
اسے ان مایوں میں سونے کے لئے پھیلا دوں
ایک ہی شعلہ تو ہے میری نظر میں حیراں
اسے اک خوابِ پریشاں کے لئے پھیلا دوں

سوچتا ہوں کہ اگر کچھ بھی نہیں میرے لئے
ایک سانس اور نہ آئے گی تو سو جاؤں گا
تو پھر اک سانس بھی وابستۂ ہستی کیوں ہوا۔

(۳)

رکتے رکتے اسی محور پہ ہوں اب تک کہ جہاں
مجھے افسونِ تحیّر کبھی لے آیا تھا ——

منزلیں پھیلتی جاتی ہیں، سحر آتی ہے
زندگی! اٹھ کہ مجھے دیر ہوئی جاتی ہے

رشید احمد صدیقی

اپریل فول

ابھی ابھی اناؤنسر صاحب نے میرا تعارف آپ سے کرایا ہے۔ یہی یہاں کی ریت ہے۔ اس ریت کو آج شاید اس لئے اور ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کہیں آپ مجھے پہچاننے میں چُوک نہ جائیں۔ اور اس طور پر آپ خود پہچانے جائیں۔ آج کا دن دیکھتے ہوئے کیا تعجب اس وقت ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا ہوتا تو آپ نہایت خوش ہو کر اپنے احباب اور اعزا کو یہ مژدہ سناتے کہ رشید صاحب کی ذات یا زندگی کا یہ روشن پہلو ریڈیو والوں ہی کے ذریعے نمایاں ہوا!! میں اناؤنسر صاحب کی احتیاط یا عقلمندی کا اعتراف شکر گذاری کے ساتھ کرتا ہوں کہ میرے اور آپ کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتے ہیں!

ہر شخص کو ہر شخص نہیں پہچانتا۔ غالب نے اپنے زمانے میں اس وقت کو محسوس کر لیا تھا اسی لئے وہ ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور چل لیتے تھے۔ اور اسے پہچان کر واپس آ جاتے تھے۔ غالب کی اس حرکت سے لوگوں نے راہ چلنا چھوڑ دیا تھا۔ بالآخر غالب نے اپنی یہ عادت ترک کر دی۔ مگر پہچاننے کی لت انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ کیسے جا سکتی تھی۔ اب لوگوں نے بے وقوف پہچاننے کے کچھ اصول وضع کر لئے ہیں۔ بیوقوفوں کو شمار کر کے مختلف خانوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ اب دنیا میں کوئی بے وقوف ایسا نہیں ہے۔ جو کسی نہ کسی منزل میں نہ پہچان لیا جائے۔ بے وقوفوں کے اعزاز میں ایک دن مقرر کیا گیا ہے۔ جب ہر شخص اس کے درپے ہوتا ہے۔ کہ وہ ہر بے وقوف کا پتہ لگائے۔ وہ دن آج کا دن ہے۔ اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ بے وقوف ہونا کوئی برائی ہے۔ بے وقوف نہ ہوں تو دنیا کا کاروبار معطل ہو جائے۔ بڑے لیڈر اور بڑی حکومت پہچانی ہی اس اعتبار سے جاتی ہے کہ اس کے تصرف میں کتنے احمق ہیں۔ اپریل فول کے عالمگیر تیوہار کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی ایسے تیوہار ہیں جب بے وقوف آپے میں نہیں رہتے۔ اور تفریحاً ایک دوسرے کا سر پھوڑتے ہیں۔ بعض لوگ دن رات میں صرف ایک خاص ساعت میں کھوئے جاتے ہیں۔ وہ وقت آیا نہیں اور یہ ہاتھ سے بے ہاتھ

ہوئے ہیں۔ بعض اپنے وطن مالوف سے پہچانے جاتے ہیں۔ بہتوں کی شناخت محض ان کے حلیے سے ہو جاتی ہے۔ بیشتر سیاسی نعروں یا اشتہاری دواؤں سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ میں نے ان تمام لوگوں کی فہرست نہیں دی ہے۔ جن کو پہچاننے کے لئے میں اس وقت مامور کیا گیا ہوں۔ اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس زمرے میں آپ نہ آ جائیں۔ اور میرے آپکے تعلقات ویسے نہ رہیں جیسے کہ میں اور جیسے ہیں وہ ظاہر ہے بقول شخصے "ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں"!!

لیکن اک ذرا ٹھہرئے گا۔ میں یہاں بہک گیا ہوں۔ یہ میری بڑی بُری عادت ہے۔ اس مصرعہ یعنی "ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں" کی یہاں بالکل ضرورت نہ تھی۔ یہی نہیں کہ یہاں قطعاً بے محل ہے، بلکہ اس کا مفہوم بھی اب Out of date ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اپنا حق بخشوا چکا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسا ادب ہے جہاں منہ کھولنا بے ادبی ہے۔ منہ کھولنے کی مخالفت یقیناً بورژوا ذہنیت ہے یعنی عوام اپنا دکھ درد نہ کہہ سکیں یا روٹی نہ پا سکیں نہ کھا سکیں۔ اس قسم کا ادب، نہ ادب برائے ادب ہے اور نہ ادب برائے زندگی۔ یہ ادب صرف "ادب برائے بندگی" ہے: جو ہر پرولتاری عہد میں کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا، خواہ اپریل کی پہلی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے اور بھی کہ پرولتاری عہد میں کونسا دن اپریل کی پہلی نہیں ہوتا۔!!

اس مصرعہ سے قطع نظر میرے ذہن اور زندگی کی تقدیر یا پرداخت ہی ایسی ہوئی ہے۔ کہ غیر متوقع مصرعے، ور مہمان آتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ آ جاتے ہیں تو ان کو نباہنا ہی پڑتا ہے۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ مصرعے ہمیشہ دوسروں کے اور مہمان صرف میرے! لیکن دونوں ہوتے ہیں بے ساختہ! کبھی کبھی آبرد باختہ بھی! رہی میری یہ جواب دہی کہ جب آ جاتے ہیں تو ان کو نباہنا ہی پڑتا ہے۔ وہ میری کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن ہم سب میں کمزوری نہ ہو تو، اپریل فول کی رونق کہاں!

مجھے اس کا اعتراف ہے۔ کہ اب تک میں نے براہ راست اپریل فول سے کوئی سروکار نہیں رکھا اسے بھی اپریل فول کا تصرف سمجھئے۔ لیکن آپ پر اس کا تصرف نہ ہوا ہو تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ کہ اس دنیا کا کونسا کام اپریل فول سے خالی ہے۔ بن جانسن نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ دنیا چند اجتماعی حماقتوں کا نام ہے۔ اس حقیقت کا احساس کیوں کر ہوا اور کب ہوا۔ یہ مجھے معلوم

نہیں۔ ممکن ہے بن جانسن کو معلوم رہا ہو اور چونکہ انہوں نے اس کو صیغۂ راز میں رکھا اس لئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ان کو اپریل کی پہلی کو ہوا ہوگا۔

حماقت کرنا انسان کا فطری حق ہے، اس لئے خطرناک بھی۔ البتہ اس حق کو دنیا سے منوانے کا سہرا جس احمق کے سر رہا ہوگا میں تعظیماً اس کے سامنے یا اس کے اعزاز میں اپنی ٹوپی اتارتا ہوں تعظیماً اپنی ٹوپی اتارنا مغربی تہذیب کا دستور ہے۔ ہمارے ہاں پگڑی اچھالی جاتی ہے۔ تعظیماً نہیں تعزیراً۔ یہ میں اس لئے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج کے دن آپ کو یہ سب پیش آئے گا۔ کوئی آپ کی پگڑی اچھالے گا۔ اور کسی کی ٹوپی آپ لے بھاگیں گے۔ احمقوں کا ہم پر احسان ہے، کہ جو حق ایک طور پر ان کے لئے محفوظ تھا۔ انہوں نے ہم سب کے لئے عام کر دیا۔ احمقوں کا یہ احساس جمہوریت، جمہور کا احساس حماقت بن گیا۔ حماقت کی عظمت صرف انسانوں کے ذہن میں آئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس طرح کی باتیں آپ کو راس نہ آئیں گی۔ اپریل کی پہلی کو اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دن آپ کا کوئی دوست ایسا نہ ہوگا۔ جس نے آپ کی خبر نہ لی ہوگی اور اگر یہ واقعہ ہے کہ آپکے کسی دوست نے آپسے التفات نہ کیا تو یقین جانئے کہ آپکے دوستوں سے زیادہ قابل رحم کوئی اور نہیں۔ بہرحال میں آپ کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوست دشمن دونوں اس وقت آپکے درپے ہوں گے۔ اگر آپ ان کی شوخی یا شرارت کے شکار ہو جائیں یا ہو چکے ہوں تو میرا قیمتی مشورہ یہ ہے کہ آپ رو میں نہیں بلکہ ہنسیں، دوسرے کی حماقت پر سب ہنستے ہیں۔ اپنی حماقت پر ہنسنے کی عادت ڈالئے پھر آپ دیکھیں گے آئندہ سال اپریل کی پہلی کو آپ صبح سویرے سو کر اٹھیں گے۔ تو میں میں کچھ ایسے معلوم ہوں گے۔ جیسے "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" اگر شرماتا آپ پر صادق نہ آئے تو آپ کو اس قافیے میں اور بہت سے لفظ مل جائیں گے، کوئی اور رکھ لیجئے۔ ہماری شاعری میں یہی تو کمال رکھا گیا ہے کہ قافیہ بدلتے جائیے غزل بنتی جائیگی۔

عام طور پر اپریل فول میں یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے کسی دوست کو جو آپ پر بھروسہ کرتا ہے کوئی ایسی بات بتا دیتے ہیں کہ وہ گرتا پڑتا کسی مہم پر روانہ ہو جاتا ہے، اور بعد میں اپنی غلطی محسوس کرتا ہے۔ تو نادم ہوتا ہے، اور آپ تالیاں بجاتے ہیں۔ یا آپ کوئی افواہ اڑا دیتے ہیں جس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اس کو انگریزی میں احمق کی مہم یا احمق کی دوڑ بھاگ کہتے ہیں!

لیکن اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کے لطیفے اپریل فول ہی تک محدود نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ حماقت اس دن سے چلی آرہی ہے۔ جب عقل کا پہلے پہل انکشاف ہوا ہنگامۂ ہستی کی ساری تگ و تاز اسی دہشت یا حماقت کی بنا پر ہے۔ کسی نے کوئی بات کہدی اور احمق اسے لے بھاگے۔ اس دلی میں فتح پوری کے سامنے کھڑے ہو جائیے۔ مرد، عورت، بچہ جوان، بوڑھا، امیر، غریب، تانگہ، موٹر، بدحواس ادھر اُدھر آتے جاتے، گرتے پڑتے، دوڑتے بھاگتے، نظر آئیں گے۔ اگر آپ ان کو روک کر اس وحشت کا سبب پوچھیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی پیمانے پر اپریل فول میں مبتلا ہے

اگر آپ چپکے سے یوں ہی کہدیں کہ آج شام کو مسجد فتحپوری میں موسیو کلاک ٹاور باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے تشریف لائیں گے۔ تو دلی کی ساری خلقت جس میں نمازی کوئی نہ ہوگا ٹوٹ پڑیگی اور یہ کوئی نہ پوچھیگا کہ موسیو نے وضو بھی کیا ہے یا نہیں۔ جو لوگ کلاک ٹاور سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتے، وہ کلاک ٹاور کے جلوس میں شرکت کریں گے۔ اور احتیاطاً جلوس کے رستہ کے دو رویہ مکانوں کی چھت یا چھجے پر اینٹ پتھر بھی جمع کریں گے۔ کہ جلوس میں کسی قسم کی بدامنی نہ پھیلنے پائے ممکن ہے کہ مسجد فتحپوری کا دروازہ کلاک ٹاور میں نہ سما سکے تو توہین مذہب کا الزام لگا کر کلاک ٹاور کو آگ لگا دی جائے۔ اخبارات میں یہ خبر دی جائے گی کہ برطانوی وزرا نے کلاک ٹاور کو انٹرویو دینے سے معذوری ظاہر کی اس لئے کلاک ٹاور نے وقت بتانے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے نہ مسلمانوں کو نماز کا وقت معلوم ہوسکا اور نہ ہندوؤں کو باجہ بجانے کا موقع ملا اس لئے ہندو مسلمانوں میں بلوہ ہوگیا۔ موقع پر قابو پالیا گیا ہے۔ اور اس کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ کہ آئندہ ہندو مسلمان کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے کلاک ٹاور کے مذہبی رجحانات میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو احتیاطاً اور اخلاقاً کلاک ٹاور سے بھی اس کی ضمانت لے لی گئی ہے۔ کہ آئندہ سے وہ فریضۂ عبادت ادا کرنے کے لئے باری باری مسجد، مندر، گردوارہ اور گرجا، جایا کریں۔ ضمانت کی رقم جمع کرنے میں ہر مذہب کے پیروؤں نے بڑی فراخ دلی سے حصہ لیا۔ بعد کی خبر ہے کہ دہلی میونسپالٹی نے کلاک ٹاور سے گفتگو کر کے یہ طے کر دیا ہے۔ کہ جب تک ٹریفک کا معقول انتظام نہ ہو کلاک ٹاور مذہبی رسوم بجالانے کے لئے اونگھتے ہوئے تشریف لے جایا کریں۔ بلکہ ان کے لئے ہر

چہار طرف ہر طرح کی عبادت گاہیں تعمیر کرادی جائیں گی۔ ان کا جب جی چاہے کسی عبادت گاہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ میونسپل قانون میں ایک بائی لا کا اضافہ کر دیا گیا ہے کہ کلاک ٹاور کے ہر چہار طرف دور دور تک نہ کوئی عمارت بنائی جائے اور نہ کوئی عمارت رہنے دی جائے اس لئے کہ معلوم نہیں کب کلاک ٹاور عبادت کرتے کرتے ایٹم بم کی خاصیت پیدا کر لیں اور دہلی میں یہ کاری اور سیہ بازاری دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے ــ بعد کی خبر ــــ کلاک ٹاور نے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک دولت مند بدتمیزوں کو فرسٹ اور سکینڈ کلاس کا غسل خانہ استعمال کرنے کا سلیقہ نہ آجائے گا۔ وہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک صحیح وقت بتا سکیں گے!!

میرے ایک دوست ہیں جن کا اس پہ فخر ہے کہ وہ کبھی اپریل فول نہ بنے اور نہ بنائے جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اپریل فول ہونے کے لئے ان کا اتنا ہی بیان کافی ہے۔ لیکن ان کی دیرینہ خدمات اور ان کی اس آرزو کا خیال کر کے ان کے اس چیلنج کو قبول کر لیا گیا اور ان کو نوٹس دے دیا گیا کہ اپریل کی پہلی کو ان کو قدم قدم پہ اپریل فول بنایا جائے گا۔ اب ان کو اس پہ اصرار ہوا کہ اپریل فول بنانے کا سلسلہ کب سے شروع ہو گا اور جائے وقوع کیا ہو گی۔ اور جب ان کو بتایا گیا، کہ دیکھئے نہیں ابھی سے شروع ہو گیا تو کہنے لگے، خوب میں سمجھ گیا۔ لیکن اس کا عمل تو کل سے شروع ہو گا اب یہ بتائیے کہ کب سے شروع ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ کھیل کے اصول کے خلاف ہے لیکن وہ نہ مانے تو بتایا گیا کہ بس کل صبح آپ کے غسل خانے سے شروع ہو گا۔ اب دوست کی کرامات سنئے، صبح آنکھ کھلی تو چیلنج ذہن میں تھا۔ غسل خانے میں داخل ہوئے تو ہر طرف غور سے دیکھا کہ کہیں کوئی "نامحرم" تو چھپا نہیں ہے۔ اطمینان کرنے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ ہوا، جو ہوا کرتا تھا۔ واپس آ کر چائے پر بیٹھے۔ تو دودھ کا برتن بدلا ہوا تھا کان کھڑے کئے اور بیوی کو بلایا تھوڑی دیر تک بیوی کا جائزہ اس طور پر لیتے رہے کہ کہیں وہ تو نہیں بدل گئیں۔ بیوی نے ان کی یہ رنگت دیکھی تو دو چار کلمات خیر ایسے کہہ دئے کہ یہ چائے پیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلے تو کچھ خیال آیا۔ فوراً اندر گئے اور دور ہی سے بیوی کو مخاطب کر کے بولے میں سمجھ گیا تم نے اپریل فول بنانے کی کوشش کی ہے۔ بیوی نے للکار کر کہا "خبردار جو منہ سے اول فول نکالا ہو" برہم ہو کر پھر باہر آئے۔ سائیکل اٹھائی اور چل دئے۔ تھوڑی دیر گئے ہوں گے کہ محسوس ہوا کہ نوکر کی سائیکل

پر چلے آئے تھے۔ گھر واپس آئے اور نوکر سے بولے، کیوں بے تو نے سائیکل کا اپریل فول بنانے کی
کوشش کی تھی۔ اچھا میں سائیکل کا قصہ ہی چکاتا ہوں۔ جا تانگہ لا۔ تانگہ آیا تو آگے پیچھے پھر
دیکھا۔ اور اطمینان کر کے کہ گھوڑا آگے ہی جتا تھا، پیچھے نہیں۔ تانگہ پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا
کک سٹارٹر Kick Starter بھی تھا اور جٹ پروپلڈ Jet Propelled بھی۔

دولتی چلائی، پھوں پھاں بھی کی (فوں فاں نہیں) تو یہ تانگے والے سے بولے۔ کیوں جی گھوڑا
تو اپریل فول نہیں بنا رہا ہے۔ اس نے کہا، نہیں حضور اسے مسالہ دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر فکرمند
سے رہے پھر اس انداز سے بولے جیسے بات کی تہ تک پہنچ گئے ہوں، اچھا تو اپریل فول میں مسالہ بھی
دے دیا کرتے ہیں۔ راستے میں کوئی شناسا مل گیا، اور اس نے روکنا چاہا تو مسکرائے اور بغیر رکے
دوست کو اپریل فول بنانے چلے گئے۔ کچہری پہنچے تو پیش کار نے دستخط کے لئے کاغذات پیش
کئے، فرمایا، دستخط سمجھ کر کرائے گا، اپریل فول میں جیل خانہ پہنچ جائے گا۔ میرا کچھ نہ بگڑے گا
عدالت میں ایک بوڑھے وکیل نے جھک کر سلام کیا تو فوراً جواب دیا، جناب آپ نے یہ گون
کسی دوسرے کی پہن رکھی ہے۔ میں دھوکے میں نہیں آنے کا۔ چپراسی نے فریقین مقدمہ میں
سے حسب معمول ایک کو آواز دی۔ اتفاق سے فریق مقدمہ ہم نام نکلا۔ چپراسی کو بلا کر ڈانٹا
کیوں بے گدھے، با آواز بلند اپریل فول بناتا ہے۔ گواہ کو حلف دیا تو بولے حضرت، ذرا سوچ
سمجھ کر، یہ حلف ہے اپریل فول نہ باشد۔۔!! غرض دوپہر تک ہر ایک کو اپریل فول بناتے رہے
یہاں تک اطلاعات ملی تھیں کہ گاڑی کا وقت آگیا۔ اور میں دہلی چلا آیا۔!!

ایک اور صاحب کا مشہور قصہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ ان کو تمام عمر اس کا الم رہا تھا
کہ ان کو کسی نے اپریل فول نہیں بنایا۔ ایک اپریل کی پہلی کو، یہ اپنے کلب میں بیٹھے ہوئے بجٹ
کی نارسائی پر ذہن میں ایک ریزولیوشن کا مسودہ تصنیف کر رہے تھے کہ ایک نووارد داخل
ہوا۔ اس نے آس پاس کے لوگوں کو غور سے دیکھا۔ جب ان کی نوبت آئی تو انہوں نے کچھ ایسا ظاہر
کیا۔ جیسے ان کو نووارد کی کوئی پرواہ نہ تھی اس نے بڑھ کر فیصلہ کن انداز سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
اور باہر لا کر ان کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ وہ ان کو [illegible] اتنا ہی وہ ہنستے اور خوش
ہوتے۔ نووارد کو ان کی یہ ادا اتنی بھائی کہ اس نے ان کو ادھ موا کر دینے میں کوئی دقیقہ

اٹھا نہیں۔ کھا بلکہ تمام لوگ حیران و سراسیمہ تھے۔ بالآخر اجنبی نے جب یہ دیکھا کہ نقلک کر وہ خوداُدہ ہوا ہو چیلا ہے، تو ان کو ہنستا چھوڑ کر چلا گیا۔ کلب کے تمام ممبر جمع ہو گئے۔ اور دوست سے استفسار حال کرنے لگے۔ لیکن ان کی ہنسی بند نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر بڑی مشکل کے بعد انہوں نے یہ بیان دیا کہ مجھے تفریح یوں ہو رہی تھی۔ کہ یہ غلط آدمی کو مارا تھا ہمیں نے بھی کیسا اپریل فول بنایا ۔!!

اس کے بعد ذرا اس لطیفے کو بھی سن لیجئے :۔

ایک دن ایک معصوم چھوٹی بچی اپنے باپ کے پاس دوڑی ہوئی آئی وہ اس درجہ خوش تھی جیسے اس سے زیادہ وہ تمام عمر خوش نہیں ہوئی تھی۔ باپ نے خوشی کا سبب پوچھا تو یہ بتاتی نہ تھی کبھی دوڑ کر کمرے کے اندر جاتی اور کبھی ہنستے ہنستے باپ کی گود میں لوٹنے لگتی۔ باپ نے بڑی شفقت اور اصرار سے دریافت کی تو اس نے کہا "ابا، آج میں نے چوہے کو اپریل فول بنادیا" باپ نے پوچھا "وہ کیسے" تو بولی "میں نے چوہے دان لگا دیا ہے، لیکن اس میں روٹی کا ٹکڑا نہیں لگایا ۔" !!

(باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

احمد ندیم قاسمی

غزلِ مسلسل

مچلتی ہے مرے آغوش میں خوشبوئے یار اَب تک
مری آنکھوں میں ہے اس سحرِ رنگیں کا خمار اب تک
زمانہ ہو چکا اس اوّلیں مڈبھیڑ کو، لیکن
سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک
غمِ دوراں کی تاریکی کے سیلِ بے کنار اُمڈے
مگر ٹوٹا نہیں تیری تجلّی کا حصار اب تک
شبستانوں کے دَر ہر چند مجھ پر وا نہیں ہوتے
مگر اک مست و بے خود رات کا ہے انتظار اب تک
کوئی آتا نہیں اب دل کی بستی میں، مگر پھر بھی
امیدوں کے چراغوں سے ہیں روشن رہگذار اَب تک
ابھی تک نصفِ شب کو چاندنی گاتی ہے جھرنوں میں
نہیں بدلی شبابِ منتظر کی یادگار اَب تک
جلا رکھے ہیں شہراہوں پہ اشکوں کے دیئے کب سے
نہیں گذرا مگر اس سمت سے وہ شہسوار اَب تک
جو حسن و عشق کی پیکار میں آنکھوں سے ٹپکے تھے
انہیں تاروں سے ہے دامانِ ہستی زرنگار اَب تک
شکستِ آرزو کو عشق کا انجام کیوں سمجھوں؟
مقابل ہے مرے آئینۂ لیل و نہار اَب تک
ندیم اِن مشعلوں کی جگمگاہٹ بڑھتی جاتی ہے
کہ لہرایا نہیں اس بزم میں دامانِ یار اَب تک،

مظہر ح. یوسف

مآل

تھک گیا زیست کی یکرنگی سے
ذہن اب سوچ نہیں سکتا کوئی راہِ فرار
تلخیٔ زہر محبت سے میں کھیلا تو بہت
اب وہ بیتے ہوے لمحے ہیں کہاں
ایک بجھتی ہوی امیّد ہے ان سب کا مآل

روز و شب یہ ہے خیال
کیا خبر لوٹ کے آئیں گے وہ دن !
اور اگر آ بھی سکیں
مجھکو تجدیدِ محبت کی بھی جرأت ہوگی ؟
میرا ڈوبا ہوا دِل
حسرت و یاس کی تاریکی میں
کرتا ہے روز کچھ ایسے روشن
بھولی بسری ہوی موہوم امیدوں کے دیئے

جیسے لوٹ آئے وہ دِن
اور تجدیدِ محبت بھی ہوی !
ایک دزدیدہ نظر
رہزنِ ہوش و حواس
مجھکو دیتی ہے محبت کا سُراغ
دیکھ وہ چاند نکل آیا افق کے نزدیک
اور مستُور ستارے بھی ہوے ہیں روشن
جس طرح دل کے عزاخانہ میں
شمعِ امید کی لَو جاگ اٹھے
جو نہ جلتی ہو نہ بجھتی نہ بھڑکتی ہو کبھی !

دِل ہوا خوگرِ آلام اپنا
اب تو امید بھی موہوم ہوی جاتی ہے
اور ستارے بھی ہوے ہیں روپوش !
پھر وہی ایک خیال
اب نہ آئیں گے وہ دن
تھک گیا زیست کی یکرنگی سے ۔

باجی

کچھ دیر اچھا باجی کو متوقع نظروں سے دیکھتا رہا۔

باجی کام میں مصروف تھی۔ دوپٹہ شانوں پر گرا ہوا تھا۔ بکھرے ہوئے بالوں میں کیوپڈ کی شکل کا کلپ لگا ہوا تھا، اور وہ نیچی نگاہوں سے مسکرائے جا رہی تھی۔ باورچی خانے کے دروازے میں بھائی جان کھڑے تھے۔ ایک نظر باجی کی کلپ کی طرف دیکھتے اور پھر گھبرا کر اپنی عینک صاف کرنے لگتے۔ اماں روٹی پکانے میں مصروف تھی۔

"باجی"!! اچھا چڑ کر چلایا۔

"کیا ہے تجھے"، اماں بولی

"مجھے تو نہیں باجی کو ہے"

"کیا ہے مجھے" وہ ہنسی

کچھ پتا ہی نہیں چلتا تمہارا، کبھی کچھ، کبھی کچھ —— آپ ہی کہا تھا بھائی جان کو باورچی خانے لے آ اور اب ——

کب کہا تھا میں نے، باجی کا منہ سرخ ہو گیا۔

اوں کہا نہیں تھا۔

لو اماں، میں نے تو کہا تھا کھانا تیار ہو جائے تو انہیں اطلاع دے دینا۔

اوں — اطلاع دے دینا — اور جو مجھے مٹھائی ——

اچھے!!' باجی نے شور مچایا۔

دو، پھر مٹھائی مجھے

بہت برا ہے تو۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اچھے کو گود میں لے کر لاڈ پیار سے مارنے لگی:

بھائی جان گھبرانے کے ساتھ مسکرا بھی رہے تھے۔

بہت باتیں بناتا رہتا ہے تو، باجی نے اچھے کو پیار سے گھورا اور ایک آڑی نظر بھائی پر ڈال کر بولی۔ چلیے بھائی جان باورچی خانے آئیں نہ آئیں مجھے کیا۔

اماں نے منہ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ تم آ بھی گئے نذیر؟

نہیں نہیں، بھائی جان چونک کر بولے۔ نہیں نہیں۔ میں تو ویسے ہی آیا تھا۔

جھوٹ، اچھا باجی کی گود میں سے چیخنے لگا۔

اماں چولھے میں منہ دے کر ہنسنے لگی۔

کیوں اماں میں نے بلایا تھا بھائی جان کو؟

نہ میں نہیں دیتی تمہاری باتوں میں دخل۔ وہ بولی۔ تم جانو اور تمہارے بھائی جان۔

آپ اس شیطان کی باتوں میں نہ آیا کریں بھائی جان۔ باجی اپنے کلپ کو سنوارتے ہوئے بولی

نہیں نہیں، بھائی گھبرا گئے۔

نہیں نہیں! اچھے نے ان کی نقل اتاری۔

نہیں نہیں۔ اچھے۔ نہیں نہیں۔ باجی اچھے کو گھور کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

انہیں نہیں نہیں کرتے دیکھ کر اماں بھی مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی گھر میں سبھی بھائی نذیر کو نہیں نہیں کہا کرتے ہیں۔

باجی چپکے سے اچھے سے پوچھتی۔ "اچھے وہ کہاں ہیں؟" "وہ؟" اچھا آنکھیں چمکا کر رازدارانہ انداز سے کہتا۔ "نہیں نہیں؟" باجی ہنس پڑتی تو اچھا اس سے پوچھتا "بلاؤں" "نہیں نہیں" باجی اسے پیار سے گھورتی "ہاں ہاں" وہ جواب دیتا "نہیں نہیں"۔ "نہیں" باجی ہنستے ہوئے اسے ڈانٹتی اس پر اچھے کا منہ لٹک جاتا اور وہ جل کر کہتا۔ "تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا باجی، کبھی کچھ کبھی کچھ" اور باجی ہنستی، ہنسے جاتی۔

اچھا سچ کہا کرتا تھا۔ "باجی کا کیا اعتبار۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ اور"۔ باجی کی اس عادت پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے باجی ذرا اچھی نہیں لگتی۔ وہ اچھے سے مل کے سارا دن شور مچایا کرتی۔ یہ دیکھ کے میں چپکے سے بھائی جان کے کمرے میں جا بیٹھتی اور

اپنی کتاب پڑھنے لگتی۔ بھائی جان میری طرف دیکھتے اور مسکراتے جاتے۔ ان کی خاموش مسکراہٹ کس قدر پراثر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے۔ صرف ہونٹ ہی نہیں جیسے کہ باجی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی جان اپنی کرسی کھینچ کر میرے پاس آ بیٹھتے۔

"بہت جی لگتا ہے تمہارا پڑھنے میں منی" میری ہنسی نکل جاتی۔ اس پر وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتے "عجیب انداز سے ہنستی ہو تم منی۔ بہت خطرناک ہوتی جا رہی ہو۔" بھائی جان کی عادت ہی ایسی چپ چاپ بات کر دیتے ہیں، نہ بھی کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بن بولے باتیں کر رہے ہوں اس کے باوجود باجی یہ سمجھتی ہے کہ وہ بات نہیں کرتے۔ اور کریں بھی تو گھبرا جاتے ہیں۔ میرے سامنے تو وہ ذرا نہیں گھبراتے۔ ان کے کمرے میں میں چلی جاتی، تو آپ ہی آپ بات چھیڑ دیتے۔ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے کہ توبہ۔ میں ان کا مذاق نہیں اڑاتی نا۔ اس لئے۔ اور باجی؟ باجی کو تو ہر سمے یہ فکر رہتا ہے کہ انہیں پریشان کرے۔ پھر بھائی جان گھبرا جائیں تو ان کا قصور؟ لیکن بھائی جان بھی تو حد ہیں باجی کے سامنے جا کر تو سدھ بدھ نہیں رہتی، منہ سے بات تک نہیں نکلتی۔

اس روز جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے۔ اماں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی کہ یکا یک میں اور باجی سکول سے آ پہنچیں۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا اور یوں گھبرا گئے جیسے کسی غیر کے آنے پر کوئی لڑکی گھبرا جاتی ہے۔ ہم بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ اور جلدی سے باورچی خانے سے نکل اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ہم نے اماں کی ہنسی سنی۔ "لے یہ ہے اپنی منیر اور صغیر ہیں"۔ "منی؟" بھائی جان نے حیرانی سے دہرایا "اتنی بڑی ہوگئی ہے!" اماں ہنس کر بولی۔ "دسویں میں ہے" پھر اس نے باجی کو آواز دی "منیر بیٹی یہاں آ۔ تیرے بھائی آئے ہوئے ہیں" باجی باورچی خانے میں داخل ہوئی تو بھائی جان پھر سے گھبرا گئے "السلام علیکم بھائی جان"۔ وہ مسکرائی جیسے کہ اس کی عادت ہے "ایک دم اتنی بڑی ہوگئی ہو" وہ عینک صاف کرتے ہوئے بولے "ان لڑکیوں کو بڑھتے ہوئے دیر لگتی ہے کیا؟" اماں کسی کام سے باہر جاتے ہوئے بولی۔ اماں کے جانے کے بعد بھائی جان اور بھی گھبرا گئے۔ کچھ کہنے کی خاطر بولے "دسویں میں ہو؟" "ہوں" باجی نے شان سے کہا "اور تم؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آٹھویں میں" میں نے جواب دیا۔ پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ بار بار عینک صاف کرتے۔ چوری چوری باجی کی طرف دیکھتے اور گھبرا کر مجھ سے کوئی سوال

پوچھ لیتے، باجی ان کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے جاتی۔ اس کی مسکراہٹ کو محسوس کرکے بھائی جان اور بھی پریشان ہو جاتے۔ "سگو" انہوں نے آہستہ سے کہا: "تمہاری باجی تو ایک دم منی سے منیر بن گئی اور تم وہی سگی کی سگی رہیں۔" اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا "کیوں میں کیا بچہ ہوں؟ تیرھویں میں ہوں۔" "نہیں نہیں" وہ ہنسے۔ "میرا یہ مطلب نہیں۔ کیوں ہوں" اور انہوں نے باجی کی طرف دیکھا۔ "میں کیا موٹی ہوں؟" باجی نے گھور کر کہا۔ "تو اور کیا ہو" بھائی جان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ "لے ہے ملتے ہی لڑنے بھی لگے۔" اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لو چاچی" بھائی جان جھینپ کر بولے۔ "اس کی عادت ہی ایسی ہے" اماں ہنسی۔ "ہنہیں ہنہیں" بھائی جان گھبرا کر بولے۔ "ہنہیں ہنہیں" اس پر باجی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنے میں اچھا دوڑا دوڑا آیا اور اچھل کر بھائی جان کی گودی میں بیٹھ گیا۔ باجی نے منہ پکا کر کے اچھے کو گھورا۔ "ہنہیں ہنہیں اچھے۔ ہنہیں ہنہیں" اور ہم سب ہنس پڑے۔ "دیکھا بھائی جان یہ ہے میری باجی جو اسکول گئی ہوئی تھی۔" اچھا آنکھیں چمکا کر بولا "کیسی ہے" یہ سنکر باجی گھبرا کر وہاں سے ٹل گئی۔ دو ایک منٹ کے لئے تو وہ بیٹھے عینک صاف کرتے رہے، پھر پسینہ پونچھ کر بولے: "تمہاری باجی تو قصائی ہے" "قصائی؟" اچھے نے دہرایا۔ بھائی جان نے اچھے کو پچکار کر کہا: "اونہوں سمجھے نہیں" "جیتیں تو کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔ "قصائی بگڑ جاتا ہے۔" بھائی جان نے جواب دیا: "بڑی بگڑے ہمیں کیا پروا" اچھے نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمیں تو ہے" بھائی جان مسکرائے۔ "کیوں تم کیا بکرے ہو؟" اور وہ چیختا ہوا باجی کی طرف بھاگا: "باجی باجی بھائی جان بکرا ہیں۔" باجی یہ سنکر ہنسنے لگی۔ "اور تم؟" اچھے نے منہ پر انگلی رکھ کر کہا "تم قصائی" "چپ شیطان کہیں کا" باجی نے پیار سے اسے گھورا۔ بھائی جان کو پاس سے گذرتے ہوئے دیکھ کر وہ اچھے سے کہنے لگی "ہمیں نہیں چاہئے ایسا دبلا پتلا بکرا" "کیسا چاہئے؟" اچھے نے پوچھا "موٹا ہو چربی والا ہو" وہ مسکرائی۔ اچھا بھائی جان کی طرف بھاگنے لگا تو باجی نے ہنستے ہوئے اسے پکڑ لیا، جیسے واقعی اسے روکنا چاہتی ہو۔ تو بہ باجی کو کیسے ڈھونگ رچانے آتے تھے۔ میں کیا سمجھتی نہیں۔ وہ تو بلکہ آپ چاہتی تھی کہ اچھا جا کر ساری باتیں بھائی جان سے کہہ دے۔ اسی لئے تو وہ اچھے سے ایسی ایسی باتیں کیا کرتی۔ اچھے سے کچھ کہنا اور پھر تو تیغ رکھنا کہ وہ چیخ چیخ کر اسے دہرائے گا نہیں۔

اگر اماں ولایت کا ذکر نہ کرتی، تو بات نہ بگڑتی۔ لیکن اماں! اماں کو کون سمجھائے!! وہ تو بن سوچے سمجھے بات کر دیتی ہے۔ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ اماں بولی "نذیر اپنی شادی کا بھی کچھ فکر ہے" "شادی!" بھائی جان کا رنگ اڑ گیا۔ باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ "مجھے فکر کرنا ہے؟" "لے ہے" اماں بولی "ولایت اب جوان ہے۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے" "ولایت!" باجی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "اں ہاں" اماں نے کہا "تمہارے پھوپھا کی لڑکی۔ اس سے نذیر کی شادی ہوگی نا" "ولایت!" باجی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ولایت سے باجی کو چڑ تھی نا۔ اس لئے۔ ولایت کا نام آجاتا تو ایسے منہ بناتی جیسے کوئی پھس پھسی چیز منہ میں آپڑی ہو۔ بات بھی ٹھیک ہے، واقعی ولایت پھوہڑ اور بد مذاق ہے۔ سارا سارا دن مصلے پر بیٹھی رہتی ہے۔ مصلے سے اٹھی تو برتن دھونے لگی۔ کپڑے دھونے سے تو اسے عشق ہے۔ بات کرے تو مسئلے چھیڑ دیتی ہے۔ اور چپ بیٹھی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تسبیح کر رہی ہو۔

بھائی جان نے بہتیرا کہا کہ منگنی ونگنی کوئی نہیں ہوی۔ ویسے ہی لوگوں نے بات چلا دی ہے۔ لیکن اماں کب ماننے والی تھی۔ بولی "مانا ڈھولک نہیں پٹی۔ باجے نہیں بجے۔ لیکن بات تو پکی ہو چکی ہے" ادھر باجی ہنس ہنس کر چیخنے لگی۔ "میں نے بھی کہا بھائی جان کو ولایتی چیزوں سے عشق کیوں ہے" اچھا چلایا "بھائی جان کا بیاہ ہوگا۔ اہا بھائی جان کا بیاہ ہوگا" "نہیں نہیں" بھائی جان گھبرا کر بولے۔ اور پھر دفعتاً چپ ہو گئے۔ "نہیں نہیں" باجی نے اچھے کو مذاق سے گھورا "نہیں نہیں" دولہا بنیں گے۔ میں جانتا ہوں" اچھا چیخنے لگا۔ "گھوڑے پر چڑھیں گے" توبہ ان سب نے مل کر ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ اس پر بھائی جان کھسیانے ہو کر چلے گئے۔

اگلے روز کھانے کے وقت حسب معمول اچھا باجی کے پاس آکر کہنے لگا۔ "باجی بلاؤں بھائی جان کو" "اوں ہوں" باجی نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا "وہ تو اپنے کمرے کو ولایت بنا کر بیٹھ رہتے ہیں" عین اس وقت بھائی جان آپہنچے۔ باجی کی بات سن کر انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اُف وہ ایک نظر جیسے وہ گھور رہے ہوں، فریاد کر رہے ہوں۔ میرے بدن میں تو سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ لیکن باجی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے۔ وہ اور بھی چمکی۔ ہنستے ہوئے اچھے سے پوچھنے لگی "کیوں اچھے تم دیسی ہو یا بناسپتی" "بناسپتی؟" اچھا سٹپٹا کر بولا "وہ

کیا ہوتا ہے باجی؟" "وہی جو ولایت میں بنے" باجی نے ایک انداز سے کہا "بھائی جان کیا ہیں؟" اچھے نے پوچھا۔ "نباسپتی" باجی نے ایک آڑی نظر بھائی جان پر ڈالی۔ "اور تم" اچھے نے پوچھا "ہم تو دیسی ہیں" باجی مسکرائی۔ ایک بار بھائی جان نے پھر اسی نظر سے باجی کی طرف دیکھا۔ اف کتنی التجا تھی، اس ایک نظر میں۔ عین اس وقت اندر سے اماں کی آواز آئی۔ "تم اب آؤ گے بھی یا وہیں جھگڑتے رہو گے؟"

اس روز کھانے پر سبھی خاموش بیٹھے تھے۔ بھائی جان پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ باجی بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اور اچھا؟ حیرانی سے کبھی بھائی جان کی طرف دیکھتا، اور کبھی باجی کی طرف۔ "کچھ اچھا بھی بنا ہے؟" اماں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ اور پیشتر اس کے کہ بھائی جان جواب دیں، باجی بولی۔ "اوں ہونہہ۔ یہ شلغم کیوں پکالئے اماں۔ پکانے ہی تھے تو ولایتی پکاتیں" "ولایتی؟" اماں نے حیرانی سے باجی کی طرف دیکھا۔ "وہی جو پیلے سے ہوتے ہیں" باجی نے کہا۔ بھائی جان نے تڑپ کر باجی کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "تو کہو نا انگریزی" اماں باجی سے کہنے لگی۔ "ایک ہی بات ہے" باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "بالکل اچھے نہیں لگتے تمہیں؟" اماں نے پوچھا۔ "مجھے؟" وہ معنی خیز نگاہوں سے بھائی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو مزے سے کھا رہی ہوں بھائی جان سے پوچھئے۔" بھائی جان کھسیانی ہنسی ہنسے اور پھر اور بھی چپ ہو گئے۔

اگلے دن میں کئی ایک بار بھائی جان کے کمرے میں گئی۔ دیر تک بیٹھی رہی لیکن انہوں نے مجھ سے بات تک نہ کی۔ کوئی جانے جیسے واقعی پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کھوئے کھوئے ہیں۔ آنکھیں بھری بھری سی۔ ماتھے پہ تیوری۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز کھائے جا رہی تھی۔ میں نے جل کر پوچھا "کیا ہے بھائی جان"۔ "اوہ" بھائی جان چونکے۔ "کچھ نہیں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں۔" انہوں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا۔ "ٹپ" کتاب پر نہ جانے کیا گرا "بھائی جان!" انجانے میں میرے منہ سے نکلا۔ "نہیں نہیں" وہ بولے "میری آنکھیں خراب ہیں، پانی گرتا ہے" اچھا جو اس دوران میں اندر آ چکا تھا چلا کر بولا "جھوٹ آنکھ میں سے تو آنسو گرتا ہے۔" بھائی جان نے بے بسی سے اچھے کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ اچھا غل مچاتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ "باجی باجی —" "تو پھر میں کیا کروں"

کچھ دیر بعد باجی کی آواز آئی ۔ اور بھائی جان کرسی سے اٹھ کر اوندھے منہ پلنگ پر لیٹ گئے ۔

— اس کے بعد بھائی جان نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ وہیں کھانا منگوا لیتے ۔ اور پھر وہیں پڑھنا شروع کر دیتے ۔ شام کو اندر آکر گپیں مارنے یا مجھ سے کھیلنے کی بجائے وہ باہر سیر کو چلے جاتے اور آکر سو جاتے ۔ اندر آتے بھی تو اس وقت جب ہم دونوں سکول میں ہوتے ۔

ایمان کی بات ہے بھائی جان کی اس تبدیلی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔ اچھا ہوا وہ باجی سے الگ تھلگ ہو گئے ۔ باجی سے انہیں بھونڈے مذاق اور طعنوں کے سوا ہی کیا سکتا تھا ۔ ہر وقت کی کھی کھی اور شور شرابا ۔ لیکن مصیبت یہ تھی ۔ کہ بھائی جان نے باجی سے بات کرنا کیا چھوڑا انہوں نے تو بالکل ہی چپ کا روزہ رکھ لیا ۔

ایک دن میں ان کی چپ سے تنگ آکر کمرے سے باہر نکل رہی تھی ، کہ باجی آگئی ۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی ۔ کیوں کہ اس سے پہلے باجی کبھی بھائی جان کے کمرے میں نہ آئی تھی ۔ نہ جانے کیا کہنے آئی ہے ۔ میں نے سوچا ۔ مذاق کی بات تو نہیں ہو سکتی ۔ کیوں کہ اس کے منہ پر سنجیدگی چھائی تھی جی چاہتا تھا کہ باجی کے ساتھ میں بھی اندر جاؤں مگر کیسے جاتی ۔ باجی جی میں کیا کہے گی ۔ بات سنے بغیر بھی تو نہ رہ سکتی تھی میں — باہر نکل کر میں ادھر سے گھوم کر ادھر جا پہنچی ۔ جس طرف بھائی جان کے کمرے کی کھڑکی تھی اور لگی درزیں سے جھانکنے ۔ باجی بھائی جان کے سامنے شان سے کھڑی تھی — بھائی جان گھبرائے ہوئے کرسی پہ بیٹھے چابیوں کے گچھے سے کھیل رہے تھے " لیکن اماں تو یہی سمجھتی ہے " ۔ باجی نے کہا ۔ بھائی جان کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں ۔

" اماں ! "

" ہاں ۔ وہ کیا دیکھتی نہیں کہ آپ الگ الگ رہتے ہیں ۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ میری وجہ سے ناراض ہیں "

" نہیں نہیں " بھائی جان چلائے اور پھر دفعتاً خاموش ہو گئے ۔ باجی کی ہنسی نکل گئی " آپ مجھے خواہ مخواہ ہنسا دیتے ہیں " وہ بولی " چلو بھائی جان غصہ تھوک دو اب "

" تم سمجھتی ہو میں غصہ میں ہوں ۔ تم سے غصے ۔ میں ؟ " بھائی جان نے بمشکل کہا ۔

" مجھے کیا پتہ ؟ " باجی نے بے پرواہی سے کہا ۔

"تمہیں پتہ نہیں مون؟" بھائی جان کی آواز میں آنسو تھے۔
"مجھے مون نہ کہا کیجئے"
"تو کیا کہا کروں" بھائی جان نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"مجھے نہیں معلوم"
"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے منیر کبھی معلوم بھی ہوگا"
"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ ولایتی بولی ہماری سمجھ میں نہیں آتی"
"منیر!" بھائی جان تڑپ کر بولے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ ایک آنسو کتاب پر گرا۔
"کیا تم کبھی نہ سمجھو گی؟" انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں منت سے کہا
"بھائی جان! چپ!" وہ مسکرائی۔ اتنے میں چھا کہیں سے آنکلا اور اونچی آواز میں چلانے لگا "اماں دیکھو بھائی جان رو رہے ہیں۔ اور باجی انہیں چپ کروا رہی ہے۔ اتنے بڑے ہو کر روتے ہیں" "اچھا اچھے" باجی مجھے کے پیچھے بھاگی۔

شام کو جب ہم پڑھ رہی تھیں تو بھائی جان آئے اور چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھ گئے دو ایک مرتبہ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ اور باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایمان کی بات ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ آخر ایسی بھی کیا بات تھی جو میرے سامنے نہ کہی جا سکتی تھی۔ بھائی جان تو بیکار باجی کے لئے دیوانے ہو رہے تھے اور باجی! باجی کو ان کی خاک پرواہ نہ تھی۔ میں غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب میں اندر آئی تو باجی کے پاس ایک عجیب سا چمکدار پترا پڑا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک خوبصورت بچے کی شکل بنی تھی۔ جس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ میں نے پوچھا باجی یہ کیا ہے" "کیا؟" باجی نے تنک کر پوچھا "یہ" میں نے اس پترے کی طرف اشارہ کیا۔ بولی "یہ کلپ ہے" "کلپ؟ میں حیران ہو گئی۔" "ہاں" باجی نے لاپرواہی سے کہا "میں نے بھائی جان سے کہا تھا ایک کلپ لا دو" "اس پر یہ تصویر کیسی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "پتہ نہیں" وہ مسکرائی "بس تصویر ہے" توبہ باجی کو بھی کتنے مکر آتے ہیں۔ میں کیا جانتی نہیں کیوپڈ کی تصویر تھی۔ میں نے کئی بار اسکول میں دیکھی تھی۔ ہماری استانی نے سب کچھ بتایا تھا ہمیں۔

اس کے بعد باجی ہر وقت وہ کلپ اپنے بالوں میں لگائے رکھتی۔ بھائی جان اسے دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔ اچھے نے کلپ کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ کہنے لگا "یہ کیا ہے باجی۔ مجھے دو۔ میں دیکھوں"۔ "اوں ہونہہ" باجی مسکرا کر بولی۔ "یہ کھلونا نہیں"۔ اچھا بسورنے لگا، تو بھائی جان نے اسے پکڑ لیا بولے "آؤ ہم تمہیں ایسا اچھا کھلونا لا کر دیں گے"۔ "نہیں نہیں میں تو یہی لوں گا"۔ اچھا مچل گیا جیسے کہ اس کی عادت ہے "واہ"، بھائی جان بولے "یہ بھی کوئی چیز ہے۔ بالکل بیکار۔ اسے تو زمین پر لڑھکا بھی نہیں سکتے۔ ہم تمہیں موٹر لا دیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے بھائی جان اچھے کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

اگلے روز جب باجی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں بھاگی بھاگی آئی۔ کہنے لگی "میری بیٹی اللہ کے چار تو بنا دے۔ تیرا بھائی دلاور آیا ہے"۔ "دلاور" باجی نے حیرانی سے پوچھا "ہاں! تیری خالہ اور خالو بھی آئے ہیں"۔ "سچ؟" وہ مسکرائی۔ "ہاں" اماں بولی "کہتا ہے وہ ابھی بمبئی میں رہیں گے۔ دو ایک مہینے یہاں رہیں گے"۔ "افریقہ والی خالہ؟" میں نے پوچھا "افریقہ والی نہیں تو اور کونسی" اماں نے کہا "شکر ہے بہن آئی ہے۔ تو یہ آٹھ سال وہیں افریقہ بیٹھی رہی۔ دل تو لے مجھ سے "ہماری ایک باجی ہی ہے"۔ باہر سے اچھے کی آواز آئی۔ "پڑی ہوں" دلاور بھائی کی بھدی آواز سنائی دی "پڑی ہو نہیں" اچھا چلایا "ہے"! "ہو گی" وہ بولے۔ اتنے میں اچھا بھاگتا ہوا آیا "باجی باجی" وہ بولا "جو بھائی جان آئے ہیں وہ کہتے ہیں وہ کہتے ہیں تمہاری باجی ہے ہی نہیں" "چلو" وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا "چلو بھی نا"۔ "نہیں نہیں اچھے" باجی چلائی "نہیں نہیں، نہیں"۔ اچھا اونچی آواز میں بولا "دوسرے بھائی جان"! "کون بھائی جان"؟ باجی نے تنک کر آواز بلند کہا۔ "وہ باہر بیٹھے ہیں"۔ اچھے نے کہا "بیٹھے ہوں گے" وہ ہنسی "واقعی بیٹھے ہیں آؤ دکھاؤں"۔ اچھا بولا "پڑے بیٹھے ہوں"۔ یہ سنکر اچھا باہر بھاگ گیا اور کہنے لگا۔ "باجی مانتی ہی نہیں کہ آپ بیٹھے ہیں"

"نہ مانے" وہ ہنسے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے"!

اماں کو آتے دیکھ کر اچھا پھر سے چیخنے لگا۔ اماں دیکھو یہ بھائی جان میری باجی کو مانتے ہی نہیں"۔ اماں ہنسنے لگی "تو تو پاگلوں کی سی باتیں کرتا رہتا ہے"۔ "ہوں" اچھا بھائی جان سے مخاطب ہو کر بولا "ہماری باجی دسویں میں ہے دسویں میں"۔ "دسویں میں؟" بھائی دلاور نے منہ بنا کر کہا۔ "پہلے کیوں نہ بتایا تم نے؟" "تم تو مانتے ہی نہ تھے"، اچھے کی آواز میں فتح کی گونج

تھی۔ "تم تو کہتے تھے وہ باجی ہے" بھائی جان نے اماں کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"باجی ہی تو ہے" وہ بولا۔ "جو دسویں میں ہوتے تو منی کہتے ہیں باجی نہیں" "منی؟" اچھا سٹپٹا گیا۔ اماں نے انہیں مشغول دیکھا تو بولی "میں چائے لاتی ہوں" اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ "منی کیا ہوتی ہے؟" اچھے نے دلاور بھائی سے پوچھا۔ "بھئی منی وہی ہوتی ہے نا — تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ منی کیا ہوتی ہے؟" "بتاؤ نا" اچھا شوق سے بے تاب ہو رہا تھا۔ "منی ہوتی ہے وہ جو دبلی پتلی ہو، اتنی میلی میلی اور گندی ہو کہ دیکھنے کو جی نہ چاہے" "دیکھنے کو جی نہ چاہے؟" اچھا چمک کر بولا۔ "باجی تو اتنی اچھی گوری ہے۔ ایسے اچھے کپڑے پہنتی ہے" "ہونہہ منہ پر آٹا لگاتی ہوگی" "آٹا؟ وہ تو پاؤڈر ہوتا ہے پاؤڈر" "وہی نا ولایتی آٹا۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ ولایتی آٹا وہی لگاتی ہیں جو میلی ہوں۔ ورنہ ضرورت ہی کیا ہے" "نہیں نہیں" اچھا چڑ گیا۔ "باجی کو تو ولایتی چیزیں ذرا پسند نہیں۔ وہ تو ویسی ہے ویسی" "ویسی؟" دلاور بھائی نے مسخرہ بھرا قہقہہ لگایا۔ "ویسی؟" "آخ تھوہ" اچھا بھاگا بھاگا باورچی خانے گیا، بولا "باجی باجی تم آتی کیوں نہیں" باجی آپ ہی آپ میٹھی ہنس رہی تھی، اچھے کو دیکھ کر وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "اچھے" اس نے گھور کر اسے خاموش کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار سے بولی "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے" "کیسی باتیں؟" وہ حیرانی سے باجی کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہم اچھے کو چائے پلائیں گے۔ بسکٹ دیں گے۔" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی اور بسکٹ دے کر اسے بہلا لیا۔

دلاور بھائی مجھے ذرا پسند نہ آئے۔ موٹے موٹے نقش، بھدا جسم اور گھورنے والی آنکھیں جو کبھی کبھی شرارت سے چمکتیں۔ ان کے انداز میں لاپرواہی جھلکتی تھی۔ بھائی نذیر کے مقابلے میں تو وہ پہلوان نظر آتے۔ نذیر بھائی کی کیا بات تھی: نگاہوں میں خلوص، برتاؤ میں نرمی، گویا چینی اور لوگ بلور کے بنے ہوئے تھے جنہیں وہ بڑی احتیاط سے چھوتے تھے۔ دلاور بھائی تو سپاہی تھے سپاہی سے بھی تو فوج میں کپتان۔ پہلے پہلے تو باجی نے اپنی عادت کے مطابق تیز باتیں چلانے کی کوشش کی مگر توبہ ہے جی۔ ان کے سامنے ایسی باتیں کیسے چل سکتی ہیں۔ باجی تو چپ ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس کی مسکراہٹ بھی جاتی رہی۔ ایمان سے مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ بڑی بنی پھرتی تھی۔ ہر کسی کو دبا لیتی تھی لیکن ہر کوئی بھائی نذیر سا تو نہیں ہوتا۔

چائے پر بیٹھے تو دلاور بھائی نے باجی کے سلام کے جواب میں کہا۔ "پھر تم تو ویسی کی ویسی ہو جیسے

پہلے تھیں" "کیوں؟" اماں بولی "اب تو ماشاءاللہ جوان ہے، اتنا بڑا قد ہوگیا ہے۔" "قد کے بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے" بھائی نے جواب دیا "باجی تو بالکل وہی ہے" باجی کا منہ لال ہوگیا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اماں نے شاید بات بدلنے کے لئے کہا "اب کیا ہمیشہ کے لئے افریقہ بیٹھے رہوگے تم سب؟" "افریقہ؟" "میں تو نہیں رہتا وہاں" بھائی نے کہا "وہ تو رہتے ہیں" اماں نے جواب دیا "تو ان سے پوچھ لینا جب وہ آئیں گے" بھائی نے ہنس کر کہا "خالہ میں تو سپاہی ہوں سپاہی۔ دو سال سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں" اماں بولی "میں کہتی ہوں تم نے یہ نوکری کی ہی کیوں۔ جان کو آرام نہ ہو تو پیسے کو کیا کرنا ہے" "جان کو آرام کیوں نہیں" بھائی نے اماں کی طرف دیکھا "آپ ہی تو کہتا ہے تو۔ مارا مارا پھرتا ہوں" اماں بولی "جیسے مارا مارا پھرنے میں ہی مزہ آئے، وہ کیا کرے خالہ" بھائی مسکرا دیئے۔ "اپنا گھر نہ بساؤ گے کبھی؟" اماں نے پوچھا "گھر بسانے میں دیر لگتی ہے کیا۔ چار کلمے پڑھے اور گھر بس گیا۔ پھر کوئی جہاں جی چاہے بھٹکتا پھرے" "وہ بولے۔ "تو کیا بیوی کو بھی ساتھ ساتھ لئے پھروگے؟" اماں نے پوچھا "اور کیا اسے کوٹھڑی میں بند کر جاؤں گا" دلاور بھائی نے قہقہہ لگایا "پھر تو دلاور" ہاتھ ملتے ہوئے اماں نے کہا "کوئی فرنگن ہی کروگے۔ یہاں کی لڑکیاں تو باہر نہیں پھرتیں" "نہ سہی کوئی زبردستی ہے؟" دلاور بھائی ہنسے "ہائے ہائے" اماں نے ناک پر انگلی رکھ لی "فرنگن میں کیا برائی ہے خالہ" بھائی نے ہنس کر پوچھا۔ کیوں سگو؟" "فرنگن کیا ہوتی ہے" اچھا بولا "یہی جو ولایت کی ہوتی ہے" اماں نے جواب دیا "ولایت کی" اس نے دہرایا "جو بنا سیتی ہوتی ہے؟" اس پر ہم سب کی ہنسی نکل گئی۔ لیکن اچھا کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا "دوسرے بھائی جان سے جو پوچھ رہی تھی، باجی" عین اس وقت میں نے مڑ کر دیکھا بھائی منیر دروازے میں کھڑے تھے۔ دلاور بھائی سے رسمی ملاقات کرنے کے بعد وہ ابھی عینک لگانے نہ پائے تھے کہ اچھا چلانے لگا "بھائی جان یہ سب ہنس رہے ہیں۔ یہ نئے بھائی جان اور، اور باجی اور سبھی۔ یہ کہتے ہیں باجی باجی نہیں بنی ہے" "اچھے" اماں اسے گھورنے لگی "سارا دن نہ جانے کیا بکتا رہتا ہے" "بچہ جو ہوا" دلاور بھائی نے اماں کو خاموش کر دیا اور لگے اس سے باتیں کرنے "جھوٹ تو نہیں کہتے بھئی ہم پوچھ لو اپنی باجی سے" باجی نے تیکھی نظر سے دلاور بھائی کی طرف دیکھا اور منہ موڑ کر مسکرانے لگی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں پریشانی کی جھلک تھی۔

اگلے روز ہم باورچی خانہ میں بیٹھے تھے۔ نذیر بھائی، باجی، اچھا اور میں۔ اچھے نے بہت کوشش کی کہ باجی کو بات کرنے پر مائل کرے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اسے نذیر بھائی کو چھیڑنے کی بھی نہ سوجھی۔ بھائی عینک صاف کرتے ہوئے بولے، اچھے آج تمہاری باجی کو کیا ہوا۔ اچھا بولا۔ "اونہہ، باجی کا کیا ہے، کبھی کچھ کبھی کچھ"۔ "کیوں نیر اچھا کیا کہہ رہا ہے؟" انہوں نے بات چھیڑنے کی کوشش کی: "اس کا کیا ہے، جو منہ میں آیا بک دیا"۔ باجی نے شانے جھٹک کر کہا: "میں بتاؤں باجی کیوں چپ ہے۔ نئے بھائی جو نہیں مانتے"۔ اچھا بولا۔ "نہیں مانتے؟ کیا نہیں مانتے؟" بھائی نے باجی کو چھیڑنے کی خاطر کہا: "پھر نہیں مانتے؟" "اوں ہونہہ" اچھے نے کہا: "کچھ بھی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں منی ہے منی"۔ "مجھے کیا؟" باجی چڑ کر بولی: "لوگ مانیں نہ مانیں"۔ بھائی جان نے ہولے سے آہ بھر کر کہا۔ "کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا"۔ باجی نے غصہ سے مڑ کر دیکھا: "مان نہ مان میں تیرا مہمان" اچھا ہنس کر چلانے لگا "وہ کیا ہوتا ہے باجی؟" "اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ"۔ باجی نے ہنس کر کہا۔ بھائی کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری اور چپکے سے باہر چلے گئے۔ بھائی کے چلے جانے کے بعد اچھا باجی سے لڑنے لگا: "تم تو بھائی جان سے لڑتی ہو باجی"۔ "میں لڑتی ہوں" اس نے غصے سے کہا: "ہم نہیں بولتے تم سے" اچھے نے کہا۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے۔ باجی نے بال سنوارنے کے لئے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا ہاتھ کلپ سے چھوا تو وہ یوں چونکی جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے کلپ اتار کر اچھے کی طرف بڑھایا: "یہ لو۔ اب تو بولو گے مجھ سے"۔ "لے لوں؟" اچھا حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہاں" باجی بولی۔ "واپس نہیں دوں گا پھر" اچھا بولا: "نہ دینا" باجی نے لاپرواہی سے جواب دیا "مجھے کیا کرنا ہے اسے"۔

"یہ دیکھو بھائی جان" اچھے نے بھائی ولاور کو کلپ دکھاتے ہوئے کہا: "نہیں دیکھتے۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو"۔ بھائی جان نے مذاق سے کہا۔ "خواہ مخواہ کیا ہوتا ہے بھائی جان؟ ابھی ابھی باجی بھی کہہ رہی تھی"۔ "تو پھر پوچھو اس سے"۔ بھائی مسکرانے لگے۔ "وہ نہیں بتاتی۔ آپ بتائیے نا" اچھے نے منت سے کہا۔ "تمہیں کہہ رہی تھی کیا؟" انہوں نے پوچھا۔ "نہیں نہیں ان کو ———" اچھے نے بات شروع کی۔ "اچھے" باجی غصہ میں چلائی۔ اچھا خاموش ہو گیا۔ بھائی ہنس کر کہنے لگے: "دیکھا اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ"۔ "اسے کیسے؟" اچھا حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بھائی اسے سمجھانے لگے۔

"اگر تم اور میں باتیں کر رہے ہوں اور بیچ میں کوئی بول اٹھے تو اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ"۔ "جیسے باجی بولی ہے؟" "کوئی بھی ہو"۔ انہوں نے مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا "نہیں نہیں" اچھا چلایا "باجی تو نذیر بھائی کو خواہ مخواہ کہہ رہی تھیں"۔ "دونوں ہی خواہ مخواہ ہیں"۔ یہ کہہ کر دلاور بھائی ہنسنے لگے۔ باجی کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا: "یہ دیکھا" وہ اچھے سے کہنے لگے "اب اسے غصہ آ رہا ہے" باجی سے نہ رہا گیا۔ غصے سے بولی "ہمیں تو نہیں آ رہا غصہ"۔ "پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے"۔ انہوں نے جواب دیا "ایلو میاں اچھے میاں اچھے تمہاری باجی کو غصہ بھی نہیں آتا تت تت تت تت تت"!! باجی کی ہنسی نکل گئی "بڑے مغرور ہیں آپ بھائی جان"۔ وہ ایک انداز سے کہنے لگی "ہر سپاہی کو ہونا چاہیئے"۔ بھائی جان نے جواب دیا "سپاہی کو صرف دو باتوں کا خیال ہوتا ہے۔ آن اور شان"۔ "اونہہ" باجی نے منہ بنا کر کہا "بڑی شان ہے۔ کیا شان ہے؟" "کیوں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہم نے کیا؟" "میں کیا لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھرتی ہوں؟" باجی چڑ کر بولی "ہمیں کیا معلوم" بھائی جان آنکھیں چمکا کر بولے "بھائی جان" باجی نے غصے سے ایک نظر ان کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

رات کو جب اماں اچھے کو لے کر پڑوس میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور ہم دونوں پڑھ رہی تھیں، بھائی دلاور آ گئے۔ باجی انہیں دیکھ کر یوں بیٹھ گئی جیسے پڑھنے کے سوا اسے کسی کا دھیان ہی نہیں۔ لیکن بھائی جان کب ٹلنے والے تھے۔ سیدھے باجی کے پاس جا بیٹھے "کیا پڑھ رہی ہو منو؟" انہوں نے پوچھا "کچھ بھی نہیں" وہ ٹھنک کر بولی "ٹھیک تو ہے" بھائی جان نے غصے میں جواب دیا "انسان غصہ میں ہو تو کچھ پڑھا نہیں جاتا"۔ "کیوں میں کیا غصے میں ہوں" باجی کا منہ لال ہو گیا۔ "پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے"۔ بھائی جان مسکرائے "تمہاری عمر کی لڑکی ہو اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ نہ کھائے"۔ "کیوں"۔ باجی نے ان کی طرف دیکھا "جوانی پر غصہ سہاگے کا کام دیتا ہے"۔ "میں نہیں سمجھتی آپ کی باتیں" باجی نے منہ بنا رکھنے کی کوشش کی "سمجھ لو تو تمہیں دلچسپی ہی نہ رہے" بھائی نے جواب دیا "باجی کھلکھلا کر ہنس پڑی "یعنی مجھے دلچسپی ہے، اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے انسان کیا کیا نہیں سوچتا"۔ باجی نے کہا۔ سپاہی کی بے عزتی ہو تو وہ بڑائی سے نہیں چوکتا"۔ انہوں نے باجی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

باجی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، مگر وہ اپنا آپ چھڑا نہ سکی۔ بھائی نے اسے چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا، "بڑا غصہ ہے تم میں منو" "بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی" باجی چیخی۔ "اب ٹھیک ہے۔ ضرور غصہ کھایا کرو" "سگو" وہ مجھ سے کہنے لگے، "ذرا آئینہ تو لے آنا" "سغیر" باجی چلائی۔ لیکن بھائی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جب میں آئینہ لے کر واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں، کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے وہاں کوئی ہو ہی نہیں ——— چخ چخ! میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نہ جانے اندر کیا چیز چخ چخ کر رہی تھی۔ مجھے تو ڈر آنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بھائی آہستہ سے بولے "منو" میرے دل کو دھکا سا لگا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان دنوں میری عمر ہی کیا تھی۔ اگرچہ میں سمجھا کرتی، کہ میں سبھی کچھ سمجھتی ہوں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ تمام گھر، باجی، بھائی سبھی ناپاک تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار کر گھر سے باہر نکل جاؤں۔

اگلے دن باجی کا رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ منہ پر ایک ملائمت سی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی، ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گذشتہ یاد سے متعلق ہے۔ بھائی نذیر پہلے تو اسے دیکھ کر خاموش کھڑے رہے، پھر آہستہ سے بولے "منیر" باجی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور، بے پرواہی سے منہ پھیر کر اپنا کام کرنے لگی۔ بھائی نذیر اس کے بالوں میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ بھائی بھی اندھے ہیں اندھے۔ خواہ مخواہ کسی کے منہ پر نظریں جمائے تکتے رہنا! ان کا کلپ تو چولھے کے پاس راکھ میں پڑا تھا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا "منیر" وہ باجی کے پاس آتے ہوئے بولے "کیا ہے" باجی نے اکتائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ دفعتاً بھائی رک گئے۔ ان کے پاؤں میں اپلوں کے پاس وہ کلپ پڑا تھا! "اوہ" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پاؤں لڑکھڑا گئے۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سہم کر پیچھے ہٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی دلاور بھائی آ کر بے تکلفی سے چوکی پر بیٹھ گئے۔ باجی نے دو ایک مرتبہ چوری چوری ان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں، اتنے میں چھجا آ گیا۔ بولا "باجی، نہیں نہیں، کہاں ہیں؟" "نہیں نہیں کون" دلاور بھائی نے پوچھا۔ "باجی" اچھے نے باجی کو چپ دیکھ کر بنانا چاہا۔ "باجی!" بھائی جان ہنسنے لگے۔ "تمہاری باجی تو" ہاں ہاں "ہے۔ باجی نے تڑپ کر ایک نظر بھائی جان کی طرف دیکھا" باجی نہیں! نہیں نہیں۔ "اوہ اچھے میاں" بھائی جان کہنے لگے "بات یہ ہے کہ جب تمہاری باجی کچھ نہیں نہیں

تو مطلب ہوتا ہے ہاں ہاں؟" "بھائی جان" باجی منت سے چلائی۔ اس سمے اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔" اور اگر ہاں ہاں کہے تو؟" اچھے نے کہا "ہاں ہاں کہے تو وہ تمہاری باجی ہی نہیں۔ بھائی جان بولے:" مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ" اچھا باہر جاتے ہوئے چلایا۔" ہمیں تو سب معلوم ہے کیوں منی"۔ بھائی جان باجی کے قریب تر ہو گئے۔" آپ کو کبھی معلوم بھی ہوگا؟" باجی نے آہ بھر کر کہا۔" او وہ غصے ہو گئیں ہم سے" وہ بولے۔" آپ سے غصے۔ میں؟" باجی گنگنائی۔" کیا کہہ رہی ہو، تمہاری یہ پشتو ہماری سمجھ میں نہیں آتی" باجی یہ سن کر ٹھٹکی، جیسے دفعتاً اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ آنکھیں بھر آئیں۔" سچ" نہ جانے انگارے پر کیا گرا۔ بھائی دلاور اس کے قریب تر ہو گئے۔" اس لئے روٹھتی ہو کہ کوئی منائے؟" باجی کی آنکھیں لہو کی طرح سرخ ہو گئیں۔ لیکن بھائی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میرا خیال تھا کہ باجی ان کے منہ پر تھپڑ مار دے گی۔ لیکن اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ ہاتھ لٹک گئے، آنکھیں جھک گئیں، راکھ میں کلپ پڑا دیکھ کر وہ یوں چونکی، جیسے اسے پہلی مرتبہ وہاں دیکھا ہو۔ حالاں کہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس نے کئی مرتبہ چلتے پھرتے اسے اپنے پاؤں سے ٹھکرایا تھا جیسے وہ کوئی ٹھیکرا ہو۔ مگر اس وقت اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ ایک ساعت کے بعد باجی کی آواز آئی" چھوڑیے بھی مجھے کلپ تو لگا لینے دیجئے"، اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ عین اس وقت اچھا آگیا۔ باجی کے بالوں میں کلپ لگا ہوا دیکھ کر بولا:" یہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا باجی"!" نہیں اچھے یہ دینے کی چیز نہیں" باجی نے کہا:" اب پتہ چلا تمہیں؟"" اچھے نے شور مچایا۔" ہاں" باجی کی آواز میں ہچکی سی تھی" تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اگلے روز جب اماں خوشی خوشی سے دوڑی دوڑی آکر کہنے لگی:" میری بیٹی تمہارے خالو کا خط آیا ہے انہوں نے دلاور کے لئے تمہارا رشتہ مانگا ہے"!" تو میں کیا کروں" باجی نے چڑ کر کہا:" لے ہے" اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی:" آخر تو پڑھی لکھی ہے سمجھ دار ہے۔ تجھ سے پوچھے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں" باجی نے یہ سن کر سر جھکا لیا:" تو تجھے منظور ہے نا؟" اماں خوشی سے اٹھ بیٹھی۔ باجی نے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آہ بھری۔ اس کا ہاتھ کلپ سے جا لگا اور اس نے اسے یوں مٹھی میں دبایا جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لے رہا ہو" ٹپ" نہ جانے کتاب پر کیا گرا۔ اچھا جو اندر آگیا تھا بولا باجی تو رو رہی ہے"۔" چپ" اماں نے کہا:" یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ باجی نے تڑپ کر اماں کی طرف دیکھا۔ اف وہ ایک نظر! باجی کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اچھا چلایا۔ ایک ساتھ ہنستی بھی ہے اور روتی بھی ——

فکر تونسوی (ایک طویل نظم کا باب)

حوا کی بیٹی

پیدائش :-

(تحیر کا مسلسل رباب بج رہا تھا — فطرت اپنی پوری رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ زندگی کو دعوتِ کیف و وجد دئے جا رہی تھی۔ مگر کیوں؟ کس لئے؟ تحیر کے گنبھیر نغمے نے ان سوالوں پر سائے بچھا رکھے تھے، اور انسان چیخ رہا تھا)

گونج — اے سنگیں کہستاں! چیخ — اے پہنائے دشت
روک — اے نیلے سمندر! اپنا یہ سطلب خرام
ٹوٹ — اے تاروں کی مالا! گھوم — اے ٹھہری زمیں
(دھم دھما دھم، دھم دھما دھم چھن چھنا چھن چھن چھناں)
اور بکھر جائے فضا میں گورا گورا ماہتاب
پھوٹ جائے ذرہ ذرہ ہو کے مہرِ گرم گرم
جھول جائے ناچتی لہروں پہ برفیلی چٹان
اور ہواؤں میں ابھرتی، ڈوبتی لہروں کے راگ
منجمد ہو کر ٹھہر جائیں، فضا کے دوش پہ

کس لئے یہ نور و نکہت! کس کی خاطر رقص و رَم؟؟
وادیوں کی یہ گل اندامی، یہ عطر افشانیاں!

بچے بچے، ٹہنی ٹہنی میں یہ بجتے ارغنوں!

یہ کبھی رکتے ہوئے، بڑھتے ہوئے برگ و نبات!
یہ کبھی گاتا ہوا دن، یہ کبھی گونگی سی رات،
یہ کبھی کالی گھٹاؤں میں جھمکتی بوندیاں،
یہ کبھی بپھری، کڑکتی، ٹوٹتی سی بجلیاں،

کس قدر بے مدعا ہے یہ طلسم رنگ رنگ
کتنا بے رس ہے تماشائے جمال و بو و چنگ

میری خاطر ہے اگر یہ پھیلی پھیلی کائنات،
ہے اگر میری تمنا سیم و سرخ و زرد و نیل
تو مرے اچھے خدا، سچے خدا، او نچے خدا!
تیری اس کونین میں تو گھٹ رہا ہے دم مرا،
روح میں اک پھانس چبھتی ہے پیاپے، دمبدم
یہ جہاں، یہ تیری مبہم داستان کیف و کم!
اک مسلسل پھانس ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں
جیسے اس میں کچھ نہیں میرے لئے — میں بھی نہیں
جیسے ناموجود ہے کوئی تری تخلیق میں — !
(اور میں؟ — اور میں تری اس رس بھری کونین میں)
جیسے جنگل کی اندھیری رات کا غمگیں سماں
اور بھٹکتا، چیختا اک طائر بے بال و پر،
الحذر، اے خالقا! اس بے بسی سے الحذر!"

(۲)

(مظاہر فطرت نے یہ چیخ سنی۔ تو ان کے سینے تھرتھرا اٹھے۔ لیکن یہ پکار کیوں کی گئی تھی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ — عناصر کا یہ پتلا کیا چاہتا ہے؟ یہ ان کی ادراک کی گرفت میں نہ آسکا، اور وہ صرف تھرتھرا کر رہ گئے۔)

اور ہوا کی ریشمی موجوں پہ اڑتی ، تیرتی
مدتوں بھٹکی پھری آدم کی آہِ دردناک
آسماں کا سیم گوں ماحول تھرّاتا رہا
کہکشاں ، سیارگاں ، مہتاب ، انجم ، آفتاب
ذہن میں آ نہ سکا ان کے یہ اندازِ الم ،
تھا کمندِ فہم سے بالا کہیں آدم کا غم
" چاہتا ہے جانے کیا یہ نو گرفتارِ وجود
ہے کہاں سے نا مکمل عالمِ سیم و کبود
کیا ہے ناموجود آخر حیطۂ امکاں میں
کونسی شئے سے ابھی محروم ہے یہ خاکداں
یہ جہاں ، اچھا جہاں ، سچا جہاں ، پھیلا جہاں "

× × × × × × × × × × × × × × × ×

دیر تک سرگوشیاں کرتے رہے اہلِ جمال
پھڑپھڑاتا ہی رہا لہروں پہ آدم کا سوال
ایک سناٹا مگر دیتا رہا اس کا جواب
ایک تنہا نہ خموشی ، اِک جمودِ بے حساب
جس طرح طوفان سے پہلے کی بوجھل سائیں سائیں
نیند کھل جانے سے پہلے جیسے اِک خوابِ گراں

× × × × × × × × × × × × × × × ×

(۳)

(تب عناصر کی جگر چیرتی ہوئی آہِ رسا کا جواب آیا ۔ اور اس جہانِ کائنات کی تخلیق ہوئی ، جو فطرت کے جمالِ سادہ میں نکھار پیدا کرنے کا باعث بنی)

پھر یکایک ایک زیرِ لب ہنسی — نکہت بدن
خامشی کی پھیلی پھیلی دھاریوں کو کاٹتی
خوابگوں، غمناک امواجِ فسوں کو پاٹتی
آکے اتری سرنگوں آدم کے خاک آباد پر
اور اک شبنم کے ریشم سے گلابی ہونٹ پر
اپنا سرتاپائے شہد و عطر — بوسہ رکھ دیا
خوشبوئیں پھیلیں، غزلخواں ہو اٹھے برگ و شجر
جھوم کر گونجا کہستاں، گھوم کر ناچی زمیں
گا اٹھیں خوابیدہ چٹانیں، سمندر رقص میں
رقص میں تھا معبدِ خاکی بہ طرزِ دل فریب
نور میں ڈوبا ہوا آکاش، مندر رقص میں
اپنے اک تارے بجاتے، اٹھے حشراتِ جہاں
شیر، چیتے، بھیڑیے، غزال، بندر رقص میں

او... ادھر با ایں ہمہ نغمہ درانِ بحر و بر
اپنی حوا کو لئے تھا اک قلندر رقص میں

(مسلسل)

اختر الایمان

تجدید

ایک بار پہلے بھی نغمہ بار تھیں شاخیں
برگ و بار آئے تھے، نخل پھول لایا تھا
لد گئی تھی پھولوں سے خاکِ بے سر و ساماں
ایک بار پہلے بھی میں نے گھر سجایا تھا!

ایک بار پہلے بھی قافلے بہاروں کے
اوڑھ کر ردائے گل اس طرف سے گزرے تھے!

آپ ہی نہ جانے کیوں بجھ گئے دیئے گھر کے
ایک شعلۂ غم سے خاک ہو گئی محفل
نیشِ خار پھولوں کے دل میں چبھ گیا جا کر
قافلے بہاروں کے لٹ گئے سرِ منزل!

ایک بار پہلے بھی، تیرگی کے دامن میں
مرگِ نغمہ و گل پر آنسوؤں سے کھیلا ہوں!

آج تم نے پھر آ کر سب دیئے جلائے ہیں
غمکدے کی دیواریں جگمگا اٹھی ہیں پھر!

احمد مجتبیٰ وامق

دو مختصر نظمیں

"الھڑ سپاہی"

شمع کی لَویں اُبھر آئی ہیں ظلمت کی رگیں
جانے کیا سوچ کے لپکی ہے پتنگوں کی قطار
کتنے الھڑ یہ سپاہی ہیں کہ ڈرتے ہی نہیں
جلتے جاتے ہیں مگر ہیں کہ چلے آتے ہیں
زندگی کے نئے انداز بتا جاتے ہیں،
آگ کو آگ سمجھتے نہیں۔ ہٹتے ہی نہیں
اپنی لاشوں سے بنا دیتے ہیں شعلے کی مزار
تاکہ وہ نسلیں جو کل آئیں گی محفوظ رہیں

"سوکھے ہوئے بیلے"

تم نے سوکھے ہوے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں
ان کو مسلا نہ کرو
کتنی آزردہ مگر بھینی مہک دیتے ہیں
ان کو پھینکا نہ کرو
خاک میں لتھڑے ہوے چہروں کو سمجھا بھی کرو
صرف دیکھا نہ کرو
ہاتھ اور پیر کے زخموں کا مداوا بھی کرو
صرف چھیڑا نہ کرو
تم نے سوکھے ہوے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں

نٹ ہیمسن ترجمہ: ممتاز شیریں

زندگی کا رس

نیچے جاتے ہوئے کوپن ہیگن کی بندرگاہ کے قریب ایک گلی ملتی ہے جس کا نام ہے وشروونٹ. ایک نئی، سنسان سی گلی۔ یہاں بہت کم گھر ہیں۔ کہیں کہیں گیس لیمپ، اور آدمی تو بالکل نظر ہی نہیں آتے۔ ان دنوں، گرمیوں میں بھی شاذ ہی یہاں کوئی سیر کرتا نظر آتا ہے۔

تو، کل رات مجھے اس گلی میں ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔

میں یہاں چہل قدمی کر رہا تھا۔ مقابل کی طرف سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔ آس پاس ایک بھی آدمی نہ تھا۔ گیس لیمپ روشن کر دئے گئے تھے۔ پھر بھی اندھیرا تھا، اور میں اس عورت کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ وہی، راتوں کو نکلنے والی عورتوں میں سے ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اور اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

گلی کے سرے تک جا کر میں پھر مڑ گیا۔ عورت بھی مڑ کر واپس آ رہی تھی۔ ہم دونوں پھر ملے۔ کسی کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے خیال کیا۔ کس کا انتظار کر رہی ہو گی؟ مجھے جاننے کا اشتیاق ہوا۔ لیکن پھر میں اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

جب ہم تیسری دفعہ ملے میں نے ٹوپی اتار لی۔ "شام بخیر، کسی کے انتظار میں ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑی: "نہیں ...... یعنی ...... ہاں .... انتظار کر رہی ہوں"۔

"اس آدمی کے آنے تک میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"نہیں، مجھے بالکل اعتراض نہ ہوگا، شکریہ" اس نے کہا۔ "ویسے میں خصوصیت سے کسی کا انتظار بھی نہیں کر رہی ہوں۔ یونہی ہوا کھانے چلی آئی۔ ایسی پُرسکون جگہ ہے یہ"

ہم ساتھ ساتھ ٹہلنے لگے۔ یونہی ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنے بازو کا سہارا پیش کیا۔

"نہیں شکریہ" اس نے سر ہلا کر کہا۔

یونہی ٹہلنے میں کوئی مزا نہیں آ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیا سلائی جلائی؛ یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کیا بجا ہے۔ میں نے جلتی ہوئی دیا سلائی اوپر پکڑ کر اس کو بھی دیکھا۔

وہ کپکپا رہی تھی۔ جیسے سردی سے ٹھٹھر رہی ہو۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "آپ ٹھٹھر رہی ہیں، چلئے ہوٹل چل کر کچھ پئیں؟ ٹرو ای میں؟ نیشنل میں؟"

"لیکن اس وقت تو میں کہیں نہیں جا سکتی، آپ نے شاید غور نہیں کیا"

اب میں نے پہلی دفعہ دیکھا، وہ ایک سیاہ جالی ڈالے ہوئی تھی۔ میں نے معافی چاہی۔ کہ اندھیرے میں میں دیکھ نہ سکا تھا۔ اس نے جس طرح میرے عذر کو قبول کیا، یہ دیکھ کر میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ رات کو نکلنے والیوں میں سے نہیں ہے۔

"میرے بازو کا سہارا نہیں لیں گی آپ؟" میں نے پھر جرأت کی "شاید اس سے کچھ گرمی پہنچے" اس نے میرے بازو کا سہارا لے لیا۔

ہم کچھ دیر ادھر سے ادھر ٹہلتے رہے۔ اس نے پھر وقت پوچھا۔

"دس" میں نے جواب دیا "آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"گالیے کانیگوی میں"

"میں آپ کو مکان تک پہنچا سکتا ہوں؟"

"نہیں، یہ اچھا نہ ہوگا" اس نے جواب دیا "آپ برڈگیڈ پر رہتے ہیں نا؟"

"آپ کو کیسے معلوم؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اوہ میں جانتی ہوں آپ کون ہیں"

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم روشن گلیوں میں چلتے رہے۔ وہ جلدی جلدی چل رہی تھی، اس کا سیاہ نقاب پیچھے سے اُڑتا آ رہا تھا۔

"ہمیں جلدی کرنا چاہیئے" وہ بولی۔

گالیے کانیگوی میں اپنے دروازے پر رُک کر وہ میری طرف مڑی۔ شاید شکریہ ادا کرنے

کے لئے ۔ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا ۔ وہ آہستہ سے اندر گئی .... میں بھی اس کے پیچھے گیا ۔ اندر جاکر اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا ۔

تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم تیسری منزل پر آئے ۔ اس نے قفل کھولا پھر اندر جاکر ایک اور دروازہ کھولا ۔ ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی ۔ یہ ڈرائنگ روم معلوم ہوتی تھی ۔ بڑی گھڑی دیوار پر ٹنگی ٹک ٹک کر رہی تھی ۔ اندر آکر وہ ایک لمحہ کے لئے یونہی کھڑی رہی ۔ پھر میرے گرد باہیں پھینک کر مجھے جکڑ کر ، کپکپاتے ہوئے ، جلتے ہوئے ہونٹوں سے میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا ۔ ہونٹوں کا !

" بیٹھئے ، یہاں صوفہ ہے ۔ میں ابھی لیمپ جلاتی ہوں "

وہ لیمپ جلا لائی ۔

میں نے حیرت سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا ۔ میں ایک کشادہ اور سجی ہوئی ڈرائنگ روم میں تھا ۔ اور اس روم میں کئی دروازے تھے ۔ جو اندر کے دوسرے کمروں کی طرف کھلتے تھے ۔ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا آخر میں کس قسم کی عورت کے ساتھ آگیا ہوں ۔

" کتنا خوب صورت کمرہ ہے ! آپ یہیں رہتی ہیں ؟ "

" ہاں یہ میرا گھر ہے "

" آپ کا گھر ہے ؟ تو آپ اپنے والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہیں ؟ "

" او ، نہیں " وہ ہنس پڑی " میں بوڑھی عورت ہوں ، آپ ابھی دیکھ لیں گے " پھر اس نے نقاب الٹ دیا " دیکھئے ، میں نے کہا تھا نا " پھر اچانک میرے گرد اپنے بازو پھینک کر اس نے مجھے جکڑ لیا کسی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر ۔

وہ بیس بائیس برس کی ہوگی ۔ اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی ۔ اس لئے ممکن ہے وہ شادی شدہ بھی ہو ۔ خوب صورت ؟ نہیں اس کے منہ پر مہاسے تھے ۔ بھوؤں کے بال تقریباً ناپید تھے ۔ لیکن اس کے انگ انگ سے زندگی پھوٹی پڑتی تھی ۔ اور اس کا دہانہ بہت خوب صورت تھا ۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا : وہ کون ہے ؟ اس کا شوہر (اگر اس کے شوہر ہے) کہاں ہے ؟ اور میں کس کے گھر میں ہوں ۔ لیکن جب بھی میں کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولتا تو وہ مجھے بھینچ لیتی ، اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع کرتی ۔

"میرا نام یلین ہے،، اس نے بتایا: "کچھ پوگئے ؟ میں گھنٹی بجاؤں تو کسی کی نیند میں خلل نہیں ہوگا۔ اطمینان رکھئے، شاید آپ یہاں بیٹھنا پسند کریں۔ بیڈ روم میں۔ آپ یہاں آجایئے۔"

میں خواب گاہ میں چلا گیا۔ ڈرائنگ روم سے یہاں کچھ روشنی آرہی تھی۔ دو بستر لگے تھے، یلین نے گھنٹی بجائی اور شراب منگائی۔ وہ دروازے کے پاس کچھ دیر رُکی۔ میں اس سے ملنے کے لئے چند قدم آگے بڑھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ خود ہی میرے پاس آگئی۔

یہ کل شب کا قصہ تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا ؟ بے تاب نہ ہو جایئے ابھی بہت کچھ ہے !

میں جب بیدار ہوا صبح کی روشنی پردے سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ یلین بھی بیدار ہو گئی تھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی باہیں سفید اور مخملیں تھیں۔ میں نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اور اس نے اپنے ہونٹوں سے میرے ہونٹ بند کردئے۔ بڑی نرمی اور محبت سے۔

دن چڑھتا گیا۔

دو گھنٹوں بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یلین بھی اٹھ کر کپڑے پہننے لگی۔ اس نے شوز بھی پہن لئے۔ اس کے بعد میں نے کچھ ایسی چیز دیکھی کہ اب بھی ایسا لگتا ہے۔ میں نے خواب دیکھا تھا۔ یلین کو دوسری روم میں کوئی کام تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

کمرے کے بالکل درمیان میں میز پر ایک نعش رکھی ہوئی تھی۔ سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی، سفید ڈاڑھی، ایک بوڑھے مرد کی نعش۔ اس کے گھٹنے، بھینچی ہوئی مٹھیوں کی طرح چادر کے اندر نکلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ہیبت ناک تھا۔

میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا میں نے منہ پھیر لیا۔

جب یلین واپس آئی۔ میں لباس پہن چکا تھا۔ اور باہر جانے کے لئے تیار تھا۔ اب میں اس کے پیار کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اس نے چند اور کپڑے اوپر سے ڈال لئے۔ وہ مجھے نیچے تک چھوڑ آنا چاہتی تھی۔ دروازے کے پاس وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تاکہ باہر کے لوگ اسے دیکھ نہ سکیں۔

"خدا حافظ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کل تک؟" میں نے یونہی اس کا امتحان لینے کے لئے پوچھا۔

"نہیں، کل نہیں"

"کیوں؟"

"اتنے سوال نہ پوچھو میرا ایک رشتہ دار مر گیا ہے۔ کل اس کی تجہیز و تکفین ہے اب سمجھ گئے نا؟

"لیکن پرسوں؟"

"ہاں پرسوں، میں تمہیں یہاں ملوں گی، اسی دروازے کے پاس، خدا حافظ"

میں چلا آیا۔

وہ کون تھی؟ اور نعش؟ مٹھیاں بھینچی ہوی۔ ہونٹوں کے کنارے جھکے ہوئے۔

پرسوں وہ میرے آنے کی متوقع رہے گی۔ کیا مجھے جانا چاہئے۔ میں سیدھے بر نینا کیفے گیا، اور ڈائرکٹری مانگ کر دیکھی۔ گیا ملے کا نگیوی پر وہ نمبر نکالا...... وہاں اس کا نام تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کچھ دیر صبح کے اخباروں کا انتظار کیا۔ پھر اخباروں کے ملتے ہی میں نے موتوں کی فہرست پر نظر ڈالی فہرست میں سب سے اوپر اسی کا اعلان تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا" میرے شوہر ایک طویل عرصے تک بیمار رہنے کے بعد آج انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ترپن ۵۳ سال کی تھی"۔ اعلان پر پرسوں کی تاریخ تھی۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا سوچیا رہا۔ ایک مرد شادی کرتا ہے، اس کی بیوی اس سے تیس ۳۰ سال کی چھوٹی ہے۔

اور ایک دن وہ مر جاتا ہے۔ اس کی بیوہ آخر کار اطمینان کا سانس لیتی ہے۔

(نارویجن کہانی)

نٹ ہمسن (Knut Hamsun) 1859: ناروے کا مشہور مصنف جو دستاوسکی اور تھامس مین کے پایہ کا ادیب مانا جاتا ہے "Hunger" اور Growth of The Soil اس کی بہت مشہور ناولیں ہیں موخرالذکر کتاب کے لئے اسے نوبل پرائز ملا۔ "بھوک" کا لکھنے والا بد قسمتی سے اپنی ستاسویں ۸۷ سال میں ہٹلر کا حامی بن گیا تھا۔ اب اتحادیوں کی فتح کے بعد حراست میں لے لیا گیا۔

علی سردار جعفری

بھولی ہوئی یادیں

یاد تو ہوگی تجھے وہ شام جب آئی تھی تو — میری امیدوں کا پرچم بن کے لہرائی تھی تو
تپ کے نکھری تھی محبت کی سنہری آگ میں — اک بہشتِ حسن، اک فردوسِ رعنائی تھی تو

تو مری نظروں میں تھی فطرت کا شہکارِ لطیف — میرے گھر میں تو اجنتا کی حسیں تصویر تھی
میں نے دیکھا تھا جو دلکش خواب اٹھائیس سال — تیرے خط و خال میں اس خواب کی تعبیر تھی

تیرے جسمِ نور افشاں میں تھا رقصِ حسن و رنگ — تیرے دامن میں گلستاں، تیرے آنچل میں بہار
تیری پیشانی پہ تھی لاکھوں ستاروں کی چمک — تیری گردن میں پڑے تھے چاند اور سورج کے ہار

جگمگا اٹھتی تھی دنیا میرے احساسات کی — عارضوں سے جب شفق کا رنگ برساتی تھی تو
اس طرح پڑتی تھی چہرے پر تبسم کی پھوار — اک سنہرے نور میں گویا نہا جاتی تھی تو

کر رہا ہوں تازہ ان بھولی ہوئی یادوں کو پھر — کیا بتاؤں لکے کن گوشوں میں رکھونگا نہیں
روز جا کر وادیٔ صحرا سے چن لاتا ہوں پھول — یہ نہیں معلوم کن زلفوں میں گوندھونگا نہیں

احمد ندیم قاسمی

تسنیم کے نام

میں نے راتوں کو اُجالوں کی دُعائیں مانگیں
اور مقدّر سے گھٹا ٹوپ اندھیرے پائے
جھونکے چاہے، تو غضبناک بگولے اُٹھے،
پھول مانگے، تو جہنم کے پھریرے پائے
میرے وجدان نے جو راہ دکھائی تھی مجھے
اس کے ہر خم پہ تمدّن کے لٹیرے پائے
گھیر رکھا تھا جنہیں سرو و سمن نے ہر سُو
اُن گپھاؤں میں پلنگوں کے بسیرے پائے
جھٹپٹے ہی میں کٹیں زیست کی تپتی گھڑیاں
نہ ستارے ہی ملے، اور نہ سویرے پائے،
عشق کے سینکڑوں گلزار سجائے میں نے
اِن میں کوئی بھی گلگشت مگر آ نہ سکا
ذہن نے حکمت و منطق کی پناہیں ڈھونڈیں
لیکن اِس طفل کو یہ کھیل بھی بہلا نہ سکا
شاعری کی، مگر ادراک کی الجھن نہ ہٹی،
ساز اُٹھایا مگر اعجاز کا گُر پا نہ سکا
کیا کہوں کتنی گھٹاؤں کے نچوڑے دامن
کشتِ احساس پہ ایک بُوند بھی ٹپکا نہ سکا،
میں وہ تلوار ہوں جو رقص کی پیاسی ہی رہی

میں وہ پرچم ہوں جو طوفاں میں بھی لہرا نہ سکا،
ربطِ باہم کے زمانے سے تقاضے تو ہوئے
میرے جذبات کا معیار مگر عام نہ تھا
رنگ و روغن کے سراب آئے مری راہوں میں
شوقِ سجدہ مرا شرمندۂ اصنام نہ تھا
مئے گل فام کی ترکیب تھی میرا مقصود
مری نظروں میں فقط کیف نہ تھا، جام نہ تھا
کونسی رُوح تھی جو لرزہ بر اندام نہ تھی
کون قلب تھا جو کشتۂ آلام نہ تھا
قہقہوں میں اگر آنسو نظر آئے مجھکو
تو مرا ذوقِ نظر موردِ الزام نہ تھا
اتفاقات سے ہنگامۂ عالم کا وجود،
اتفاقات کی مرہونِ تب و تابِ حیات
اتفاقات کی قوت ہے قیامت کی حریف
اتفاقات کی تخلیق ہیں یزداں کے صفات
اتفاقات کا محکوم مرورِ ایّام
اتفاقات کا محتاج تغیر کا ثبات،
اتفاقات کی بے مثل مسیحائی نے
میرے وجدان کو دی تلخ تذبذب سے نجات
یہی اک لفظ مری زیست کا عنوان بنا
منتظر تھی اسی مہتاب کی ادراک کی رات
ایک ننھی سی طلب! — ایک ذرا سی تلخی!
خود مری رُوح نے آخر مجھے پہچان لیا!

"تم کہاں تھے مرے بچھڑے ہوئے بھولے بھیّا؟"
"اے بہن میں نے تجھے جان لیا، مان لیا!"
تیرے احساس سے اک ولولۂ نو پایا،
تیرے ادراک سے اک عزم کا طوفان لیا
تیرے احسان سے عرفان کی دولت پائی،
تیرے پیمان سے ایمان کا سامان لیا
جس کی لَو سے مری ہستی تھی جہنّم بکنار
تیرے دربار سے اس درد کا درمان لیا
کس قدر دُور تھے ہم، کتنے قریب آپہنچے
یہ سفر مجھ کو فراموش نہ ہوگا زنہار
میری خواہر، تری پاکیزہ محبّت پاکر
نکھر آیا ہے مرے ذوقِ نظر کا معیار
خود شناسی کے کھُلے بن ہیں مری نظروں میں
اب گرفتار تفکّر، نہ تدبّر بیمار
اب تو گریہ بھی ہے آسودہ، تبسّم بھی غنی
اب تو ہے میرے لئے خار بھی گلشن بہ کنار
اب تو ہر سانس ترے دم سے ہے موجِ تسنیم
اب دلاسوں کی طلب ہے، نہ سہارے درکار
زندگی اب مری نظروں میں ہے اک سعیِ مدام
اک لپک، ایک جھپٹ، ایک لپک، ایک خروش
جن کی تہذیب کی معراج ہے مشرق کا زوال
اب کہاں جائیں گے مغرب کے وہ انسان فروش
جوش میں آئیں گے ماحول کے دیرینہ شکار

ہوش میں آئیں گے مذہب کے پرانے مے نوش
مجھ کو قوت کی چکا چوند دکھانی ہے انہیں
روز روشن میں رہے جن کے گھروندے شب پوش
میں مشیت کا اشارہ ، میں عناصر کا جلال
کبھی بپھرے ہوئے سیلاب بھی رہتے ہیں خموش!
اب مری راہ میں حائل ہیں نہ گرداب، نہ خواب
اب بہت دور ــــ بہت دور مجھے جانا ہے،
ایک بھرپور محبت ہے نگہباں میری
اب محبت کے ہر احساس کو چونکانا ہے،
ایک نقطے پہ ہیں مرکوز مری امیدیں
اب ہر انسان کو مرکز کی طرف لانا ہے،
اعتماد ــــ اور رسائی کا مکمل ایمان
اب شکستوں پہ نہ رونا ہے نہ پچھتانا ہے
مری خواہر، مری ہمشیرہ، مری روح رواں
تجھ کو پہچان کے کونین کو پہچانا ہے!

ناہید عالم

بے آسرا

پیپل، نیم، اور شیشم تینوں درختوں کی ٹہنیاں، پھیلتے پھیلتے، اس بری طرح ایک دوسرے میں اُلجھ گئی تھیں، کہ نیچے نگاہ ڈالے بغیر یہ معلوم کرنا کہ ان تینوں کی جڑیں الگ الگ ہیں، بہت مشکل تھا۔

وہ اپنے دو منزلہ مکان کی اوپر کی منزل میں لیٹا، کھڑکی سے نظر آنے والی آسمان کی وسعتوں ہی کو دیکھ سکتا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ، لمحے دو لمحے کے لئے، کھڑکی کا سہارا لے کر، گرد و نواح میں نظر دوڑا لیتا، لیکن درخت تو اس تیزی سے بڑھ رہے تھے کہ بالکل اس کی کھڑکی پہ چھائے جاتے تھے، اس لئے ناچار خلا میں اسے انہیں کو تکتے رہنا پڑتا ۔۔۔ لیٹے لیٹے، اس کے علاوہ وہ بیچارہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ انہیں تکتا رہتا ۔۔۔ تکتا رہتا، حتیٰ کہ اکثر تو خود کو بھی ان میں سے ایک محسوس کرنے لگتا۔ لیکن وہ کیوں ان الجھی ہوئی ٹہنیوں میں الجھتا جا رہا تھا ۔۔۔؟ اُس سے کیا، اگر وہ اس حد تک، ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں؟ وہ اس الجھن کو مٹا دینا چاہتا تھا، پر الجھن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی ۔۔۔

زینے کی خاموشی میں اونچی ایڑی کی تیکھی آواز سے جل ترنگ سا بج اٹھا اور وہ کہنیوں کے سہارے تکیوں پر اوندھا ہو گیا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا، گویا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھر ایک دم پانی کھول اٹھا ہو، جلتا جلتا پانی، ایسا لگتا تھا، جیسے کسی نے دہکتی ہوئی سلائی کمر پہ پھیر دی ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں میں زور سے کمر دبا کر سیدھا لیٹ گیا، شاید کچھ آرام ملے، لیکن فوراً ہی، آہستہ سے دروازہ کھلنے کی تکلیف دہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ یوں سہم گیا، جیسے اس آواز میں بے شمار زہریلے سانپوں کی زہریلی پھنکاریں بھری ہوں۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کبھی اس آواز میں کتنی موسیقی تھی ۔۔۔ کتنا جادو ۔۔۔ شعریت! اور جب ہولے سے دروازہ کھول کر، وہ ننھا منا نازک سا جسم اندر آ پڑتا، تو اسے اپنے مختصر سے کمرے پر خوابوں کی بستی کا گمان ہونے لگتا، اور وہ اس کی دیوی ۔۔۔ پہلی بار اس نے اسے شفیق ۔۔۔ اپنے ایک ننھے دوست کے ہاں چادر پر دیکھا تھا ۔۔۔ اور دوبارہ دیکھنے کے لئے نگاہیں نہ اٹھا سکا تھا۔ خوب صورت چہرہ، جیسے چاند کی تمام نورانیاں کرنیں، ایک ہی مرکز پہ سمٹ آئی ہوں، معصوم آنکھیں ۔۔۔ اور اس قدر رسیلے پن سے

باتیں کرتی تھی وہ کہ گفتگو کے دوران میں، اُسے بے اختیار اُس پہ پیار آ گیا، اور پھر ——
وہ دن میں کئی کئی بار ملنے لگے تھے۔

اگر دنیا میں اس کا کوئی ہوتا، تو وہ ہرگز اتنی بڑی غلطی نہ کر بیٹھتا، بچپن سے اسے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے سہارے کی، جو صرف اس کا سہارا ہی نہ ہو، بلکہ جو اس کے اپاہج اعضاء میں کچھ اتنی قوت بھر دے کہ وہ خود کو کچھ بنانے کے قابل ہو سکے، ورنہ تو ہر گھڑی اسے ایسا لگتا رہتا تھا گویا کسی نے اس کے کلیجہ میں یہ بڑا سا شگاف کر دیا ہے۔ اور اسی شگاف کو پُر کرنے کے لئے اسے کسی مرہم کی ضرورت تھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ مرہم صرف ماں ہی دے سکتی ہے۔ ماں —— آہ! اس نے کبھی اپنی ماں کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ اور باپ، ماں کے مرنے کے چند سال بعد ہی مر گیا تھا، اسکول میں بے ماں باپ کا بچہ ہونے کی حیثیت سے، جب اکثر لڑکے اس سے ہمدردی کرتے، تو اسے بڑا دکھ ہوتا، اس کا اکیلے پن کا احساس اور بھی بڑھ جاتا — اور جب، لڑکے، ارمان بھرے لہجے میں اپنے والدین کا ذکر کرتے، تو اس کے ننھے سے دماغ میں، پیہم کاری ضربیں سی پڑنے لگتیں، اس کی چچی اس کے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھی، لیکن جوں ہی چچا گھر میں آتا، وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی، اور اس کے سامنے، اس کی بیحد خاطر داری کرتی، وہ الجھ کر رہ جاتا، آخر اس کی وجہ؟

وہ ہر وقت گھبرایا گھبرایا سا رہنے لگا تھا، گویا کچھ ہونے والا ہے، کچھ — جیسے ایک دم کوئی بم ہی تو پھٹ پڑے گا۔ اور اس کی یہ عادت روز بروز پختہ ہوتی جا رہی تھی، کالج میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی لڑکے اسے مطمئن نہ دیکھ سکے۔ روز بروز اس کی آنکھیں چوکنّی رہنے لگی تھیں، کچھ عجیب سی، گویا دنیا میں کوئی چیز بھی مادّی نہیں۔ ہر چیز دھوکہ ہے — سراب ہے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایک دن سراب کو حقیقت سمجھ بیٹھا، اس نے فریدہ سے شادی کر لی۔ مگر آخر وہ کب تک دھوکہ کھائے جاتا، وہ اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گیا، لیکن وہ اس سے دور ہی ہوتا چلا گیا، اس نے ہار کے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دئے۔ اسے محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے کلیجے کے شگاف کو اندر سے کھرچ کر رکھ دیا ہو۔

شادی کے چار مہینے بعد تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس نے وہ پا لیا ہے، جس کی اسے ضرورت تھی، محبت! لیکن پگلا تھا وہ بھی، شادی کے بعد چار مہینے کتنا مختصر عرصہ ہے۔ اس عرصے میں محبت پر غور کرنا ایک طرح کی حماقت ہی تو ہے۔ محبت سکون چاہتی ہے، اور شادی کے فوراً بعد سکون — عجیب کوڑھ مغزی کا سوال ہے۔

دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ نبضیں پھڑک پھڑک کر پھٹنے لگتی ہیں، اور سانس، اس کا غذ کے سانپ کی طرح ایکدم اُٹا اور رُک سا جاتا ہے۔ جسے بچے پھونک مار کے، منٹ بھر کے لئے ہوا میں مُعلّق کر دیتے ہیں۔ اس وقت تو اپنے متعلق سوچنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ کتنا عجیب! اس کی شادی ہوئی، طوفان آیا، اور پھر بیٹھ بھی گیا، یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ وہ یہ جان ہی نہ پایا، کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ کیا واقعی اس نے رضیہ سے شادی کر لی تھی؟ یا حسبِ معمول وہ کسی چھلکتے ہوئے بھنور میں اُلجھ گیا تھا۔ کیا رضیہ کے رسیلے ہونٹ۔ خوب صورت جسم، اور گرم گرم سانسیں حقیقت نہ تھی؟ کیا واقعی — ؟

رضیہ اُسے چھوڑ کر چلی جائے گی، اس کا اسے گمان بھی نہ تھا، اور اتنی جلدی، صرف اتنی سی بات پر کہ وہ اس روز اُسے ڈھونڈتا ہوا کیوں شفیق کے ہاں چلا گیا تھا! "تم کیوں میرے پیچھے پیچھے مُخبری کرتے پھرتے ہو، میں کہیں جاؤں، تم میری آزادی میں مُخل ہونے والے کون؟ میں نے شادی کی ہے، خود کو بیچا نہیں" وہ یہ سُن کر سکتے میں رہ گیا۔ اور اسے اتنا بھی نہ بتا سکا کہ وہ اُسے کسی اور وجہ سے شفیق کے ہاں ڈھونڈنے نہیں گیا تھا۔ بلکہ وہ تو اسے ایک بہت ہی مزیدار خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے ایک، دو نہیں، سینکڑوں صفائیاں بھی پیش کیں، لیکن بات وہی نہیں، بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی اور اتنی بڑھی کہ وہ اسے چھوڑ کر جانے سے باز نہ رہ سکی۔ اور پھر اسی کے کرایہ دار کے گھر۔ اُس سے اس قدر نزدیک، خدا جانے وہ اُس سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی تھی۔

کاش، اسے کوئی اور مکان مل جائے تو وہ اس مکان ہی کو چھوڑ دے، وہ سوچتا، اس پیارے گھر کو — جس میں اس کا بچپن گذرا تھا۔ اس کا لڑکپن، اس کی جوانی — اس کا ہر دکھ، درد اسی مکان میں پلا، بڑھا اور پروان چڑھا — اسی مکان میں اُس کی خوشیوں نے جنم لیا۔ اور پھر فنا ہوئیں —، اور اس کے بعد اسی مکان نے اسے جہنّم کی دہکتی ہوئی بھٹی کے دہانے جیسے عذاب تک پہنچایا۔ یہی مکان — آہ، اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود، اسے اس مکان کی اینٹ اینٹ سے محبت تھی۔ پھر بھی وہ اسے چھوڑ دے گا۔ لیکن آج کل کرائے پر مکان ملنا، نیا مکان بنانے سے زیادہ مشکل تھا۔ اس لئے وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہتا، سب کچھ برداشت کرتا۔ اسے یاد آیا کہ رضیہ کے جانے کے چھ مہینے بعد، جب عبداللہ نے اس کا دوسرا حصّہ کرائے پر لیا تھا۔ تو وہ خوش تھا کہ چلو، تھوڑی بہت دلچسپی کا سامان تو ہوا۔ کیوں کہ اس نے، اسے ایک آدھ بار شفیق کے ساتھ مرتے دیکھا اور کافی دلچسپ پایا تھا، لیکن اس نے آکر تو اس کی رہی سہی دلچسپیاں بھی چھین لیں۔

اس کے ہاں آئے ہوئے ان لوگوں کو مشکل سے پندرہ بیس روز ہوئے ہوں گے کہ ایکا ایکی عبداللہ کی بیوی، جو تین مہینے سے میکے گئی ہوئی تھی، آگئی۔ "کیوں جی" اس نے بپھر کر کہا "یہ کیسے بٹھا رکھا ہے تم نے گھر میں؟" "کوئی بھی نہیں ہے، ہیں دیکھو تو۔۔۔" عبداللہ ہکلانے لگا: "بہت. آگر ایسے ہی بدصورت تھے تم۔ تو آخر تمہاری انگلیوں کے کرتے تو نہیں۔۔۔ جو تم نے میرے سینے پر کودوں دلنے کو لے لا بٹھایا ہے" "ہیہ، ہیہیہ" وہ بے حیائی سے ہنسا "کو ٹھے پر ہی تو گئے تھے" "لیکن تم بہت کیسے ہو عبداللہ" رضیہ، جو کافی دیر سے چپ بیٹھی تھی، اپنے شوہر کی بے مروتی پر تڑپ اٹھی، "تم تو کہتے تھے کہ تم نے شادی کی ہی نہیں"

"لیکن خانم — جب تم شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجھ سے شادی کر سکتی ہو، تو کیا میں ایسا گیا گزرا ہوں" وہ نامعقول جیسی دلیلیں پیش کرنے لگا۔

"پر میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا، تمہیں معلوم تھا کہ میں اپنے شوہر کو چھوڑ چکی ہوں"

رات بھر جھک جھک ہوتی رہی۔ عبداللہ کی پہلی بیوی کسی طرح اس بات پر راضی نہ تھی کہ رضیہ اس کے گھر رہے، اور اگر رہے بھی تو اس کے میاں سے کچھ تعلق رکھے۔ گر رضیہ مصر تھی کہ جب اس نے شادی کی ہے، تو وہ اس کی بیوی بن کر رہے گی، اور بن کر دکھائے گی۔

وہ اپنے دفتر سے شام کو چار بجے واپس آ جاتا تھا، لیکن عبداللہ چونکہ اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ تھا اسے چھ، سات سے پہلے کبھی چھٹی نہ ملتی۔ اس لئے مسلسل دو گھنٹے اسے دونوں سوکنوں کی لڑائی برداشت کرنا پڑتی، اتنی زور زور سے چیختی تھیں وہ دونوں، اور لڑتے وقت اتنی گر جاتی تھیں، کہ اس کا جی بھی رو دینے کو چاہتا۔ عبداللہ آتا تو گھنٹہ بھر کے لئے لڑائی ختم ہو جاتی، لیکن پھر جیسے بارود میں چنگاری جا پڑتی، اور — "اُف، ہائے اللہ، اس کا دماغ سوچتے سوچتے آخر ایک دن پاگل ہو جائے گا۔ وہ اپنے سر کو زور سے تکیوں پر دے مارتا" کاش، مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رہے، کاش، میرے دماغ میں بھیجے کی بجائے، ایک دم پتھر ہی پتھر ٹھنس جائیں — مگر یہ خواہش کتنی طفلانہ تھی، جو کبھی پوری نہ ہوتی۔

اس کے دماغ میں، بھر ویرانیوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ پھر اس کے سینے کا شگاف پھٹتا جا رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتی بے آسرا ہوائیں، ہر گھڑی اس کے کلیجے کے پار ہوتی رہتیں۔ اور وہ سوچتا کہ کیا یہ خلش کبھی نہ مٹے گی؟ دنیا میں اور بھی تو ہیں — بالکل تنہا۔ لیکن کتنے خوش رہتے ہیں وہ، کتنی دلچسپی لیتے ہیں ہر بات میں،

اور میں —، دن بدن خلش بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر چیز مبہم ہے، دھم ہے، غیر واضح ہے۔ اور میرا دماغ ہر لحہ ان مبہم، دھم اور غیر واضح گتھیوں کو سلجھانے میں لگا رہتا ہے۔ نشا ط کی بیوی اسے چھوڑ گئی تھی، تو اس نے کہا تھا کہ وہ تھی ہی آوارہ، اچھا ہوا پنڈ چھٹا، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا، رفیعہ مجھے اب بھی اتنی ہی عزیز ہے، میں اس کے متعلق اتنے بڑے الفاظ کیسے کہہ دوں؟ مجھے تسکین نہیں ہوتی ہے۔ اضطراب بڑھتا جا رہا ہے —

اور نہ جانے کیوں چند دن سے ادھر کچھ سکون سا چھایا ہوا ہے، لڑائی کی آوازیں بالکل نہیں آتی ہیں، جانے کیسے، عبداللہ تو رات گئے گھر آتا ہے، اس روز جب وہ نشاط کے لئے زکام کی دوا لینے جا رہا تھا، تو وہ اسے ایک دبلی، نازک سی لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے، اس کشادہ سڑک پر نشے میں جھومتا ملا تھا، جانے شراب پینے لگا ہے، یا اس لڑکی کے قرب نے اسے مدہوش بنا دیا تھا۔ اس روز دونوں ہو کنوں میں کتنی لڑائی ہوئی تھی۔

"بنو، اگر تم ایسی ہی عزیز تھیں انہیں، تو آخر اب وہ راتیں باہر کیوں کاٹنے لگے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے تم ہی نے کوئی چال بازی کی ہوگی، آخر ہو نا تعلیم یافتہ —"

"ارے، تو تم بڑھتی ہی کیوں جا رہی ہو۔ دکھا دوں گی میں بھی تمہیں کہ مری جوتی کو بھی پروا نہیں ان کی، وہی مرنے گئے تھے میرے پاس" وہ ایک دم بے مدتیز ہوگئی، اور غصے سے پھنپھناتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات گئے عبداللہ گھر آیا، تو اس نے اسے بتایا، کہ وہ دن میں کسی لڑکی کو پڑھانے جایا کرے گی، کیوں کہ پیچھے اس کی بیوی اس سے بہت لڑتی ہے۔ اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی، عبداللہ نے بالکل بھی اعتراض نہ کیا، اور کہا "ٹھیک کہتی ہو، تمہارا وقت اس طرح بہتر کٹ سکے گا"!

اور پھر — سکون، خاموشی، اور ایک کرب آمیز سا سناٹا!

وہ خوش تھا کہ اب اسے اس جاں کاہ تکلیف سے نجات مل جائے گی، ہر گھڑی کی ٹک ٹک سے اس کا خون کھولتا رہتا تھا — اسے کسی طرح بھی منظور نہ تھا کہ کوئی اس کی محبوبہ کی توہین کرے، یا وہ اپنے کانوں سے اس کے لئے توہین آمیز الفاظ سنتا رہے۔

— لیکن اب بات بات پر اسے غصہ آنے لگا تھا، وہ ہر وقت جھنجھلایا رہتا۔ کبھی کبھی تو تمر

میں سخت ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ کمر پر تیزی سے کوئی چنگاری سی پھر جاتی، اور کنپٹیاں پھول کر پھٹنے پر آمادہ نظر آتیں۔ وہ بہت جلد اپنے دوستوں سے رڑپڑتا تھا، دفتر میں اس کے ماتحت اس سے تنگ آگئے تھے۔ اور حیران تھے کہ یہ وہی ہے ۔۔ وہی رحم و شرافت کا پتلا، کیوں؟ اب تو اس کی شکل بھی بھیانک ہو گئی ہے آنکھوں کا نور غائب ہوا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پتلیاں کسی روز بالکل ساکت ہو جائیں گی، اور اور ۔۔ ایک ہی جھٹکے سے ان کے خیالات کا بندھن ٹوٹ جاتا، اور ان کے قلم تیزی سے فائلوں پر چلنے لگتے۔

ایک دن وہ خلافِ معمول، دفتر سے کچھ دیر پہلے ہی اٹھ آیا۔ اس کا جی سخت گھبرا رہا تھا۔ سر میں بلا کی ٹیس تھی، شدت کا درد، زینے میں قدم رکھتے ہی وہ ایک دم گھبرا کے پیچھے ہٹا، کسی سے اس کی ٹکر ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا، ایک چوڑے سینے، پھیلے شانے اور بڑی بڑی مونچھوں والا شخص تیزی سے نیچے سے اتر رہا تھا۔ اور اوپر عبداللہ کی بیوی کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھتے ہی غڑپ سے اندر بھاگ گئی۔ اس کی طبیعت اور بھی مکدر ہو گئی، جیسے اس کے دماغ میں ایک ہی بار ہزاروں بھڑوں نے گھس کر بھنبھنانا شروع کر دیا۔ اس کی گدی میں ہتوڑے چلنے لگے، اس نے زور سے ہاتھوں میں سر دبا لیا ۔۔،

"ارے کیسی طبیعت ہے تمہاری، معلوم ہوتا ہے، کوئی دماغی دورہ آج پھر پڑا ہے" نشاط نے آکر پنکھا کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی، آج تو جسمانی تکلیف ہی ہے۔ سر ۔۔، اُف، پھٹا جا رہا ہے۔"

"روز ہی تمہارے سر میں درد رہتا ہے۔ تو آخر تم ڈاکٹر کو دکھانے سے کیوں گریز کرتے ہو؟"

"میں سوچتا تھا کہ یونہی معمولی بات ہے۔ لیکن اب تو باقاعدہ دوروں کی شکل میں درد ہونے لگا ہے۔ شام کو چلو گے میرے ساتھ؟"

"کیوں نہیں، میں تو تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں"

رات ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ابھی ڈاکٹر کے پاس سے لوٹے تھے۔

ساتھ کے مکان میں تینوں میاں بیوی، بڑی محبت سے باتیں کرتے سنائی دے رہے تھے خوب صورت خوب صورت قہقہے ڑھلکتے ہوئے اس کے صحن تک آتے تو اس کا دماغ جھنا اٹھتا، عجیب ہیں یہ لوگ بھی،

جا نے اب کیسے صلح ہو گئی، حالاں کہ اب انہیں ایک دوسرے سے بہت دور ہو جانا چاہیے تھا۔

"بھئی بخدا، کتنی قابلِ رشک ہے تمہارے ہمسائے کی زندگی، مزے سے دو بیویاں ہیں۔ اور کتنے پیار سے رہتی ہیں؟"

"ہاں بہت —" اس نے کسمسا کر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ایک جان، تین قالب ہیں، کبھی کسی کو جھنکتے ہوئے سنا ہی نہیں۔"

"ہاں — لیکن تمہیں یہاں آئے ہوئے، ابھی صرف پندرہ، بیس روز ہوئے ہیں — اور ہاں نشاط، یہ داغ کی ٹی۔ بی —"

"پاگل ہوئے ہو، کوئی ٹی۔ بی، دی۔ بی نہیں — کل کسی اور ڈاکٹر کو دکھائیں گے؟"

ساتھ کے صحن سے اب بھی قہقہے رہ رہ کے، پھیلتے، اس کے صحن تک آ رہے تھے، رینگتے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں نشاط کرسی پہ پڑا پڑا ہی اونگھ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ کمروں کی کھڑکیوں پر، دروازوں پر صحن کے کونوں میں، اور تینوں تنا ور درختوں کی چوٹیوں پر — اس کی زندگی کی خوب صورت ترین یادیں ان سے لپٹی سسک سسک کر سو چکی تھیں، اس نے اور رفیعہ نے، ان درختوں کی گھنی ٹہنیوں میں بنائے ہوئے بیسیوں پرندوں کے گھونسلوں تلے ان کے پیار کو سراہا تھا، اور — رفیعہ کے ایک بلند قہقہے نے اس کے کانوں میں کئی برچھیاں سی توڑ دیں اور وہ سوچنے لگا کہ جب یہ تینوں درخت لگائے گئے تھے، تو یہ ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے، پر اب، جڑیں الگ ہونے کے باوجود کس بری طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں —

اس کے ہاں آئے ہوئے نشاط کو تقریباً دو ڈھائی مہینے ہو گئے تھے، کہتا تو وہ یہی تھا کہ میں تمہاری خاطر یہاں آ رہا ہوں۔ لیکن دراصل بات یہ نہ تھی۔ شہر میں مکانوں کی قلت نے اسے اس کے ہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ پہلے وہ لکھنؤ سے تبدیل ہو کر وہاں آیا تھا اور جب سے ہوٹل میں رہتے رہتے اور وہاں کا کھانا کھاتے کھاتے وہ اکتا چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے مکان کے اردگرد بکھرے ہوئے جلوے — اور پھر نشاط ایسا "کلیم" مچل مچل کر لڑکیوں کو تاکتا، اور تاک تاک کر مچلتا "آف ظفر، اب تک تو زندگی بالکل ویران ہی تھی، سمجھو، لیکن آج — آج میں نے وہ دیکھ پایا ہے کہ تم دیکھو

تو تمہاری رال بھی ایک بار تو ٹپک ہی پڑے۔ سچ کہتا ہوں، اتنی رسیلی چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی، ہر چیز میں رس ہے، ہونٹوں میں، گالوں میں، آنکھوں میں، تمام جسم ہی میں، تم دیکھو گے کہ اب میری شامیں کتنی خوش گوار گزرتی ہیں" ایک شام نشاط بے حد مسرور واپس آیا، اور آتے ہی اس سے لپٹ گیا
"لیکن یہ رس کا گھڑا تم نے دیکھ کہاں لیا؟"
"ارے یہیں، تمہارے ہمسائے کے گھر ——"
"میرے ہمسائے کے گھر؟ لیکن میرے تو کئی ہمسائے ہیں، تم ——" اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔
"بھئی یہی عبداللہ، دو بیویوں والا، کتنی ناانصافی ہے کہ ایک کے پاس تو دو بیویاں ہوں اور ایک کے پاس ایک بھی نہیں، بھئی ایک وہ رکھے، ایک ہم۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا دوست "حق ہمسایہ ماں کا جایا" کیوں؟"
"ہاں — آں، او، م، م، آج میں نے ڈاکٹر کھنہ کو دکھایا تھا، وہ کہتا ہے، قطعی دماغ کی ٹی بی ہے، اب بتاؤ میرے دوست، میں کیا کروں، میں پاگل ہو جاؤں گا، میرا دماغ ——" وہ قریب قریب رو دیا۔
"بچے نہ بنو ظفر، تم ٹھیک ہو جاؤ گے"
"تو پھر کیا باقی تمام دنیا پاگل ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، کر رہی ہے ٹھیک ہی تو ہے۔ کون جانے، نہیں، میں خود پاگل ہوں، سوچتا ہوں، بس سوچے چلا جاتا ہوں، سمجھتا نہیں، میں کیوں نہیں سمجھتا؟ میں اپنے دل کو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتا۔ اسے سمجھاتے ہوئے مجھے ایک دم خوف سا آنے لگتا ہے، جیسے میں چوری کر رہا ہوں، کسی کا خون کر رہا ہوں، اُف —— میری ریڑھ کی ہڈی میں پھر چنگاریاں سی سلگ اٹھیں، دیکھو تو، میری کنپٹیوں پر جیسے کوئی آری چلائے جا رہا ہے، آ —— ہ، ذرا سا سر دبا نا نشاط، اوہ!"

وہ بے سہارا سا ہو کر بستر میں گر پڑا، اور نشاط اس کا سر تھام کر دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ اس کی حالت دن بدن گر رہی تھی۔ کوئی غیر مرئی بیدرد ہاتھ حیرت انگیز طریقے پر اس کے بھرے بھرے جسم کا گوشت نوچے لے رہا تھا، کمزوری کے مارے اس کی ہڈی ہڈی چٹخنے لگی تھی، کروٹ

لیتا تو ایسا لگتا۔ گویا بستر پہ بکھری ہوئی بے شمار چوڑیاں کٹ کٹ ٹوٹ گئی ہوں۔

نشاط اکثر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا، اسے بہلانے کی کوشش کرتا، ادھر ادھر کے دلچسپ قصے دہراتا، اور اس کے محبوب مصنفوں کی تصانیف سناتا، لیکن اس کی ہر کوشش ناکام تھی، وہ بظاہر سب کچھ سنتا ہوا نہ جانے کہاں گم رہتا، جیسے کہیں بہت دور بھٹک رہا ہو۔

میں آج کے بعد، تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی کچھ نہ سوچنے دوں گا، تم آخر کس الجھن میں پھنسے رہتے ہو؟ تم سوچو گے — میں تمہیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دوں گا۔ تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو ظفر؟" ایک دن نشاط نے تنگ آکر کہا، "گھنٹوں تمہارے سرہانے بیٹھا بکا کرتا ہوں، مگر تم نہ جانے کہاں غائب رہتے ہو، کالج کے زمانے کی تمہاری یہ عادت اب تک گئی نہیں"

"ارے خفا نہ ہو، میرے دوست، تم سناؤ، میں ہمہ تن گوش ہوں، نہیں یہ کتابیں، اب مجھے سکون نہیں بخش سکتیں، میری زندگی میں ایک بہت مختصر سا وقفہ آیا تھا، جب ان میں کیف تھا مگر اب —"

"تم نے خود اپنی زندگی کو ویران بنا رکھا ہے۔ ڈھونڈو — اور تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی تمہیں آرزو ہے"

"نہیں نشاط، مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔ میں حسرتیں اکٹھی کرنے اور ارمان کچلے جانے کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا، اُف، مجھے کچھ نہیں مل سکتا، کچھ نہیں —"

"یہی تو پاگل پن ہے تمہارا، حد سے بڑھی ہوئی شرافت میں آکر تم نے اپنی ہر خوشی کا گلہ گھونٹ دیا ہے، اب تم اچھے ہو جاؤ تو اپنے ان مفلوج خیالات کو جھٹک کر ایک نئی طرز اختیار کرنا۔ اور پھر تم دیکھو گے کہ تمہاری صبحیں کتنی خوش گوار ہیں۔ اور شامیں اس سے بھی زیادہ دل فریب"

ظفر خاموشی سے خلا میں تکتا رہا، نشاط بھی چپ ہو گیا۔

"وہاں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، مجھے انتظار ہے کسی کا شدید انتظار ہے، لیکن وہاں سے کوئی نہیں آتا۔ میری آنکھیں تھک گئی ہیں۔ کاش وہ آ جائے، موت کا پیامبر —، میں گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا ہوں کوئی نہیں بچاتا، مجھے ڈوبنے دو، نیچے — اور نیچے، حتیٰ کہ میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں دنیا میری نظروں میں ایک موہوم سا فسانہ بن جائے، — مگر —"

وہ بڑبڑاتا رہا، آہستہ آہستہ، گویا اس کی روح کسی بہت بڑے بوجھ کے نیچے تلملا رہی ہو، اور نشاط خاموش بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ اسے ایک لطیف، خوب صورت اور پرخلوص سہارے کی شدید ضرورت ہے............!

"سنو تو ــ یکایک نشاط نے اوندھے پڑے ہوئے، ظفر کو جھنجوڑ دیا ــ خدا کی قسم مزا آ گیا ــ بھئی سنو بھی۔ کل میں اور وہ کافی ہاؤس جا رہے تھے، کہ راستے میں اسے اپنے چند دوست مل گئے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ "تم چلو، میں ابھی آتی ہوں" میں نے کہا کہ بھئی ساتھ ہی چلیں گے۔ کہنے لگی کہ "مگر میرے دوست ــ؟" "تو کیا ہوا، اب میرے بھی دوست بن جائیں گے۔ میں نے کہا" لیکن" اس نے اس عجیب انداز سے مجھے گھورا کہ میں چپکے سے کھسک گیا!

بعد میں وہ مجھ پر بڑی برسی، "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ یہ میری توہین ہے۔ سوچو، اس طرح ایک دوسرے سے بدظن رہ کر ہم کیسے گزار سکیں گے؟" سنا تم نے ظفر، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے ہنھ ــ میں اتنا بھولا نہیں، جب وہ عبداللہ کو چھوڑ سکتی ہے، تو کیا مجھے ــــ"

"خدا کے لئے بند کرو نشاط۔ تم مجھے بالکل دیوانہ بنا کر چھوڑو گے۔ مجھے کچھ مت سنایا کرو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرا دماغ کسی دن پھٹ جائے گا ــــ آ ــــ ہ ــــ"

رفتہ رفتہ اس کے جسم پر بالکل گوشت نہ رہا ـ وہ بالکل ہڈیوں کی مالا بن گیا تھا۔ چلنے پھرنے اور ہلنے جلنے تک کی سکت نہ رہی۔ زیادہ بولنے، پڑھنے اور سوچنے کو ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا "اِن کے دماغ کی رگیں اس حد تک تن چکی ہیں کہ ذرا سے جھٹکے میں ٹوٹ جانے کا ڈر ہے" ڈاکٹر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

شروع شروع میں تو نشاط دن رات اس کی خدمت میں لگا رہتا، لیکن بہت جلد وہ اکتا گیا۔ صبح کو دوائیاں وغیرہ رکھ کر، وہ رات تک غائب رہتا۔ "توبہ! آج دفتر میں اتنا کام تھا، کہ سات بجے سے پہلے اٹھ ہی نہ سکا۔ اس وقت بھی جلدی جلدی تمہارے خیال سے بھاگ آیا ہوں۔ کہو طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کیا کرو" اس کے سینے سے ایک دھواں سا اٹھتا، مگر وہ بے بس ہو چکا تھا۔ بالکل مجبور ــ!

پھر بہت جلد وہ زمانہ بھی آ گیا، کہ نشاط اسے بالکل نظر انداز کر کے چھٹیاں بھی گھر ہی پر کاٹنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں ایک دم چوڑیاں بج اٹھیں، قہقہے بکھر گئے۔ اور بار بار زینے کی خاموشی

میں جل ترنگ بجنے لگا —!

اس کی سنبھلتی ہوئی طبیعت پھر گرنے لگی۔ سر درد کے دورے بڑھ گئے۔ گدّی میں تیز تیز چھریاں سی چلتی رہتیں اور ریڑھ کی ہڈی میں آگ سی آگ دہک اٹھی۔ "حالت مایوس کن ہے اور مرض لاعلاج۔" ڈاکٹر نے کہا: "صرف ایک وقتی علاج ہے" اور وہ پچکاری کے ذریعہ ریڑھ کی ہڈی میں سے کھولتا ہوا پانی نکالنا، اس سے شاید کچھ دیر کے لئے سکون مل سکے۔"

"تو آپ ہر روز خود آکر پانی نکال جایا کیجئے۔" نشاط نے لاپرواہی سے کہا: "روز روز ہسپتال لے جانا تو مشکل ہے اور فیس آپ چاہیں تو ہفتے بھر کی اکٹھی لے لیا کیجئے گا۔ ورنہ جیسے آپ کہیں گے —"

نشاط اور ڈاکٹر دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ بہت مالدار ہے۔

ڈاکٹر ہر روز آکر کبھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے اور کبھی گدّی میں سے پچکاری بھر کے پانی نکال لیتا تو کچھ دیر کے لئے بے چینی کم ہو جاتی، لیکن اس کے سکون کو بکھیرنے کے لئے جل ترنگ —،

ابھی ابھی ڈاکٹر اس کی ریڑھ کی ہڈی ہی سے پانی نکال کر گیا تھا، اور وہ کچھ سکون سا محسوس کر رہا تھا کہ نشاط اور رضیہ کے ایک پیار بھرے قہقہے نے اس کی حالت پھر بگاڑ دی، سر میں زور کا درد ہوا تھا اور وہ کہنیوں کے سہارے تکیوں پر اوندھا ہو گیا۔

"........ تو تمہارا کیا خیال ہے؟ میرے خیال میں تو تمہیں ضرور کسی پہاڑ پر چلے جانا چاہئے"

"ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میرے ساتھ جانے والا کوئی نہیں۔ دیکھتے ہو، میں اکیلے سفر کرنے کے بالکل قابل نہیں"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میرا ایک دوست ہے ڈاکٹر وحید، کہو تو اسے تمہارے ساتھ بھیج دوں اول تو میں خود ہی کوشش کروں گا کہ چند روز کی چھٹی مل جائے —"

"نہیں تم اپنے دوست ہی کو میرے ساتھ بھیج دینا۔ اگلے ہفتے میں ضرور روانہ ہو جاؤں گا یہاں کی زندگی اب ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔" "ٹھیک کہتے ہو، ایک جگہ پڑا پڑا آدمی گھبرا ہی جاتا ہے" اگلے ہفتے —،

رات گئے، اپنے چھوٹے سے زینے کو مجبوراً نظر انداز کر کے، جب وہ عبداللہ کی طرف کے زینے

(عبداللہ کے گھر کا ایک دروازہ، اس کے زینے میں بھی کھلتا تھا) میں سے نیچے اتارنے کے لئے، اس کے برآمدے میں سے لیجایا جا رہا تھا تو اس نے دیکھا، عبداللہ اپنی دونوں بیویوں کے درمیان بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا اور اس کی دونوں بیویوں کے خوابیدہ ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ — لیکن یہ مسکراہٹ عبداللہ کے لئے نہ تھی — عبداللہ کی مسکراہٹ ان کے لئے نہ تھی —، رفیعہ، نشاط، عبداللہ، جولی — اور وہ مونچھوں والا — وہ الجھنے لگا، اسے محسوس ہوا جیسے ایک آندھی اٹھی ہے۔ کالی آندھی — اور وہ اس میں ناچتے ہوئے کسی بگولے میں مقید ہو گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کامل ایسی سیاہی۔

لیکن جب وہ نیچے اُترا تو چاند بڑی فراخدلی سے اپنا نور لٹا رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ گویا وہ کسی سخت قید کے بعد رہا ہوا ہو۔

تھوڑی دیر بعد، ڈاکٹر وحید بھی اپنا سامان لے کر آ گیا، اور نشاط کی مدد سے اسے ٹیکسی میں ڈال کر، جب اس نے اس کے سرہانے کئی تکیے لگا دئے، تو ذرا سا اُچک کر، اس نے ایک آخری نظر اپنے مکان پر ڈالی، مکان درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا، اور تینوں درختوں کی ٹہنیاں، چاند کی لٹی ہوئی روشنی میں، ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر نہ جانے کب کی سو چکی تھیں۔

اس نے مضطرب ہو کر اپنا سر جھٹک دیا "آہ، میں کتنا اکیلا ہوں، اداس اور بے آسرا" اس کے دماغ میں بار بار کوئی زخم خوردہ پرندہ پھڑپھڑانے لگا، تڑپنے لگا۔

جاوید اقبال

پیغمبر

(ایک باطنی تمثیلچہ)

منظر :- کسی مغنیہ کے مکان کی اوپر کی منزل

فرش پر ایک طرف وسیع مسند کی سفید چادر پہ جا بجا پان کی پیک کے دھبے اور پژمردہ پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ گاؤ تکیے، اگال دان، شراب کی خالی بوتلیں اور ساز وغیرہ بھی وہیں بغیر کسی ترتیب کے رکھے ہوئے ہیں۔

کمرے کی مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو نیچے بازار میں اترنے کے لئے سیڑھیوں کی جانب کھلتا ہے۔ دوسرا دروازہ مشرقی دیوار میں ہے جو اس کمرے کو دوسرے سے ملاتا ہے دونوں دروازوں پر بھدے اور میلے سے پردے آویزاں ہیں۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی ہے، جسے ہوا آنے کی غرض سے ارادتاً کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کمرے کو بجلی کے قمقمے نے بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔

رات کے دو بج چکے ہیں مسلسل بارش کی وجہ سے بازار سنسان پڑے ہیں۔ آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں کی بھیانک گرج کبھی کبھار کمرے کی فضا کو متزلزل کر دیتی ہے۔ بسا اوقات کھڑکی سے بجلی کی چمک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ جب ہوا کا کوئی اکا دکا جھونکا کمرے میں آ جاتا ہے تو پردے لرز اٹھتے ہیں۔

مغنیہ کھڑکی میں کھڑی تھکی تھکی نگاہوں سے بارش کا نظارہ دیکھ رہی ہے مغربی دروازے کے قریب دو نشہ سے لڑکھڑاتے ہوئے نوجوان تیسرے سے مخاطب ہو رہے ہیں جو گاؤ تکیہ اپنی رانوں پہ رکھے ابھی تک مسند پر بیٹھا ہے اور جس کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اپنا دماغی توازن مکمل طور پر کھو چکا ہے۔

پہلا نوجوان :- (تیسرے کو آہستہ سے جھنجھوڑتے ہوئے، پیار بھرے لہجہ میں) سعید میاں، مرے بھائی اب اٹھو نا!!

سعید :- (بے پروائی سے) نہیں، نہیں! کئی بار کہہ چکا ہوں میں نہیں اٹھوں گا.

دوسرا نوجوان :- (پھیکی ہنسی کے ساتھ) کیا آج پھر یہیں رات گزارنے کا ارادہ ہے ؟!

سعید :- (انبساط سے سر ہلاتے ہوئے) ہوں — بالکل یہیں (خالی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اپنی بغیر کفن کی لاشوں کے درمیان .

پہلا نوجوان :- (مغنّیہ سے) ثریّا! اسے تم ہی کہو، یہ تو لیٹا جا رہا ہے .

ثریا :- (کھڑکی سے مڑ کر نہایت سنجیدگی سے مسند کی طرف آتے ہوئے) سنئے —؟!

سعید :- (نشہ کی لَے میں) کون ؟!

ثریا :- (اسی سنجیدگی سے) میں ثریا ہوں —

سعید :- (مسکراتے ہوئے) ثریا ؟! خاک نشیں سے ثریا ہم کلام ہو، زہے نصیب!

ثریا :- (اسی انداز میں) آپ کے دوست جا رہے ہیں .

سعید :- (بغیر توجہ دئے) ایک بار پھر، وہی — آخری وقت کیا خاک مسلماں ہوں گے (التجا کرتے ہوئے) ثریا! میری طرف دیکھو — صرف ایک بار!!

پہلا نوجوان :- (نرم لہجے میں) سازندے سب جا چکے ہیں .

سعید :- (غصہ سے) تو کیا ہوا —؟!!

ثریا :- (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) کل سنا دوں گی، اب میں تھک گئی ہوں

سعید :- (ضد کرتے ہوئے) میں غزل سنے بغیر بالکل نہ جاؤں گا .

دوسرا نوجوان :- (پیار سے) ضد نہ کرو سعید! رات بیتے جا رہی ہے، ہمیں کوئی سواری نہ ملے

سعید :- (اسی انداز میں) تم جاؤ، مجھے اپنے ساتھ کیوں گھسیٹ رہے ہو ؟!

پہلا نوجوان :- (دوسرے سے) چلو شجاع! اسے یہیں رہنے دو . دیکھ نہیں رہے آج کی رات کس قدر دل آویز ہے . بھلا یہ ہمارے ساتھ کہاں بھٹکے گا .

دوسرا نوجوان :- (سعید سے آخری مرتبہ پوچھتے ہوئے) صاف صاف کہو چل رہے ہو ؟

سعید :- (حقارت سے) نہیں!!

دوسرا نوجوان :- (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا تو خدا حافظ!!

سعید :- (بے پرواہی سے) خدا حافظ!!

(دونوں نوجوان سیڑھیاں اتر جاتے ہیں. اب کمرے میں سعید اور ثریا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے. بارش ابھی تک نہیں تھمی، بادل اسی طرح گرج رہے ہیں)

ثریا :- (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے، بے پرواہی سے) جاؤ، تمہارے دوست نیچے اتر گئے ہیں. تم بھی ———

سعید :- (قدرے کرختگی سے) میں آج شب یہیں گزاروں گا.

ثریا :- (یک دم مڑتے ہوئے، حقارت وغصہ سے) نہیں، یہ نہیں ہوسکتا.

سعید :- (دردناک لہجے میں) آج میں بڑا اداس ہوں ثریا! میں چاہتا ہوں کوئی میرے پاس بیٹھے. میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے اور میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر مجھ سے کہے ... مجھ سے کہے ——— ثریا خدارا انکار نہ کرو. میں رو دوں گا. کیا تم میرے آنسو بہتے دیکھ سکو گی؟ تم تو کہا کرتی تھیں کہ تم سے کسی کا رونا دیکھا نہیں جاتا (بھرائی ہوئی آواز میں) آج میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں ثریا ——— ادھر آؤ.

ثریا :- (بغیر مڑے افسردگی سے) تم کئی بار بتا چکے ہو.

سعید :- (بناوٹی تعجب سے) کیا-؟!

ثریا :- (اسی انداز میں) یہی کہ تمہاری زندگی میں کسی قابل پرستش عورت کا دخل نہیں ہے

سعید :- (پھیکی ہنسی کے ساتھ) تو کیا ہوا؟!

ثریا :- (جاری رکھتے ہوئے) تم اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو، اور ..... اور شاید اس لئے معصوم ہو کیوں کہ تم قصداً کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے.

سعید :- (سنجیدگی سے) نہیں، میں آج تمہیں کچھ اور بتاؤں گا.

ثریا :- (پھر غصہ میں مڑتے ہوئے) میں کچھ نہ سنوں گی. تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ.

سعید :- (اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) چلا جاتا ہوں ——— (اندوہ گیں لہجہ میں) تم اس قدر روکھے پن سے کیوں پیش آرہی ہو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟! (ثریا بغیر جواب دئے کھڑکی کو بند

کرنے لگتی ہے) سنو — اس کھڑکی کو کھلا رہنے دو، میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں .... میں چلا جاؤں گا۔ ابھی تک میرے حواس منتشر ہیں، مجھے انہیں یک جا اکٹھا کرنے کی تو مہلت دے دو۔

ثریا :- (بے پرواہی سے) لو، جس وقت جی چاہے، چلے جانا —

(ثریا کھڑکی کو ویسے ہی کھلا چھوڑ کے مشرقی دروازے کی طرف مڑتی ہے اور بتی بجھا کر ملحقہ کمرے میں غائب ہو جاتی ہے)

سعید :- (تعجب سے) یہ .... یہ بتی کیوں بجھا دی؟! ثریا — میں نے کہا، کیا تم سن رہی ہو؟! (کمرے میں اس قدر تاریکی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا۔ بارش ابھی تک نہیں تھمی، بادل اسی طرح گرج رہے ہیں۔ جب کسی وقت بجلی چمکتی ہے تو کمرے میں تیز روشنی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے) ثریا —! (پھر خود بخود) مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے اٹھا کیوں نہیں جاتا (حقارت سے) میں نے اس کی ہر ادنےٰ فرمائش پر پانی کی طرح روپیہ صرف کیا ہے۔ میں اس کے در پہ سسکتا ہوا بھکاری تو نہیں ہوں — وہ مجھے کیوں اندھیرے میں چھوڑ جائے — آخر کیوں؟! (لحہ بہ لحہ فرش سے مانوس شعاعیں نکلتی ہیں) مجھے نکلنے کو کہے —؟! توبہ، کس قدر ذلت ہے (تمام کمرے میں ایک پراسرار سی روشنی پھیل جاتی ہے) وہ مجھے شرابی، آوارہ، بدکار سمجھے اور مجھ میں اتنی قوت نہ ہو کہ یہاں سے اٹھ بھی سکوں — (بادلوں کی گرج میں ہچکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے) میرے ہاتھ پاؤں کیوں شل ہو گئے ہیں؟! (مشرقی دیوار پر ایک مہیب سایہ سا دکھائی دے رہا ہے جیسے کوئی خمیدہ کمر بوڑھیا اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی رو رہی ہو) مجھے کس نے جکڑ رکھا ہے —؟! (بے بسی سے) کس قدر شرم کا مقام ہے، کچھ دکھائی نہیں دیتا — (پھر اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) آہ — (معاً اپنے سامنے سایہ کو دیکھ کر) کون؟! (خاموشی سے ہچکیوں کی آواز سنتے ہوئے) میں کہتا ہوں کون ہے؟! (آنکھیں ملتے ہوئے گرجدار لہجے میں) کون ہو سکتا ہے — (پھر چاروں طرف دیکھ کر) کوئی بھی تو نہیں — (قدرے گھبراتے ہوئے) مگر یہ سایہ .... یہ — (ایک دم خوف سے چیختے ہوئے) ک ... کون رو رہا ہے؟!

(سایہ دیکھتے دیکھتے ہی اس پُراسرار روشنی میں گھل کر مفقود ہو جاتا ہے۔ فرش سے ہولے ہولے دھند سی اٹھتی ہے۔ جوں جوں یہ دھند چھت کی طرف بڑھتی ہے کمرے میں روشنی کی شدت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد دھند میں ایک مورت سی

نظر آتی ہے جس کے خد و خال تو نمایاں نہیں ہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی طویل قد
بھڑکیلا سفید لبادہ پہنے کھڑا ہو اور جس کی پیٹھ سے نکلے ہوئے سفید پرشانوں سے
بہت اوپر تک ایک قوس کی طرح بل کھائے ہوں۔

اب فضا یکلخت بدل گئی ہے اور کھڑکی سے ستارے چمکتے دکھائی دے رہے ہیں
رات نہایت پرسکون اور خاموش ہے گویا طوفان آیا ہی نہ تھا)

صورت :- (بھاری آواز میں) تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو — کیا میں نے تمہیں —

سعید :- (مبہوت ہوتے ہوئے) میں ... میں —

صورت :- (محبت بھرے لہجے میں) کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟!

سعید :- (ڈرتے ڈرتے) وہ ... وہ دیوار پر — وہ دیوار پر کس کا سایہ ہے؟!

صورت :- (دیوار کی طرف دیکھ کر) مجھے تو کوئی سایہ دکھائی نہیں دے رہا۔

سعید :- (لرزتے ہوئے) ابھی ... ابھی تھا — (پھر خوف سے چیختے ہوئے) مگر - تم کون ہو؟!

صورت :- (مسکراتے ہوئے) میں آسمانوں سے اترا ہوا فرشتہ ہوں۔

سعید :- (مرتعش لہجے میں) ف ... فرشتہ —؟!!

فرشتہ :- (محبت بھرے لہجے میں) مجھے اپنے قریب بیٹھنے دو۔

سعید :- (پھر چیختے ہوئے) تم ... تم یہاں کیا لینے آئے ہو — میرے پاس کیا رکھا ہے
میں تمہیں —

فرشتہ :- (اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) آہستہ بولو — (پھر کھڑکی کی طرف
دیکھ کر) دیکھو، رات کس قدر خاموش ہے۔ اس کے سانس تک نہیں گنے جا سکتے۔ ایسے دکھائی دیتا ہے گویا کوئی
دن بھر کی تھکی ہوئی دوشیزہ سیاہ رنگ کے سلمٰی ستاروں ٹنکے ریشمی دوپٹے میں لپٹی میٹھی نیند سو رہی
ہو۔ اگر تم نے یوں شور مچایا تو اس کی نیند کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

سعید :- (جرأت سے) میرے سوال کا جواب دو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو —؟!

فرشتہ :- (بآواز بلند) دنیا باری تعالیٰ کو فراموش کرتی جا رہی ہے۔ جو دعائیں افلاک تک
پہنچتی ہیں ان میں خلوص و تقدس کی جگہ رفتہ رفتہ معمول لے رہا ہے۔ قادرِ مطلق نے مجھے نزول کا حکم دیا

ہے تاکہ میں یہاں کسی ایسے شخص کی تلاش کرسکوں جو اس کا پیغام دوسرے انسانوں تک پہنچادے ۔ خالقِ کل نے ہمیشہ مخلوق کی تقصیروں کو بخشا ہے، وہ ہر آلودۂ معصیت کے گناہوں کو ثوابوں میں تبدیل کر سکتا ہے ۔ اس لئے اسے یوں نظر انداز کرنا بنی نوع انسان کی شدید ترین غلطی ہے ۔ جس کا اجر اسے دوزخ میں مسلسل عذاب کی صورت میں دیا جائے گا ـــ

سعید :۔ (لرزتے ہوئے) دوزخ میں ـــ ؟!

فرشتہ :۔ (جاری رکھتے ہوئے) آگ کے اس بیکراں سمندر میں جس کی وسعت دیکھ کر ازل و ابد تک خوف کے مارے اپنے چہرے پردوں میں چھپا لیتی ہیں ـــ (کچھ وقفہ کے بعد، سرگوشی کر ہوئے) کیا تم ذاتِ پاک کا پیغامبر بننا قبول کرو گے ؟!

سعید :۔ (حیرانی و خوف سے) م...میں ـــ ؟! تمہیں غلطی لگی ہے ـــ

فرشتہ :۔ (طنزاً مسکراتے ہوئے) تم جانتے ہو میں انسان نہیں ہوں

سعید :۔ (بڑبڑاتے ہوئے) پیغمبر ـــ ! (پھر چیختے ہوئے) نہیں، نہیں ـــ یہ ممکن نہ ہوسکتا ۔ تم... تم دیکھتے نہیں، میری شلوار کے پائینچے پر قے کے زرد دھبے ہیں ـــ یہ ... یہ میری قمیص پر پان کی پیکوں کے لاتعداد نشان ہیں ـــ میرے گلے میں سڑے ہوئے باسی پھولوں کا ہار ہے ـــ میر کانوں میں غلیظ روئی کے پھریرے ہیں ۔ میں... میں کچھ سن نہیں سکتا ـــ نہیں، نہیں ـــ مجھ سے دو رہو ۔ تمہیں میرے منہ سے بدبو نہیں آرہی ـــ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ تم کسی بدرو کے کنارے کھڑ

فرشتہ :۔ (قریب آتے ہوئے، تسلی آمیز لہجے میں) بالکل نہیں ـــ

سعید :۔ (بغیر توجہ دئے، ایک بے بسی کے عالم میں) تمہارا یہ سفید لبادہ، نوزائیدہ بچے کی فطرت کی طرح بے داغ ۔ ان یخ بستہ مرمریں پروں پہ ابھی تک الجھے ہوئے اوس کے قطرے ـــ آہ، گویا مہ کی دو پھانکیں کاٹ کر کسی نے ازراہِ مذاق تمہارے کندھوں پہ جڑ دی ہوں ۔ کس قدر مقدس دل لگی ـــ (پھر چیختے ہوئے) م... مجھے ہاتھ نہ لگاؤ ـــ میں کہتا ہوں ہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے (ساکن و خا فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے ۔ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ایک درخشاں ستارہ ٹوٹتا ہے اور ا پیچھے سرخ روشنی کی طویل لکیر چھوڑتا ہوا، کھڑکی کے رستے کمرے میں داخل ہو کر فرشتے اور سعید کے د آگرتا ہے) یہ... یہ کھڑکی سے انگارا کس نے گرایا ـــ ؟!

فرشتہ :- (جھکتے ہوئے) مبارک ہو ــ باری تعالیٰ نے آسمان پر لٹکتے ستاروں میں سے ایک درخشاں ستارہ توڑ کر تمہاری طرف پھینکا ہے۔ تم چُن لئے گئے ہو۔ اٹھاؤ اپنی سند ــ آج سے تم ــ

سعید :- (پھر چیختے ہوئے) نہیں، نہیں ــ میں اسے نہ چھوؤں گا۔ میں اس قابل نہیں ہوں ــ میری انگلیاں ــ

فرشتہ :- (کرختگی سے) تمہیں اسے اُٹھانا پڑے گا ــ

سعید :- (خوف سے بالکل دیوانہ ہوتے ہوئے) ثریّا! ثریّا!! ثریّا ــ!!! (سعید چیخے جا رہا ہے، اور ساتھ ہی لڑکھڑاتے قدموں سے دیواروں کا سہارا لئے بالکل جنونیوں کی طرح کمرے میں [illegible] رہا ہے۔ جوں جوں اس کی چیخیں گونجتی ہیں، فرش سے نکلتی ہوئی شعاعیں اور دھند فرشتے سمیت [illegible] میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُسی طرح باہر فضا بھی لوٹتی آ رہی ہے۔ بادلوں کی گرج نے شدت اختیار [illegible] ہے۔ بارش ابھی تک نہیں رُکی۔ جب کبھی بجلی کڑکتی ہے۔ تو کمرے میں تیز روشنی کا ایک سیلاب آ جاتا ہے [illegible] وقفہ کے بعد ثریّا ہاتھوں میں فانوس اٹھائے داخل ہوتی ہے۔ فانوس کی پھیکی سی روشنی میں ان دونوں [illegible] خدوخال بے حد بھیانک نظر آ رہے ہیں۔ دیواروں پہ ان کے ٹیڑھے اور طویل سائے لرز رہے ہیں)۔

[illegible] یا ــ! تم کہاں ہو ــ

ثریّا :- (بے پرواہی سے) کیوں، کیا ہے؟!

سعید :- (مرتعش لہجے میں) ثریّا ــ ثریّا! کیا تم ابھی ابھی یہاں آئی تھیں؟!

ثریا :- (اسی انداز میں) نہیں ــ میرا خیال تھا، تم جا چکے ہو۔ میں تو سیڑھیوں کا دروازہ [illegible] کرنے آئی تھی۔

سعید :- (کانپتے ہوئے) اوہ، پھر یہاں کون ــ (شدتِ خوف سے چیختے ہوئے) اس [illegible] کو جلا دو، مجھے تم سے خوف آ رہا ہے۔ میں تمہیں شناخت نہیں کر سکتا، ثریّا ــ فانوس کی روشنی [illegible] قدر زرد ہے۔ مجھے تمہارے خدوخال سے خوف آ رہا ہے، مجھے اپنے آپ سے خوف آ رہا ہے (سرگوشی [illegible] تے ہوئے) دیکھو ــ دیواروں پر ہمارے دیوقامت سائے ہمارے جامد رہنے کے باوجود بھی متحرک [illegible] آتے ہیں م... میں سوچ رہا ہوں ثریا ــ کہیں ہم دونوں ارض سے منسلک کوئی بھٹکتی ہوئی تمنا سا [illegible] میں تو نہیں، جنہیں تقدیر نے اس کھنڈر میں اچانک ایک دوسری کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہو ــ

ثریا :- (بغیر دھیان دئے) تم ابھی تک گئے نہیں ؟!

سعید :- (اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے) م... میں جانے ہی والا تھا ــــ (پھر یکدم خوف زدہ ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) مگر ثریاّ ــــ مجھے آج رات یہیں گذار لینے دو، طوفان میری راہ روکے کھڑا ہے۔ م... مجھے ڈر لگ رہا ہے ثریاّ ــــ یہ... یہ دیکھو، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میری انگلیاں ــــ (پھر سرگوشی کرتے ہوئے) ابھی ابھی یہاں کوئی موجود تھا، میں نے کسی کو بولتے سنا ہے (دردناک لہجے میں) ثریا! مجھے آج شب باہر نہ نکلنے دو۔ مجھے نہ بھیجو ــــ میں تمہاری التجا کرتا ہوں۔

ثریا :- (جذبات سے بے قابو ہو کر پھوٹ کر روتے ہوئے) میں ابھی تک ضبط کئے بیٹھی تھی، ــــ اب تم نے بھی ــــ (بھرائی ہوی آواز میں) میرے سامنے یوں التجائیں نہ کرو۔ میں تمہیں ٹھہرا نہیں سکتی ــــ م... میں مجبور ہوں ــــ

سعید :- (آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کو انگلیوں کے سہارے اوپر اٹھاتے ہوئے، نہایت حسرت ناک لہجے میں) ادھر دیکھو ــــ میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں ثریاّ ــــ تمہارے سینے میں نفرت کرنے والا دل نہیں ہے تمہیں تو اگر کوئی بھی پیار سے ثریا کہہ کر پکارے تو تمہاری آنکھوں سے اشکوں کی لڑیاں بہہ نکلتی ہیں ــــ (پھر خوف سے کانپتے ہوئے) م... مگر آج ــــ کس قدر تاریک رات ہے (پھر بے قابو ہوتے ہوئے) مجھ سے تنہا چلا نہ جائے گا ثریاّ ــــ مجھے بازاروں کی ویرانی ڈرائے گی ــــ مجھے یہیں ٹھہرنے کی اجازت دے دو۔

ثریا :- (بھرائی ہوی آواز میں) نہیں، نہیں ــــ پہلی مرتبہ جب تم نے یہاں شب گزاری تھی اسی رات سے مجھے اس فرش سے عجیب شعائیں سی نکلتی دکھائی دیتی ہیں ــــ (سرگوشی کرتے ہوئے) ہچکیوں کی آوازیں آتی ہیں اور دیوار پر ایک مہیب سایہ سا نظر آتا ہے، جیسے... جیسے کوئی خمیدہ کمر بڑھیا اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی رو رہی ہو ــــ

سعید :- (پھٹی پھٹی آنکھوں سے) ک... کیا کہا ــــ ؟!

ثریاّ :- (پھر بھرائی ہوی آواز میں) کچھ نہیں ــــ خدا را یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس نے ابھی تک کچھ کھایا نہ ہو گا۔

سعید :- (مرتعش لہجے میں) جاتا ہوں — جاتا ہوں — (پھر اندھوں کی طرح فرش پر ہاتھوں سے کچھ ٹٹولتے ہوئے) وہ ... وہ —

ثریا :- (اسی انداز میں) کیا ڈھونڈ رہے ہو ؟!

سعید :- (دھیمے لہجے میں) ستارہ — ابھی آسمان سے ٹوٹ کر یہاں فرش پر گرا تھا۔

ثریا :- (بے پروائی سے) صبح جھاڑو دیتے وقت اگر میری نظر پڑ گیا تو تمہیں کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔

سعید :- (لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک پہنچتے ہوئے) اچھا، اچھا — (پھر ٹھٹکتے ہوئے) ثریا ؟!

ثریا :- (بھرائی ہوئی آواز میں) بولو —

سعید :- (تعجب سے پوچھتے ہوئے) کیا واقعی دنیا میں بدکاری بڑھ گئی ہے ؟!

ثریا :- (بے پروائی سے) مجھے معلوم نہیں۔

سعید :- (پیار سے) اگر میں تمہیں کہوں کہ خدا نے مجھے پیغمبر چن لیا ہے تو کیا میں تمہاری توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکوں گا ؟!

ثریا :- (اسی بے پروائی سے) تم پر ابھی تک شراب حاوی ہے۔

سعید :- (سیڑھیاں اترنے سے پیشتر) ممکن ہے تم درست کہتی ہو، مگر میرا تو خیال تھا کہ میں —

(بادلوں کی وحشت ناک گرج سعید کے آخری الفاظ کو نگل جاتی ہے۔ وہ سیڑھیاں اتر جاتا ہے۔ بارش ابھی تک اسی طرح جاری ہے۔ بازار سنسان پڑے ہیں۔)

— پردہ —

کمال احمد صدیقی

غزل

حقیقتوں کا عکس ایک خواب زار ہی نہ ہو

یہ آئینہ خرام زیست کا غبار ہی نہ ہو!

فضاؤں کا سکوت خشک تیوں کے ساز پر

کہیں اداس لَے میں نغمۂ بہار ہی نہ ہو!

عروس شام کی جبیں پہ سُرخ نیم دائرہ

کسی سنہرے آفتاب کا مزار ہی نہ ہو!

"سکوں" ملا تو ہر خیال خواب بن کے کھو گیا

"سکوں" ہماری قوتوں کا انتشار ہی نہ ہو!

خود اپنی الجھنوں میں زندگی بھٹک کے رہ گئی

حقیقتوں سے کھیلنا بھی اک فرار ہی نہ ہو!

سرود و رقص و جام و ساز و ساقیِ طرب نواز

بہشت بھی تخیل گناہ گار ہی نہ ہو!!

لطیف انور

غزل

یہ میرے عالمِ ہستی میں اہتمام ہے کیا
نمودِ صبح ہے کیا، تیرگیٔ شام ہے کیا

سکوتِ بزم میں گنجائشِ کلام ہے کیا؟
مرا پیام یہی ہے، مرا پیام ہے کیا

ابھی شریکِ محبت نہیں نشاطِ الم،
ابھی مذاقِ دل و دیدہ ناتمام ہے کیا

کہاں پہنچ کے پکاروں جہان والوں کو،
ترے جہان میں اب تک مرا مقام ہے کیا

زمانہ جب کوئی تعبیر دے نہیں سکتا
تو پھر یہ خوابِ محبت خیالِ خام ہے کیا

کرے نہ دوریٔ منزل کا تذکرہ مجھ سے
مرا شریکِ سفر مجھ سے تیز گام ہے کیا

نہ صبحِ وصل نہ شامِ فراق ہے انورؔ
مرے جہاں میں یہ اندازِ صبح و شام ہے کیا

عبدالمتین عارف

انگڑائی

کس قدر گہری خامشی ہے محیط
بام و در یوں فسردہ خاطر ہیں
غالباً نصف رات بیت چکی!
بے بسی جیسے ان کو جیت چکی!

چاند مغرب کے ایک گوشہ میں
کسمساتے ہیں کس لئے تارے
جانے کیوں منہ چھپا کے روتا ہی
جب کہ عالم تمام سوتا ہے!

ایک بھیانک، مہیب سپنے نے
رہ گزاروں پہ بھونکتے کتے،
پھونک ڈالا ہے میرا گلشن خواب
بھر رہے ہیں حیات میں زہراب!

ایک مبہم سکوت کی باہیں،
کچھلا جاتا ہے آہ میرا وجود،
جکڑے لیتی ہیں مجھ کو شدت سے
اپنی ہی قوتوں کی حدت سے

میری آغوش میں ہے محو خواب
چمن زلیست کا اچھوتا پھول،
میری ملکہ، مری مہارانی،
جس کی خوشبو ہے حشر سامانی

اس کی سانسوں کے یہ تھکے انداز
دن کی محنت سے چور جسم جواں
بے پناہ ماندگی کے ہیں غماز
بن رہا ہے آداسیوں کا ساز!

ہائے کتنے ملول نغمے ہیں
کتنے مایوس، کتنے تیرہ و تار

سنتا جاتا ہوں جیسے جیسے اُنہیں
بڑھتا جاتا ہے آنسوؤں کا نکھار

سوچتا ہوں مری رفیقۂ زیست
یہ مرے گھر کی ضوفشاں قندیل،
قبل از وقت ڈھلتی جاتی ہے
شام ہی کو پگھلتی جاتی ہے

کیا یہ شمع حسیں، یہ غیرت مہ،
کیا یہ فکر معاش کی آندھی
رات بھر بھی نہ جگمگائے گی
کچی کلیاں بھی روند جائے گی

میری ہمدم کے احمریں رخسار
اس کے جوبن کی گرم محرابیں
زرد پڑنے کے واسطے تو نہیں
سرد پڑنے کے واسطے تو نہیں

اَدھ کھلے گل مَسَل دیئے جائیں
یہ تو افیون زرگراں ہے کہ جو
یہ مشیت نہیں، نہیں زنہار
ہم غریبوں کو بخشتی ہے قرار

جانے مجھ جیسے کتنے نازک دل
جانے مجھ جیسے کتنے تاروں کو
ان جفاکاروں سے دکھے ہوں گے
یہ سیہ ناگ ڈس چکے ہوں گے

میری محبوب، اب تری خاطر
شعلۂ انتقام بھڑکائے
مجھکو ان موذیوں سے لڑنا ہے
رعد کی طرح سے بپھرنا ہے

یہ محلات جن کی اینٹوں سے
ان محلات کے مکینوں سے
بے نواؤں کا رس رہا ہے لہو
مجھکو لینا ہے خون بہر وضو!

تیری ان الجھی سی زلفوں میں
تیرے ان خشک مُردہ ہونٹوں سے
مجھکو اب سیمیں تارے چننے ہیں
زندگی کے ترانے سننے ہیں

ادا بدایونی

نقرئی دھندلکے

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے   چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے، ان کے اشارے   بوجھل بوجھل، ہلکے ہلکے،
ٹھہرو ٹھہرو دامن الجھا   دیکھو دیکھو ساغر چھلکے
ان کا تغافل، ان کا تبسم   ایک دل اس پر لاکھ تہلکے
اُن کی تمنا، اُن کی محبت   دیکھو سنبھل کے، دیکھو سنبھل کے
لاکھ منایا، لاکھ بھلایا   نین کٹھورے بھر بھر چھلکے،
ہم نے نہ سمجھا، تم نے نہ جانا   دل نے مچائے لاکھ تہلکے
پل میں ہنساؤ، پل میں رلاؤ   پل میں اُجالے، پل میں دھندلکے
غم نے اٹھائے سینکڑوں طوفاں   دل نے بسائے لاکھ محلکے،
کتنے اُلجھے، کتنے سیدھے   رستے ان کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں، پاپڑ بیلے
چھلکے اب تو گھڑا چھلکے

قتیل شفائی

دُلہن

جاگ سہیلی،
جاگ سنبھل کر ـــــــ آنکھیں مَل کر
او البیلی

*

ہُوا سویرا
دیکھ وہ اُٹھ کر ـــــــ گیا ندی پر
ساجن تیرا

*

نیند کی ماتی
اپنی سُدھ لے ـــــــ بول نہ اُٹھے
تیری چھاتی

*

یوں سونے سے
تیرا، اُن کا ـــــــ بھید کھُلے گا
کروٹ بھی لے
او البیلی....

ابنِ انشاء

پرانے نوادر کی دکان میں

" .... آئیے آئیے — مہربان من! تشریف لائیے۔ ہماری خوش قسمتی ہے جو آپ نے قدم رنجہ فرمایا۔ جواری ذرا سیٹھ جی کا چھاتا لینا۔ اندر تشریف لائیے گا۔ نواری سیٹھ جی کے لئے چائے لانا۔ میں آپ کو یہاں دیکھ کر نہایت مسرور ہوں۔ آپ جب سے کاٹھیاواڑ سے تشریف لائے ہیں۔ میں اور سائیں داس آپ کو اپنے نوادر کا ذخیرہ دکھانے کے لئے بے تاب رہے ہیں (بلند آواز سے) سائیں داس! سیٹھ جگل کشور ہمارے نوادر کا ذخیرہ دیکھنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ دیکھو وہ ہم پر کتنے مہربان ہیں۔ دراصل سائیں داس ادھر کے کمرے میں مطالعہ میں مصروف ہے۔ معلوم نہیں اس نے میری آواز سنی بھی ہے کہ نہیں۔ جب وہ مطالعہ میں منہمک ہوتا ہے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ سائیں داس تو آپ جانیں ہمیشہ سے تحقیق و تفحص کا دل دادہ رہا ہے۔ جب کبھی اسے کوئی قیمت نامہ (پرائس لسٹ) ملتا ہے وہ اسی کا ہو رہتا ہے۔

" لیکن اب کے ہمارے ہاں وہ وہ نادر چیزیں آئی ہیں کہ میرے لئے چائے کا انتظار بھی دشوار ہو رہا ہے۔ یہ سامنے والا کلاک ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کتنی نادر چیز ہے یہ! واقعی عجوبۂ روزگار ہے یہ "کلومائل" کلاک ہے۔ آپ پوچھتے ہیں آیا یہ اچھا وقت دیتا ہے؟ یہ بھی خوب رہا سیٹھ صاحب! وقت دیتا ہی نہیں۔ یہ چلتا ہی نہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ آج تک کبھی نہیں چلا۔ یہی وجہ ہے جو اہلِ نظر میں ہمیشہ اس کلاک کی اتنی مانگ رہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کلومائل — یعنی اس کلاک کا موجد ایک بہت بڑا گھڑی ساز تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کلاکوں میں سے آج تک کوئی نہیں چلا۔

" سائیں داس! کیا کوئی "کلومائل" کلاک چلا بھی ہے؟" .... کیا کہا؟ صرف اس کی نقلیں ..... شکریہ۔ "سنا آپ نے — کلومائل کلاک کی یہ ایک پہچان ہے۔ اگر کلاک واقعی "اصلی" کلومائل ہے تو ہرگز نہیں چلے گا۔ آپ فرماتے ہیں اس کی سوئیاں کہاں گئیں؟ سیٹھ صاحب! اس میں کوئی سو

تھی ہی نہیں ۔ اس میں سوئیاں ہوتی ہی نہیں ۔ یہ ہمیں پانڈیچری میں ایک چھوٹی سی پرانی وضع کی دکان میں ملا تھا اور دکان دار نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ اس میں کبھی کوئی سوئی تھی ہی نہیں ۔ اس لئے اس کی گیارنٹی کی تھی ۔ یہ خوبی بھی اسی سے خاص ہے ۔ سمجھے آپ ؟ میں اور سائیں داس ان دونوں گھڑیوں کی طرف خاص طور پر توجہ دے رہے تھے اور ہم نے ان کے متعلق خاصہ مطالعہ کیا تھا ۔ اور اس موضوع پر تمام کتابیں اس نکتہ پر متفق تھیں کہ اصلی کلو ماٹل کلاک میں کوئی سوئی نہیں ہوا کرتی ۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے اس پر جو لیبل چسپاں ہے ۔ اس پر کیا لکھا ہے ۔ جب ہم نے اسے خریدا تھا یہ اس سے پہلے سے وہاں چسپاں ہے ۔ (پڑھتا ہے)

.... " نمبر ۱۲۹۵ ۔ کلو ماٹل کلاک ۔ سائز کلاں ۔ بغیر سوئیوں کے ۔ اس میں سوئیاں نہیں ہوا کرتیں ۔ چلتا نہیں ہے ۔ چلا نہیں کرتا ۔ بغیر لنگر کے ..." (مڑتے ہوئے) یہ بات البتہ میں بھول گیا تھا ۔ " بغیر لنگر کے " ــــ یہ خصوصیت اس کے محاسن میں چار چاند لگا دیتی ہے ۔

" آپ اسے اس پہلو سے نہایت غور سے دیکھ رہے ہیں ۔ یہ ادھر سے ٹوٹا ہوا ہے ۔ لیکن میں اس معاملہ میں جھوٹ قطعاً نہیں بولوں گا ۔ یہ شکستہ پہلو اصلی نہیں ہے ۔ یہ ہم نے جے پور میں ایک ماہر فن سے تڑوایا تھا ۔ کیا یہ کمال مہارت سے نہیں توڑا گیا ؟ ملاحظہ فرمائیے ۔ اس نے اسے اس نفاست سے توڑا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اسے لڑھکا کر اس پر کدکڑے لگائے ہوں ۔ پر اصلی کلو ماٹل کلاک کے متعلق یہی بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر کبھی کبھی کسی نہ کسی نے ضرور دولتیاں جھاڑی ہیں ــــ

ہمارا شگاف البتہ نقلی ہے ۔ لیکن بہ کمال نفاست پیدا کیا گیا ہے ۔ آپ نے فرم " مکندی لعل پا کھنڈی مل " کا نام ضرور سنا ہوگا ۔ ان کے ہاں ایک ماہر فن ہے جو ہر چیز فن کارانہ انداز میں توڑ سکتا ہے ......

" اور جس دن کلاک تڑوانا مقصود تھا ۔ میں اور سائیں داس اسے ٹوٹتا ہوا دیکھنے کے لئے بنفس نفیس گئے ۔ واقعی بڑا عجیب طریقہ ہے ان کا ۔ (آواز بلند) " سائیں داس ! کیا تمہیں مکندی مل پا کھنڈی مل جے پور والوں کا وہ آدمی یاد ہے جس سے ہم نے اپنا کلاک تڑوایا تھا ؟ " میرا خیال ہے اسے ہماری آواز سنائی نہیں دے رہی ۔ بہر حال وہ شخص اپنے فن میں یکتا ہے ۔ اس نے کلاک کو بس یوں ہی ننگے فرش پر لٹا دیا ۔ پھر تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا ۔ اور پھر اس کا طواف کرتے ہوئے اور کسی نامعلوم زبان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر جو چھلانگ لگائی ہے

تو دھم سے کلاک کے اوپر — حیرت ہوتی ہے اس کے اندازہ کی غیر معمولی صحت پر۔

" ان امور کے مشہور زمانہ ماہر اور ہمارے دیرینہ کرم فرما داؤد بھائی بارود بھائی (سورت والے) کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ انہوں نے پچھلے ہفتے ہمارے کلاک کو دیکھا تھا اور ان کی رائے ہے کہ یہ کام نہایت فن کارانہ انداز میں سرانجام دیا گیا ہے۔ اور اس شگاف کو اصلی شکست سے متمیز کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اسے توڑنے کا بہترین طریقہ اسے مکان کی چوتھی منزل کی کھڑکی سے باہر پھینک دینا ہے۔ آپ جانتے ہیں تیرھویں صدی میں اٹلی کے عام مکانات چو منزلے ہی ہوتے تھے — تیرھویں؟ ذرا ٹھہرئیے — سائیں داس، سائیں داس! تیرھویں صدی ٹھیک ہے نا؟" میرا مطلب ہے اس وقت جن دنوں اطالوی کلاک کھڑکیوں سے باہر پھینکے جایا کرتے تھے — چودھویں؟ شکریہ۔ مجھے ان اطالوی نوادر کی صحیح صدیاں مشکل ہی سے کبھی یاد رہتی ہیں۔

" آپ جانتے ہیں نوادر کے ساتھ ان کی صدیوں کا صحیح تعین نہایت ضروری ہے۔ ورنہ آپ سے فاحش غلطیاں ہونے کا زبردست امکان ہے۔ ابھی اگلے ہی دن میں نے ایک ایسی ہی غلطی ایک چمچہ کے متعلق کر دی تھی۔ میں نے اسے بارھویں صدی کا بتایا جب کہ حقیقتاً وہ صرف گیارھویں صدی سے تعلق رکھتا تھا بجز میزبان کو البتہ اس مساحت پر نہایت حیرت ہوئی (اسے ان چیزوں سے خاص رغبت ہے) آپ جانتے ہیں بارھویں صدی کا چمچہ بالکل فضول اور بے قیمت ہوتا ہے۔ مشہور اطالوی چمچہ سازوں میں سے کوئی بھی گیارھویں صدی تک پیدا نہ ہوا تھا — اوہ میں پیچھے کی طرف جا رہا ہوں — خیر میرا مطلب ہے " تب" تک۔ یعنی اس وقت تک چمچے فقط کھانا کھانے کے لئے بنائے جایا کرتے تھے۔ مشہور چمچہ ساز ...." سائیں داس! سائیں داس! کیا نام ہے اس مشہور اطالوی چمچہ ساز کا؟ چمچاق۔ ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ تو جناب چمچاق نے پہلے پہل ایسے چمچے بنائے جن سے کھایا نہیں جا سکتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے بے تحاشا ان کی نقلیں تیار کرنا شروع کر دیں ....

" اور یہ شیشے کا مرتبان ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ بس ایک ہی چیز ہے — آپ اسے خوردبین کے بغیر اچھی طرح مشکل ہی سے دیکھ سکیں گے۔ ادھر دیکھئے — یہ تحریر ہے جس میں حروف نہایت نفاست سے غلط ملط کئے گئے ہیں۔ یہ دیکھئے یہ سلطان طمطان الملک لکھا ہے — البتہ آپ کو پہلے سے اس کا علم نہ ہو تو آپ اسے نہیں پڑھ سکیں گے۔ ذرا غور سے دیکھئے پر طمطان کا "خ" تو صاف نظر آئے گا — یا شاید یہ مغفور الدولہ ہے

میں یا آپ اسے شناخت نہ کر سکیں گے لیکن سائیں داس کو اس کی کلید معلوم ہے ....

"ہم نے کھاری باؤلی میں ایک شخص کو مقرر کر رکھا ہے جو اس قبیل کی چیزیں جمع کرتا رہتا ہے اور ہمیں وقتاً فوقتاً بتاتا رہتا ہے کہ وہ مال میں کیا ہیں۔ دیکھئے یہ فرخ سیر لکھا ہے — یقین ہی نہیں آتا کہ کچھ لکھا بھی ہے کہ نہیں — فرخ سیر نہیں یہ شاید الغ الدین الغوزی ہے جو میرے خیال میں فرخ سیر کا سپہ سالار تھا —" سائیں داس! کیا الغ الدین الغوزی فرخ سیر کا سپہ سالار تھا؟ کیا کہا؟ — دارو غہ اصطبل؟ — ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کی چائے میں بھولا جا رہا ہوں۔ معاف فرمائیے گا میں اپنے نوادر کی نمائش میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ سب کچھ فراموش کر دیتا ہوں۔ آئیے ادھر تشریف رکھئے اور چائے نوش فرمائیے۔ لیکن آپ ذرا بھر توقف فرمائیں تو میں آپ کو یہ چائے دانی دکھانا چاہتا ہوں — جی نہیں۔ میرا مطلب اُس دانی سے نہیں جس وہ تو وہی ہے جس میں چائے تیار کی گئی ہے۔ لیکن یہ معمولی چیز ہے۔ یہ ہم نے یہیں سے چاندنی چوک والے چھجامل گگڑی لال سے خریدی تھی۔ فقط چائے بنانے کے لئے — یہ شکست غالباً چاندی کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن خود چھجامل گگڑی لال کے منیجر نے اقبال کیا ہے کہ یہ امریکہ کی ساخت ہے اور ایک دو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور اس سے پہلے کسی نے اسے استعمال نہیں کیا۔ بہر کیف وہ اس کی قدامت کی گارنٹی نہ کر سکتے تھے .....

"لیکن ٹھیرئے۔ میں ذرا آپ کے لئے چائے بنا لوں اور پھر آپ کو وہ نادرۂ روزگار چائے دانی دکھاتا ہوں جو آپکے قریب چوکی پر دھری ہے۔ دیکھئے اسے چھیڑئے نہیں یہ سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کا ایک وصف ہے۔ اسی وصف کی بنا پر ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ اصلی "چیخ چاخ چی" ہے۔ اس ساخت کی کوئی چائے دانی سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

"کیا فرمایا آپنے؟ .... نہیں — یہ ہم نے یہاں سے نہیں خریدی۔ آپ کو یہ چیز یہاں نہیں مل سکتی۔ درحقیقت یہ ہمیں چین کے ایک کھنڈر خانے میں ملی تھی۔ کچھ بھلا سا نام ہے اس مقام کا —" سائیں داس! کیا نام ہے چین کے اس قصبہ کا جہاں وہ کھنڈر خانہ واقع تھا؟ — کیا؟ — فِک کیا؟ — ہاں — ہاں۔ ٹھیک۔ فِگ فا گگ فاچ..."
یہ چینی نام بھی کتنے حسین ہوتے ہیں۔ ہے نا؟ آپنے سنا ہے۔ فِگ فا گگ فاچ؟ — نہیں؟ — یہ ایک چھوٹی سی حسین بستی ہے۔ جس میں سوائے قدیم نوادر کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے کچھ نہیں ہے۔ اور تقریباً سبھی چیزیں شکستہ حالت میں ہیں۔ وہ اس بات کی گارنٹی کرتے ہیں کہ دکان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جسے ٹوٹے کم از کم ایک صدی نہ ہو گئی ہو۔ ذرا اس کا لیبل دیکھئے — یہ چینی زبان میں ہے — "چی دالو" — میری والسٹ میں

یہ چائے دانی کا چینی مرادف ہے ۔" شاکوماتو" ۔ اس کا مطلب ہے "شکستہ" "بیدال" ۔ سائیں داس ! چینی زبان میں "بیدال" کا کیا مطلب ہے ؟ ۔۔ ہیں ؟ ۔۔ بے بدل ؟ ٹھیک ہے ۔ دیکھئے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں بے بدل چیز ہے

" آپ پوچھتے ہیں اس میں چائے اچھی بنتی ہے ؟ ۔۔ خوب ۔ میرے خیال میں اس میں نہایت نفیس چائے بنتی رہی ہو گی لیکن یہ ذرا رِستی ہے ۔ یہ رِسنا بھی دراصل "چخ چاخ چی" کے اصلی ہونے کی پہچان ہے ۔ اگر یہ رِستی نہیں ہے تو یقین فرمائیے ۔ یہ ایک نہایت ردّی قسم کی نقل ہے ۔ جو زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس برس پرانی ہو گی ۔۔ چاندی ؟ ۔ نہیں ۔۔ یہ اس کی دوسری پہچان ہے ۔ یہ دھات شراب کے پیپوں کے لوہے اور جست کا مرکب ہے ۔ لوگ اس کی نقلوں میں چاندی استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے ۔ آپ جانتے ہوں چاندی کو زنگ کہاں لگ سکتا ہے ۔

" تقریباً تمام قدیم نوادر کا یہی خاصّہ ہے ۔ وہ گل سڑ کر کچھ اس طرح کے ہو جاتے ہیں کہ ان کی نقل کی ہی نہیں جا سکتی ۔ میرے پاس ایک پرانا سینگ ہے جو ابھی آپ ملاحظ فرمائیں گے ۔ یہ نویں صدی کا ہے ۔۔ "کیوں سائیں داس ! یہ نویں صدی کا ہے نا ؟ اس کے اندر نہایت خوب صورت اور نفیس سبز پھپھوندی لگی ہوئی ہے جسے مصنوعی ذرائع سے پیدا کرنا یکسر ناممکن ہے ۔ یہ ماہرینِ فن کی رائے ہے ۔ میں اسے "نشتم جی بادام جی" کے ہاں بمبئی لے کر گیا تھا آپ جانتے ہیں وہ 'سینگیات' کے ماہر ہیں اور سینگ کو دیکھتے ہی اس کی صدی اور بھینس کی نسل بتا دیتے ہیں ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ باوجود کوشش کے ایسی عدیم المثال پھپھوندی پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں ۔ ان کے ایک ذمہ دار ماہرِ فن رکن نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہ سینگ غالباً ایک مردہ بھینس کے سر سے اس وقت اکھیڑا گیا ہے ۔ جب کہ اسے دفن ہوئے پچاس سال گزر چکے تھے ۔ یہی وجہ ہے اس کی قدر و قیمت کی ۔ ذرا خیال فرمائیے آپ ! میں نے اس ماہرِ فن سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ بھینس کو مرے کم از کم کتنا عرصہ ہونا چاہئے ۔ کہ اس کا سینگ نوادر میں جگہ پا سکے ۔ کہنے لگا ۔ عرصے کا تعین تو محال ہے لیکن اسے سالہا سال کا طویل عرصہ چاہئے ضرور .....

" یہ تو خیر بمبئی کے ماہرین کی رائے تھی ۔ لیکن یہ چائے دانی ہم نے بمبئی سے نہیں خریدی ۔ بمبئی اس لحاظ سے اسی طرح نکمّی جگہ ہے جس طرح کلکتہ ۔ وہاں آپ کو یہ چیزیں دستیاب نہیں ہو سکیں گی ۔ آپ وہاں سے کوئی "اصلی" چیز نہیں خرید سکیں گے ۔ ہم یہ چیزیں نہایت دقّت سے غیر معروف اور دور افتادہ مقامات سے فراہم کرتے ہیں ۔

" وہ چھوٹی سی تپائی دیکھ رہے ہیں نا آپ ؟ یہ مجھے جگن ناتھ جی کے تیرتھ کے راستے میں ایک جنگل میں مل گئی تھی وہ لوگ اسے واقعی دودھ دوہنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ دوسرے دو نوسٹول بھا مو کے ایک زمیں دوز کھنڈر سے برآمد ہوئے ہیں۔ جس برمی نے یہ ہمارے ہاتھ فروخت کئے ہیں اسے خود ان کی کہنگی اور قدامت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس نے کہا تھا "ممکن ہے یہ پندرھویں صدی کے ہوں اور ممکن ہے کہ نہ ہوں ......

" اوہ مجھے یاد آگیا۔ آج صبح مجھے گنجی لال کا ایک خط ملا ہے۔ گنجی لعل ہمارا گماشتہ ہے آپ جانتے ہی ہیں۔ بڑا دلچسپ خط ہے اسے کومین کے ایک چھوٹے سے قصبہ سے ایک چوکی ملی ہے اور اس کا خیال ہے ہمارے نوادر کے ذخیرے میں وہ بہت موزوں رہے گی اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے مقابلے کی ایک چیز بھی ہمارے ہاں نہ ہو گی لیکن ذرا ٹھہرئیے میں وہ خط ہی کیوں نہ آپ کو پڑھ کر سنا دوں ۔۔ ایں ۔ ایں ۔ یہ لیجئے ......

" ...... یہ نہایت خوب صورت چوکی ہے۔ اس کی غالباً پہلے چار ٹانگیں تھیں۔ اور دو تو اب بھی سلامت ہیں۔ اگر اس کی صرف ایک ٹانگ ہوتی تو اس کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہوتی ۔ موجودہ حالت میں اسے کسی دیوار کے سہارے یا نیچے انیٹیں چن کر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ یا ایک چاندی کی زنجیر کے ساتھ چھت کی کڑیوں سے لٹکایا جا سکتا ہے ۔ اوپر کی سطح کا ایک تختہ غائب ہے۔ لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی نقص نہیں ہے کیوں کہ کومین کی تمام بہترین قسم کی چوکیوں کا کم از کم ایک تختہ ہمیشہ غائب ہوتا ہے "

" کیا یہ اوصاف کچھ کم دل آویز ہیں ؟ ۔۔ سائیں داس ! میں نے ابھی ابھی سیٹھ جی کو کومین والی چوکی کے متعلق گنجی لعل کا خط پڑھ کر سنایا ہے۔ کیا اسے تار دیدیا موزوں نہ رہے گا ؟ ۔۔ ہاں ۔ میرا اپنا یہی خیال ہے ۔ اور سائیں داس، کھنڈی لعل یا کھنڈی مل سے ذرا دریافت کر لینا وہ اس کی ایک ٹانگ توڑ دینے کا کیا معاوضہ لیں گے "

اور اب محترم سیٹھ صاحب ۔ چائے نوش فرمائیے ۔ آپ اسے ضرور پسند فرمائیں گے یہ ایک خاص قسم کی چائے ہے اور بازار میں نہیں ملتی ۔ اس کا نام " خاچی پاچی " ہے یہ چینی چائے کی ایک بہت پرانی اور نایاب قسم ہے جسے مدت تک تارکول کے پیپے میں ڈال کر سڑایا گیا ہے ۔ آپ اسے یقیناً پسند فرمائیں گے "

منیب الرحمن

دو نظمیں

(۱)

وَآیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ نَسْلَخُ
مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝

(قرآن کریم)

تجلیات سحر کے ہم لوگ نوحہ گر ہیں
تجلیات سحر جو تاریکیوں میں تحلیل ہو چکی ہیں
ہماری ویران سرزمیں میں سکوتِ شب ہے نہ دن کی شورش
فقط یہ تاریکیاں ہیں جیسے کسی کی بیتی ہوئی جوانی
دیارِ ظلمت میں رہتے رہتے ہماری آنکھوں کا نور جاتا رہا ہے لیکن
تجلیاتِ سحر کے ہم لوگ نوحہ گر ہیں

ہم اپنے بچوں کو درس دیتے ہیں عافیت کا
ہم ان سے کہتے ہیں: جاؤ سو جاؤ، موت ہی اصل زندگی ہے
یہ لعنتیں قربِ آخرت کی نشانیاں ہیں
ہمارا آغاز ایک خوابِ گریز پا تھا
نگاہ و دل بہرہ یاب ہیں جس کی تلخیوں سے
نگاہ و دل جس کی ظلمتوں میں پڑے ہوئے ہیں

نگاہ و دل جن کی ظلمتوں سے کبھی بھی باہر نہ آسکیں گے۔

ابھی تو ناگفتہ ہیں سخن ہائے گفتنی بھی
ابھی تو اپنی نمو بھی بے نمو ہے اور نشانِ ہستی بھی بے نشاں ہیں
صدائیں ویرانۂ تصور میں گونجتی ہیں
حروف نوکِ قلم پہ ہر لحظہ ناچتے ہیں
نگاہیں خلوت گہہ مشیت میں بار پانے کو مضطرب ہیں
خدایا! ہم تیرے حکم کے منتظر ہیں اب تک!

(۲)

(اسلم ملک کے نام)

کوئی نغمہ ہمیں تلخ خوابوں سے بیدار کرتا نہیں
کوئی نغمہ نمودِ سحر کا حیات آفریں گیت گاتا نہیں
آہٹوں پر مگر چونک پڑتے ہیں ہم
آہٹیں جو کسی دور افتادہ رہرو کے رنج و مصیبت کی غماز ہیں

اس شکستہ مکاں میں جہاں ہم نے اپنی تمناؤں کو
اک مجسّم حقیقت سے دوچار ہوتے ہوئے پالیا تھا کبھی
اور بندے جہاں اپنے معبود سے درس لیتے تھے تعظیم کا
آج ہم اپنے بگڑے ہوئے خال و خد دیکھتے ہیں یہاں

اے پریشان جستجو! ہمیں پھر وہاں لے چلو
جس جگہ اب بھی اک طفلِ معصوم کا خواب آسودہ ہے

عزیز احمد

عصمت کی "ٹیڑھی لکیر"

ٹیڑھی لکیر ۔ از عصمت شاہد لطیف (سابق چغتائی) مطبوعۂ مکتبۂ اردو لاہور، حجم پانچ سو چوراسی صفحات۔ قیمت چھ روپیہ آٹھ آنے۔

کتاب ان یتیم بچوں کے نام معنون ہے جن کے والدین بہ قید حیات ہیں۔ لیکن مصنفہ نے کہیں صراحت نہیں کی ہے۔ کہ اس کا شمار یتیم بچوں میں ہے یا والدین میں۔

اس طویل لیکن دلچسپ ناول کو شروع کرنے سے ایک ہی دن پہلے میں اتفاق سے چسٹرٹن کا ایک مضمون پڑھ رہا تھا جس میں یہ دلچسپ جملہ پڑھ کے میں ٹھٹک گیا: "اچھا ناول اپنے ہیرو کا حال سچائی سے بیان کرتا ہے۔ لیکن برا ناول اپنے مصنف کا حال سچائی سے بیان کرتا ہے" باوجودیکہ چسٹرٹن کے فقروں کو میں برنارڈ شا کے فقروں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا یعنی ان میں سچ آدھے سے زیادہ نہیں ہوتا، پھر بھی یہ جملہ مجھے بڑا برا معلوم ہوا۔ کیوں کہ اس سے کرشن چندر پر اور مجھ پر دونوں پر شبہ پڑتی تھی۔ "شکست" اور "گریز" پڑھ کر عام طور پر لوگوں کو عجیب عجیب شک پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بعد ہی میں نے چسٹرٹن کا دوسرا فقرہ پڑھا۔ "یہ (یعنی برا ناول) ایک کام اس سے زیادہ بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے ناظرین کا حال بھی سچائی سے بیان کرتا ہے"۔ یہ جملہ پڑھ کر مجھے تسکین ہوئی۔ یہ وہ حد فاصل ہے جو رشید اختر ندوی، اور قیسی رام پوری کو کرشن چندر سے الگ کرتی ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" میں دونوں باتیں ہیں۔ یہ ناول سچائی کے ساتھ عصمت چغتائی کا حال بھی بیان کرتا ہے۔ (یہاں حال سے مراد قوالی جیسا حال ہے، جو بیتا نہ گیا ہو، مگر جسے بیتنے کی تمناؤں میں ساری عمر گزری ہو) اور ان کے ناظرین کا حال بھی اس میں ظاہر ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو ناظر ناول میں ڈھونڈتا ہے، اور خصوصاً عصمت کے ناول میں مثلاً جنس، مار دھاڑ، رومان، عشق (عشق بازی کے معنوں میں) چہلیں، چوٹیں، کلیاں، "ضدی" (ٹیڑھی لکیر ایک طرح کی ضدی عورت کو کہتے ہیں) تجربے، تھوڑی سی سیاست، جسم (یہ پطرس کی دریافت ہے) اور مساس، ۔

یہ پہلی منزل، ہیروئن شمن آپا شمشاد کا بچپن ہے۔ جو مٹی کھاتی ہے، اور بجائے بچے کے سانپ یعنی کنکھجورے جنتی ہے۔ اس ولادت کا حال مصنفہ نے بڑے مزے سے بیان کیا ہے۔ نفسیاتی طور پر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شمشاد میں سادیت (Sadism) بچپن ہی سے موجود ہے۔ "وہ اپنے گھٹنے پر چپتیں لگانے لگی ..... اور پھر اسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا، دھما دھم اس نے جہیز کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں سے کوٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کھلیان کرکے رکھ دیا۔"

میں نے عصمت چغتائی کی اکثر تحریروں سے اندازہ لگایا ہے کہ ان کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے اور ان کی جنسی مرضیت اور احساس کمتری کا یقیناً اپنے بچپن سے تعلق رہا ہے۔ شمن کے بچپن کے حالات اور اس کی تربیت کا افسانہ پڑھ کے وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ شمن میں نہ صرف سادیت تھی۔ بلکہ انفعالی ماسوخیت (Masochism) بھی۔ یہ دوسرا جنسی مرض ہے۔ جس کا شمن کے بچپن ہی میں پتہ چلتا ہے۔ منجھو نے جو بہن سے زیادہ معشوقہ تھی اس کے "گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا۔" اسی صفحہ (۲۸) پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شمن میں اپنی بھانجی نوری کے مقابل بڑا احساس کمتری ہے۔ اور نوری کی والدہ یعنی شمن کی بڑی بہن اسے جس بید روی سے پیٹتی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیڑھی لکیر خاندان کی تصنیف ہے، وہی خاندان جس نے "دوزخی" پیدا کیا تھا۔ شمن کی شرارتیں بہت کچھ ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس والی حسن آرا سے ملتی جلتی ہیں۔ مگر بچارے نذیر احمد نے جنسیات پر اتنی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، اس لئے وہ نفع میں رہے۔

اس پہلی منزل میں مکالمہ البتہ بہت اچھا ہے۔ الفاظ، جملے، فقرے سب بے ساختہ ہیں۔ زنانہ محاورے، ضرب المثلیں سب قدرتی طور پر استعمال ہوئی ہیں: "زبان تو نگوڑی کے تھی ہی نہیں، اور سینہ یہ چوڑا، منہ یہ طباق سا۔" مجموعی طور پر شمن کے بچپن کے یہ واقعات بڑی حقیقت نگاری سے لکھے گئے ہیں۔ بچپن کی بیتی ہوئی باتیں جو اکثر لوگ بھول جاتے ہیں، مصنفہ کو نہ صرف یاد ہیں بلکہ انہیں بڑے کمال سے ان باتوں کو لکھنے کا سلیقہ ہے۔ مذاق شگفتہ ہے اور کہیں کہیں طنز کا رنگ ایسا کھلتا ہوا ہے۔ کہ داد دینا پڑتی ہے۔

لیکن بچاری شمن پہلی ہی منزل میں ایک اور غیر معمولی جنسی بیماری کا شکار ہوتی ہے یہ اس کی تیسری جنسی بیماری ہے۔ اسے اپنی استانی سے مجنونانہ عشق ہو جاتا ہے۔ یہ وہی MAEDCHEN IN UNIFORM

والا قصہ ہے۔ بہرحال شمن کو اس مرحلے سے گذارنا مصنفہ کا "فرض" تھا، اور اس کے لئے وہ اپنی ہیروئن کو قریب قریب لیڈی میک بتھ بنا دیتی ہے۔ باوجود اس دل باختگی کے نمنی سی ہیروئن کی نظروں میں مصنفہ جنس اور جسم کو نہیں بھولتیں، انہیں بڑی لڑکیوں کے کرتوں میں بلیاں سی لڑتی معلوم ہوتی ہیں۔

"لحاف" کی مصنفہ محض ایک استانی سے عشق لڑا کر کہیں اس جنسی مرض کا دامن چھوڑنے والی ہیں۔ صاحب توبہ کیجئے۔ خصوصاً جب لڑکیوں کے بورڈنگ ہاؤس کا ایسا خداداد محل وقوع ان کے قبضے میں ہو۔ ایک لڑکی (جو دِق زدہ بھی ہے، مرض بہرحال ضروری ہے) کے ہاتھ چوہا بن کر شمن کے جسم کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اور شمن اس سے متنفر ہے مگر خود ایک اور لڑکی نجمہ پر عاشق ہو جاتی ہے جو ایک اور لڑکی سعادت کی معشوقہ ہے۔ اس طرح ایک ہی جنس کے باہمی عشق کا یہ مستطیل (مثلث کو عصمت چغتائی صاحبہ کیا خاطر میں لائیں) پہلی منزل کے بقیہ حصے پر حاوی رہتا ہے۔

موضوع پر چاہے جتنا اعتراض کر لیا جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لڑکیوں کے بورڈنگ ہاؤس کی یہ اندرونی تصویر اردو میں ایک بڑی نئی اور انوکھی چیز ہے۔ ادب میں یہ بھی رنگین اور جان صاحب کی ریختی کی طرح ایک چھپے ہوئے منظر پر سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ اس سے زندگی کے احتساب میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔ تو اس سوال کو عصمت کی ہر کتاب پڑھتے وقت ملتوی رکھئے۔ نجمہ کا سراپا (صفحہ ۱۰۵) ایک لڑکی کی نظر سے بڑے کمال سے کھینچا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عصمت کی ہیروئن شمن کی چوتھی جنسی بیماری کی جھلک ہے۔ یہ "بو" کی کشش ہے۔ یوں دیکھئے تو "بو" کی کشش مرض نہیں۔ اور اردو شاعری میں بھی قوتِ شامہ کا عشقیہ تاثر حسرت موہانی کے یہاں بار بار ملتا ہے۔ مگر اس کا علاج کیا کہ عصمت نے اس بو کو بھی ایک جنسی بیماری بنا لیا ہے۔ "سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مرغی کے بچے جیسی بو آتی تھی مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کی جھار کی سی مہک تھی بالکل ہی نئی اور آسانی سے کھنچ کر نتھنوں میں گھسنے لگتی تھی (ص ۱۰۸)

دو صفحوں کے بعد شمن میں پانچویں غیر معمولی جنسی بیماری کے آثار نظر آتے ہیں یہ اپنی معشوقہ کے لباس کے کسی حصے اور اس کے جسم کے ایک حصے ("اور پیر؟ اس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا — مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال روشنائی") کی پوجا ہے جس کو جنسی مرضیات کی اصطلاح میں Fotichiam کہتے ہیں۔ اس طرح عصمت کی ہیروئن پہلی منزل یعنی عنفوانِ شباب کے زمانے تک پہنچنے سے پہلے ہی پانچ غیر معمولی جنسی بیماریوں مرادیت، ماسوخیت، گڑیاں پرستی، بوپرستی اور شے اور عضو کی پوجا میں گرفتار ہوتی ہے

کرافٹ ایبنگ کی Psychopathia Sexualis میں جتنے غیر معمولی امراض ہیں، جن میں سے کوئی ایک بھی اس کے لئے کافی ہے کہ کسی مرد یا عورت کو عام صحت مند راستے سے عمر بھر کے لئے ہٹا دے، وہ سب کے سب اس ناول کے پہلے حصے میں مصنفہ نے اقلیدس کے مسئلوں کی طرح جمع کر دئے ہیں۔ جو ادیب کسی ناول کی ایسی ہیروئن کو ہضم کر سکے کیا وہ صحت مند، زندگی بخش ادب ہوگا؟

دوسری منزل اور اس کی بعد کی منزلوں میں زندگی اور صحت (اخلاق کا تو خیر نام بھی لینا گناہ ہے، ارسطو کو مرے کتنے ہزار سال ہو چکے ہیں) کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ خالص ادب اور تکنیک اور ہیئت اور کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شمن ٹیڑھی لکیر نہیں باقی رہی وہ بڑی سلجھی ہوئی کالج کی طالبہ، اس سے زیادہ سلجھی ہوئی استانی، اور ترقی پسند حلقوں کی شمع محفل ہو کر اور بھی زیادہ سلجھی ہوئی خاتون معلوم ہوتی ہے۔ اس کی پانچوں غیر معمولی جنسی بیماریاں اس طرح غائب ہو جاتی ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور اس کے بعد مصنفہ زیادہ تر "جنسی پیچیدگیاں" اور "وسوسے" اپنی ہیروئن سے زیادہ دوسرے کرداروں میں تلاش کرتی ہے۔

بہر حال دوسری منزل میں شمن ایک مرض سے تو یقیناً چھٹکارا پاتی ہے۔ اس کی سہیلی بلقیس کی آپا بی نے بتایا تھا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہئے۔ بلقیس ہی سے وہ بے مثال اصطلاح بتاتی ہے، "کوڑیالہ"۔ جس سے رغالباً علی گڈھ کے) سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے پہنے ہوئے لڑکے مراد ہیں۔ اس حصے میں بھی حقیقت نگاری بے مثل ہے۔ یہ پردے کے اس پار کا نقطۂ نظر ہے، اور تفصیلات کے بیان میں ہمیشہ کی طرح عصمت کو اب بھی کمال حاصل ہے۔ رشید اور شمن کی پہلی ملاقات، اور ملاقاتوں سے جسم کی چھان بین۔ یہ عنفوانِ شباب اور تہذیب سیکھنے سے پہلے کی چھان بین۔ کہیں عصمت چغتائی صاحبہ ایسے موقعوں پر چوکتی ہیں۔

اسی دوسری منزل میں زندگی کے احتساب، زندگی کو جانچنے، سمجھنے، تولنے اور پرکھنے کی ایک بہت بڑی قدر اس ناول میں نمایاں ہوتی ہے۔ پطرس نے لکھا تھا کہ عصمت کو سماج سے نہیں، شخصیتوں سے بلکہ اشخاص سے شغف ہے، اس میں مزید تشریح کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ اشخاص میں بھی انہیں دماغ سے نہیں بلکہ جسم سے شغف ہے، اور جسم کے احتساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے — مساس۔

چناں چہ رشید سے لے کر ٹیلر تک بیسیوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں، سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے۔ مساس ہی عصمت کے یہاں اکتسابِ مرد، اکتسابِ انسان، اکتسابِ زندگی، اکتسابِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔ رضائیوں کے بادلوں میں جماس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتی ہیں۔ رسول فاطمہ کے چوہے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک رخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن اور مہتر کا وہ مُنافرہ یا معاشقہ ہے جس میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی بھی نہیں محسوس کرتیں۔ مساس کے سلسلے میں شمن کا نسوانی احساس ران پر انگلیوں کی سرسراہٹ اکثر محسوس کرتا ہے لیکن یہ احساس کم سے کم صحت مند اور قدرتی تو ہے اس میں پہلی منزل کی پانچ غیر معمولی جنسی بیماریوں کی غیر فطری مرضیت تو نہیں۔

صفحہ ۲۲۱ اور ۲۲۲ پر غنیمت ہے کہ مصنّف نے ان مصنّفوں کے نام گنوا دئے جن سے ان کی ہیروئن متاثر ہوئی ہے۔ ان میں ٹیگور اور ہارڈی کے سوا سب انیسویں صدی کے انگریز رومانی مصنفین اور شاعر ہیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ کون کون سے مسالے تحریروں میں پڑے ہیں۔ انیسویں صدی کی رومانیت کا ایک مریضانہ پہلو بھی ہے۔ جسے بڑے کمال سے پروفیسر ماریو پراتس نے اپنی کتاب "رومانی کرب" میں تجزیہ کر کے بیان کیا ہے۔ اس سے ادبی مرضیت کے بعض جراثیم کا سراغ ملے گا۔

رائے صاحب سے شمن کا عشق اس کی چھٹی غیر معمولی جنسی بیماری ہے۔ اس کا تعلق کرافٹ ایبنگ کی مرضیاتِ جنسی سے نہیں، فرائڈ کے نفسیاتِ تحلیلی سے ہے۔ در اصل بچاری ہیروئن ایک طرح کے Oedipus Complex میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اسے رائے صاحب چوڑے بوڑھے سینے میں مندنا چتے نظر آتے ہیں۔ چلئے لگے ہاتھوں ایک Delusion کا بھی انتظام ہو گیا۔ یہاں اسوخیت کا پرانا مرض عارضی طور پر عود کر آتا ہے۔ وہ سسکتی ہوئی ... چٹکی اب بھی اس کی رگ رگ میں ٹیکیں لے رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر سنسناتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مَس کلائی میں رینگ گیا" وہ بالآخر خود رائے صاحب سے اپنے پریم کا اعتراف کرتی ہے۔ رائے صاحب کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے اور وہ خود فوراً ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہاں میری اور اکثر

ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ عشق اور ٹائیفائڈ کے جراثیم تو بالکل مختلف ہیں، پھر یہ صورتِ حال کیوں کر رونما ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول میں ایک طرح کا تدریجی ارتقا ہے۔ یعنی بچپن کے مقابل اسکول کے زمانے، اسکول سے زیادہ کالج اور یونی ورسٹی میں شمن کا ذہنی معیار بلند ہوتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ناول کا ذہنی معیار بھی اونچا ہوتا جاتا ہے۔ مگر یونی ورسٹی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی: افتخار اور پروفیسر کے سوا کسی اور سے گفتگو میں ذہانت اور گہرائی تو ایک طرف سستے جنسی مذاق اور عامیانہ گفتگو کے سوا اور کچھ نہیں۔ افتخار کی اُٹھان بڑی اچھی تھی۔ اس کی گفتگو میں اور اس کے کردار کی ارتقا میں اس ناول کا سب سے ممتاز کردار بننے کی صلاحیت تھی، مگر اسے اور اس کے کردار کو عصمت نے ایک لطیفہ پر قربان کر دیا۔ یہ افتخار کی بی بی جین بی کی ہو رہے۔ افتخار کے کردار (کم از کم جیسا وہ اس ناول میں ہے) اور اس لطیفے میں کوئی مناسبت نہیں۔ پھر یہ بھی شک ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اس عظیم بیگ چغتائی قسم کے لطیفے سے افتخار کو اس لئے ختم کر دیا کہ کہیں وہ ہیرو نہ بن بیٹھے، اس مسند پر وہ آخر میں ایک فرنگی دیوتا کو بٹھانے کا ارادہ کرنے لگیں۔

افتخار کے ساتھ بھی دق کا دُم چھلا لگا ہوا ہے۔ مرض خواہ جنسی نہ بھی ہو عصمت کے لئے دل فریب ہے۔ عورتوں کے کردار اس ناول میں عموماً انواع اور نمونوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ انفرادیت یوں بھی کم ہے، مگر مردوں کے کردار (ان کے جسم یا ان کی جسمانی کشش کا احساس نہیں بلکہ ان کے کردار) سب کے سب ناقص ہیں، اور اکثر میں تضاد ہے۔ مثلاً سیتل۔ اس کے علاوہ ان کا ہر مرد کردار بحیثیت کردار وہ کام کرتا ہے جو ہر دوسرا کردار اسی طرح کرتا۔ افتخار، سیتل، رشید، پروفیسر اور ٹیلر سب قریب قریب یکساں ہیں، کوئی امتیازی نفسی خصائص ایک کو دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز نہیں کرتے۔ ان میں سے افتخار کے سوا کوئی اور مرد کردار "اُبھرا" نہیں۔ اور اسے بھی جین بی اور شاید ٹیلر نے بچا دیا۔

سیاسی بحثیں بھی ہیں، زیادہ تر سطحی سیاسی واقعات اور جنگ کا جا بجا ذکر ہے مگر بیانیہ۔ اس کا اس ناول کی ہیروئن یا کرداروں سے کوئی ایسا گہرا تعلق نہیں۔ یہاں تک کہ ٹیلر کی بے انتہا فرمت پر حیرت ہوتی ہے۔ کہیں کہیں شمن کی جنس اور جسم اور ماس سے باہر کی زندگی کی تصویریں بھی ہیں اور یہ تصویریں بہت اچھی ہیں، خصوصاً اسکول کی زندگی کا ذکر، یہ اس کتاب کا سب سے کامیاب

حصہ ہے۔ کاش عصمت صاحبہ مستی جنسیات کو چھوڑ کر اسی قسم کی چیزیں لکھتیں۔ اس صورت میں جین۔ آسٹن کی طرح اُن کا نام ہمیشہ باقی رہ جاتا، موجودہ صورتِ حال میں تو وہ ایمیل مینن اور دیڈ کلف ہال کے درمیان کے کسی ہیولی کی نیم کامیاب نقل بن کر رہ گئی ہیں۔

جنسی مرضیات پھر اُبھرتے ہیں۔ شمن کی بچپن کی سادیت Sadism ایلما کے ماں بن میں بدل جاتی ہے۔ فلسفۂ محبت کی گتھیاں شمن سلجھا سلجھا کر ایلما کو سمجھاتی ہے۔ اور کئی صفحات کے بعد شمن کی اپنی "گتھیوں" کو پروفیسر صاحب سلجھاتے ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب احمد علی اور سعادت حسن منٹو کے بین بین کوئی صاحب ہیں، یا شاید کوئی اور صاحب ہوں، جن کے وجود سے میں آگاہ نہیں۔

عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اُسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے، جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دبا دو تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے، دوپہر کی جھلستی لو میں پنکھا جھلتا ہے، ہزاروں دیووں کی طاقت سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے، سردیوں میں تاپتا ہے۔ اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے۔ ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیتِ مصنفہ واقف نہیں۔

اگر افتخار والی عینیت کا غبارہ عین بی کو لا کے پھاڑنا ہی تھا تو ناول بھی وہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ قابلِ برداشت انجام ہو سکتا تھا۔ لیکن آخری سو صفحے جو ٹیلر سے عشق اور شادی پہ صرف کئے گئے ہیں بے حد غیر ضروری اور بڑی حد تک غیر دلچسپ ہیں۔ اوّل تو ٹیلر والے حصے میں حقیقت نگاری نام کو نہیں۔ وہ سچی زندگی جو شمن کے بچپن، اسکول، کالج اور پھر استانی پن کے زمانے میں تھی، یہاں کہیں نہیں۔ قیاسات، مفروضات کے سوا اس حصے میں کچھ نہیں۔ ٹیلر، کرشن چندر کے موتی اور مالی کے قسم کا فرنگی ہے۔ کرشن چندر کی گنوار مرہٹن جس نے سانپ کا زہر چوسا تھا۔ یہاں شمن بن کے اس فرنگی سے شادی کرتی ہے، اور اس کی "انسانیت" کے فریب کو توڑتی ہے۔ اپنے من مندر میں شمن نے آخر فرنگی دیوتا کو لا بٹھایا۔ یہ آخری ذہنی عیاشی ہے۔ اسے سیاسی، نسلی، عالمانہ معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سطحیت کا کیا علاج۔ اس حصے میں مکالمے بے رنگ، لڑائیاں نقلی، رنگ پھیکا پھیکا ہے۔ ایک جملہ شمن سچ کہہ جاتی ہے "میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی" وجہ یہ ہے

کہ وہ بھی ایتھل مینن کی طرح محبت کو صاف سفید دانتوں میں ڈھونڈتی ہے۔ ٹیلر کا کردار بالکل نقلی، فرضی اور زندگی سے عاری ہے اور اس سے بحثوں میں تصنع اتنا ہے کہ کہیں کہیں تو شمن بالکل عبد الماجد دریابادی کی بولی بولنے لگتی ہے۔ "تم سفید انسانوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجہ تک لے جا کر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے۔ لہٰذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو" ٹیلر سے شادی کی زندگی کی پوری احمقانہ اور مصنوعی فضا میں شمن سے صرف ایک کام ذرا ایمان داری کا ہو جاتا ہے۔ وہ ماں بننا گوارا کر لیتی ہے، مگر وہ بھی بادلِ ناخواستہ۔

اور اس طرح یہ قریب قریب چھ سو صفحات کا لمبا چوڑا ناول ختم ہوتا ہے۔ جہاں جہاں مصنفہ نے زندگی کی سچی تصویریں کھینچی ہیں، جہاں جہاں اس نے طنز اور بیدردی سے توہمات اور تعصبات کے پرخچے چاک کئے ہیں، جہاں جہاں اس نے جنسی نہیں بلکہ ذہنی بغاوت کی ہے وہاں یہ ناول تحسین کے قابل ہے۔ ذرا سا روک، ذرا سا ٹھہراؤ، عصمت کو معلوم نہیں کتنا اونچا اٹھا سکتا ہے، مگر اسی کی سب سے زیادہ کمی ہے۔ جنس ایک مرض کی طرح ان کے ذہن، ان کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس ناول میں ترقی پسندی کا ذکر جا بجا ہے، مگر پڑھ کر سب سے زیادہ افسوس ناک احساس یہی ہوتا ہے کہ یہ ناول ترقی پسند نہیں، ہر زاویے سے رجعت پسند ہے۔ ذہنی انتخاب کی جو موڑ آتی ہے اس پہ غلط سمت میں مصنفہ نے قدم اٹھایا ہے۔ اور باوجود کمالِ فن پر داد دینے کے یہ کہنا پڑتا ہے :-

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

علی جواد زیدی

"ن ۔ م ۔ راشد پر"

اردو ادب بالخصوص اردو شاعری میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا نصف آخر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ بہت سے ادیب اور شاعر گوشہ گمنامی سے نکل کر یکایک ہماری ادبی محفل میں داخل ہوئے۔ انہیں نوواردوں میں "ن ۔ م ۔ راشد" بھی تھا۔ یہ بقول حیات اللہ انصاری اس محفل میں درّانہ آیا، اور صفوں کو چیرتا ہوا صدر تک پہنچا اور وہیں بیٹھ گیا۔ غالباً یہ ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے اس کے واقعہ سے یہ تو ظاہر ہی تھا کہ "نواسنج و نغمہ سرا ہے۔ لیکن اس کی نواسنجی اور نغمہ سرائی اپنے پیش رَوں اور ہم عصروں سے اتنی مختلف تھی، کہ ساری محفل کے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی۔ راشد عروض کے مقررہ اصول اور معیاروں سے، اور اردو کی لسانی روایتوں سے بے نیاز تھا، اس کا سرمایۂ افکار بھی پیچیدہ، مبہم اور اجنبی تھا۔ یہ سب اہل محفل نے بہ یک نظر محسوس کیا۔ ایک گوشہ سے واہ واہ کا ایک غلغلہ بلند ہوا، جنہیں سوچنے کی عادت نہ تھی، وہ اس ہوا میں بہہ گئے۔ لیکن جو لوگ سوچ سکتے تھے، اس تجدد پر کوئی صحیح رائے قائم کرنے سے کچھ دنوں تک گریز کرتے رہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ راشد کے کلام پہ بے لاگ تبصرہ کیا جائے۔ اس ضرورت کو حیات اللہ انصاری نے محسوس کیا اور مندرجہ عنوان نام کی ایک مختصر سی تصنیف 'اورا' کی تنقید کے لئے وقف کر دی۔

تبصرہ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ کیا راشد کا یہ مختصر سا مجموعۂ کلام ایک سو دو صفحات کی طویل تنقید کا متحمل ہو سکتا ہے۔ خاص کر اس صورت میں اور بھی کہ حیات اللہ انصاری نے راشد کی شاعری کے صرف ایک پہلو سے بحث کی ہے۔ اگر یہ تنقیدی کتاب چہ راشد کے علاوہ اس کے ہم عصروں کی تحریروں کا بھی بے لاگ جائزہ ہوتا تو اس کی افادیت

---

[1] مصنفہ حیات اللہ انصاری۔ مطبوعہ انشا پریس، ۱۹۱۹ کوچہ پنڈت، دہلی قیمت مجلد ع حجم ۱۰۲ صفحات

یقیناً دوچند ہو جاتی۔ نگاہیں بار بار اس کمی کو محسوس کرتی ہیں۔ کہ انصاری نے اس دور کے علمی
رجحانات، فنی مقتضیات، اور فکری تحریکات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اس بات کی
بھی حاجت تھی کہ تنقید اس زمانے کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بھی پیش کرتا۔ اس کے بعد اس کا فیصلہ آسان
ہوتا کہ راشد کی گمراہی ذاتی ہے یا سماجی حالات کا قہری نتیجہ۔

حیات اللہ انصاری راشد سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ چند جنسیاتی علتوں کا شکار ہے،
اور وہ صحت مند صنفی ادب کی تخلیق سے معذور ہے۔ یہ خفگی کسی حد تک حق بجانب ہے۔ لیکن سوال
یہ ہے کہ جو ادب راشد پیش کرتا ہے۔ وہ ان علتوں سے نفرت کا جذبہ ہم میں بیدار کرتا ہے۔ یا انہیں سراہتا
ہے، اور عام کرنا چاہتا ہے۔ حیات اللہ نے اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ حالاں کہ اس
سوال کا جواب بہت ضروری تھا۔ جہاں تک راشد کے "ماورا" کا تعلق ہے۔ یہ بات ماننا پڑے گی۔ کہ
وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے سماجی معتقدات کمزور ہیں۔ اور وہ سماجی طاقتوں کے سامنے سپر انداختہ
ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اقدام پر آمادہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ اقدام سراسر جذباتی ہے۔ اور خواب و خیال کی
دنیا تک محدود ہے۔ وہ اس معاشرے سے اور غیر منصفانہ سماجی اور سیاسی حالات سے بیزار ہے۔ لیکن خود
کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ مشرق کے خدا کی تلاش میں مصروف ہے لیکن اس کے دل کے ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی
نامرادی اس سے یہ کہتی ہے کہ مشرق کا خدا کوئی نہیں، جب نامرادیوں کا احساس اتنا شدید ہو تو محبت،
میں استواری اور اعتدال کی تلاش بے سود ہے۔

عام سماجی اور سیاسی الجھنوں کی طرح جنسیاتی الجھنیں بھی بیسویں صدی کے غلام، مجبور،
توہم پرست، اور قدامت پسند ہندستان میں شاذ نہیں ہیں۔ بلکہ قدم قدم پر ملتی ہیں۔ اور ان کے
تجزیہ اور تحلیل کا عمل بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ فرائڈ کا نام لینے والے
بہت ہیں، اور تحلیل نفسی کے ماہرین کے صف میں کھڑے ہو جانے کے لئے ہر "بوالہوس" بے چین رہتا ہے۔
مگر فرائڈ کے نظریوں کی کورانہ تقلید، اعتدال پسند اور وسیع النظر نقاد کے لئے کافی دشوار ہے
جذبۂ جنسی ایک ہمہ گیر اور بنیادی جذبہ ضرور ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اور دوسرے بنیادی
اور جسمانی جذبے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ انسانی دماغ صدیوں کے ثقافتی اور علمی اثرات سے ایک
پیچیدہ مشین بن چکا ہے۔ بہت سے بنیادی حیوانی جذبے سماج کی مسلسل پابندیوں اور مخالفتوں کی بدولت

اور پیہم تراش و خراش کے بعد نئی شکلیں اختیار کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ جب معمولی انسان اپنے سن شعور کو پہنچتا ہے تو کوئی جذبہ منفرد نہیں رہ جاتا۔ بلکہ مرکب ہو کے اپنے جزو غالب کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جنسیات، جنسیات کی رٹ لگانے والے یہ اکثر بھول جاتے ہیں۔ کہ جنسیات کے دامن میں بھوک اور پیٹ بھی ہے۔ طبقاتی کشمکش بھی ہے، صدیوں کی سماجی ترقیاں بھی ہیں، اور روایتیں بھی اور یہ سب ایک دوسرے پر یکساں طور سے یا کم و بیش اثر انداز ہوتے ہیں۔ فرائڈ غیر معقول نفسیات اور غیر معمولی دماغی کیفیات سے بحث کرتے ہوئے جنسیات پر زیادہ زور دیتا ہے۔ بڑی حد تک صحیح ہے، اور تحلیل نفسی کے تجربوں نے اس کی صداقت تسلیم کرانے میں کافی مدد دی ہے۔ لیکن انسان بے جان مشین نہیں ہے۔ وہ ذی روح اور ذی شعور ہے۔ تحت شعوری یا لاشعوری کیفیتیں سماج کی پیدا کردہ ہوتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے کہ خود شعور۔ اس لئے غیر متوازن نفسیات کا انفرادی حل تو وہ مزدور ہے جو فرائڈ بتاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک سماجی حل بھی ہے۔ اور وہ ہے معاشرہ کی غیر منصفانہ طبقاتی تقسیم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ۔

خیر، یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حیات اللہ انصاری نے جہاں راشد کے غیر متوازن اور علیل ذہنی رجحانات سے بحث کی ہے۔ وہاں وہ اگر اس کے تمام فکری رجحانات سے بحث کرتے، تو کتاب کی علمی شان ضرور بڑھ جاتی۔

یقیناً ن۔م۔ راشد کی نفسیاتی تحلیل اور اس کے کلام کا جنسیاتی تجزیہ حیات اللہ انصاری نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے کیا ہے۔ نفسیاتی تحلیل کرتے وقت ان کا قلم ایک چابک دست جراح کے نشتر کی طرح چلا ہے۔ اور باریک سے باریک رگوں کے جال کو چھوتا ہوا گزرا ہے۔ اس کا دل جراح کے دل کی طرح ہمدردی سے لبریز ہے۔ قاتل کے دل کی طرح درشت و تشدد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ مسلسل نشتر زنی کے باوجود اس کے انداز سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ ایک ایسے تنقید نگار کے لئے جو خامیوں کی تلاش میں مصروف ہو یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ انصاری کی نگاہ دقت پسند اور دور رس ہے وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے معانی اس طرح ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جیسے کوئی حجاب ہی حائل نہ تھا۔ پس نقاب جو چہرہ چھپا ہے۔ وہ بھونڈا اور بھدا ہے، یا حسن کا مجسمہ، انصاری اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کا کام تو بے نقاب کرنا ہے،

اب یہ ادبیات ہے کہ وہ جب نقاب اٹھاتا ہے۔ تو نظارہ کرنے والوں کی نگاہیں کچھ اس زاویے سے پڑتی ہیں کہ وہ چہرہ بھدّا ہی نظر آتا ہے اور فطری طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نقاب کشائی کا فریضہ انجام دینے والا کہیں جانب دار تو نہیں ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہونے لگا ؟

بادی النظر میں معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ حیات اللہ نے کافی جذبہ واری سے کام لیا ہے۔ مگر ہم مفروضات کے پھندوں میں کیوں پھنسیں۔ یہ تو ہمیں ماننا ہی پڑے گا کہ دراصل میں خیال نے حیات اللہ کے تنقیدی قلم کو جنبش دی، وہ صلاحی تھا۔ انصاری نے "ماورا" کی اشاعت کے بعد یہ محسوس کیا کہ ادب اردو میں راشد کو غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے، اس کا وہ مستحق نہیں ہے۔ حیات اللہ کا خیال ہے کہ راشد کے افکار میں ایک بے راہ روی ہے، جو آہستہ آہستہ ایک وبا کی شکل اختیار کر رہی ہے اور جس کی ذمہ داری نقاد کے خیال کے مطابق راشد پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید یک رُخی ہو کر رہ گئی ہے۔

حیات، راشد کے فنی اجتہاد سے نہیں الجھتا، بلکہ اس کا تذکرہ تک نہیں کرتا۔ حالاں کہ یہ پہلو دوسرے تنقید نگاروں کو سب سے پہلے متوجہ کرتا ہے۔ وہ نظم آزاد کی افادیت یا تاریخ، اردو میں نظم آزاد کی عروضی حیثیت، ابہام کے اسباب و اغراض، نئے کنایات کے استعمال سے بحث نہیں کرتا اور یہ کمی بہ یک نظر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اصل میں حیات اللہ کا مقصد صرف راشد کے خیالات و حسیات پر تبصرہ کرنا ہے، اور اس تبصرہ کا نچوڑ حیات اللہ ہی کے لفظوں میں یہ ہے "کسی خیال کسی جذبے میں استواری، اعتدال اور یکسوئی نہیں ہے۔ تجربہ، علم اور غور و فکر کا درجہ بہت پست ہے پاس پاس متضاد باتیں کہہ جاتا ہے اور احساس تک نہیں ہوتا۔ جو نظریے قائم کرتا ہے۔ خود ہی اس کی تردید کر دیتا ہے۔" لیکن۔ یہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ "این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" دلّی سے لے کر اقبال تک کون ہے جو منطق اور خالص یک رنگ فلسفہ کے ڈگر سے کبھی سرمو نہ ہٹا ہو۔

جا بجا راشد کے خیالات میں تضاد کی نشانیاں ملتی ہیں۔ لیکن راشد بھی مجبور ہے۔ وہ جس دور میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ وہ دور ہی تشکیک کا ہے۔ راشد ان سبک ساران ساحل میں نہیں ہے جو ڈوبتی ہوئی کشتی کے ناخدا کو للکارا کرتے ہیں بلکہ وہ خود طوفانی سمندر میں ایک تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔ لیکن اس بے بسی کے عالم میں بھی لہروں کو دیکھتا اور پرکھتا جاتا ہے۔ وہ کیا کرے کہ خود اس کی زندگی میں تضاد ہے۔ وہ انگریزی حکومت کا مخالف بھی ہے اور انگریزی حکومت کا وفادار خادم بھی، وہ شکم پروری اور وطن پرستی

کے تضاد کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہے لیکن وہ بھیانک حقیقتوں کے سامنے ضمیر کی تاثی سے قاصر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انتقام کسی اجنبی عورت کے کاشانے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتقام بے معنی ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ اس کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ راشد اپنی تن آسانی کے لئے حقیقتوں کا احساس رکھتے ہوئے بھی اپنے کو دھوکا دے رہا ہے۔ راشد حقیقت کی دنیا میں صرف چور دروازے سے ہی آ سکتا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے بہت بڑا مختلف فیہ مسئلہ اس کتابچے میں چھیڑا ہے۔ اور اس پر سیر حاصل بحث تو ایک کتاب ہی میں کی جا سکتی ہے، مختصر سی تنقید اس کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن خاتمہ پر یہ کہنا ضروری ہے کہ حیات اللہ نے مباشرت و شہوت و ملامت کی جو بحث کی ہے اس میں ایک عالمانہ شان کی بجائے ایک سطحی مناظرانہ "شان" پیدا ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان چند خامیوں کو دور کر دیا جائے گا۔

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب چہ ہماری تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ تحلیل نفسی کو تنقید کا محور بنا کر ابھی تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی تھی۔ اس قسم کی پہلی کوشش ہونے کی وجہ سے اس کی افادیت سے انکار ناممکن ہے۔ اس کے بعد میں جو تصانیف آئیں گی۔ وہ یقیناً اس سے زیادہ پر وزن ہوں گی۔ اور ممکن ہے کہ یہ کتاب سنجیدہ اور دقیق تنقید کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ بدقسمتی سے ہماری تنقید میں روز بہ روز سطحی ہوتی جاتی ہیں۔ کم از کم اس کتاب چہ سے یہ سبق تو لیا ہی جا سکتا ہے۔ کہ کسی تصنیف پر تنقید لکھنے سے پہلے کتنے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔

حیات اللہ کی تنقید کے چند اہم پہلوؤں سے ہی یہاں بحث کی جا سکی ہے۔ مگر "ن۔م۔ راشد پر" کے مطالعے سے بہت سی مفید معلومات یکجا کی جا سکتی ہیں۔ مگر آپ کو بھی ہوشیاری سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ جذبہ جنسی ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ اس سے نہ تو مصنف بچ سکتا ہے۔ اور نہ تنقید نگار اور ناظرین اگر مصنف کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہو۔ تو نقاد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے۔ کہ ایک ہی ادب پارہ دو تنقید نگاروں کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کرتا ہے۔ ایک ہی اشارہ دو مختلف نظروں کے سامنے دو مختلف تصویریں پیش کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس پردے کے پیچھے کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کارگہہ شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے۔

Lovely Silk
ہندستان بھر میں میسور سلک
کی شہرت ہے، اتنا نفیس اس قدر
ملائم اور اس صفائی سے بنا ہوا
چمکتا کریپ، سرسراتا جارجٹ
اور جھلملاتا ساٹن، آپکے لئے
بڑا دل نواز ملبوس ہے۔ ان
میں آپ کی پسند کا ہر رنگ اور
ہر شیڈ ہے۔
Mysore Silk
MSKT
A MYSORE GOVERNMENT PRODUCT, GOVERNMENT
SILK WEAVING FACTORY MYSORE.